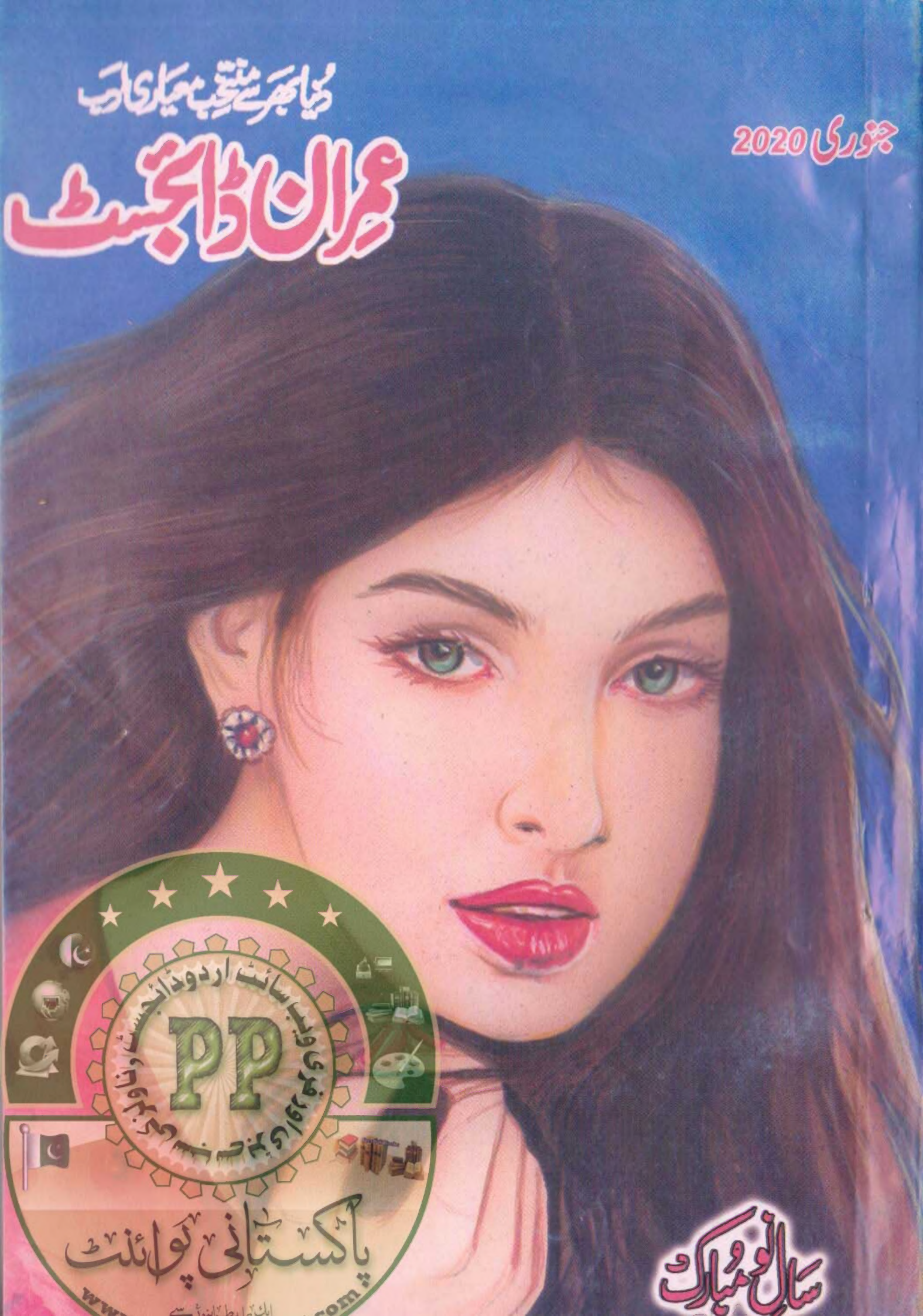

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب
عمران ڈائجسٹ
جنوری 2020
سال نو مبارک
پاکستانی پوائنٹ

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

بانی: محمود ریاض
مدیرِ اعلیٰ: عامر محمود
منتظم: محمد شفیع

MEMBER
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی — APNS
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز — CPNE

شرمناک
6 ایم الیاس

[illegible]

دُرگذیدہ
53 جاوید راہی

اہل دانش فرماتے ہیں کہ رشتے خون کے نہیں احساس کے ہوتے ہیں۔ احساس ہو تو پرائے بھی اپنے اور احساس نہ ہو تو اپنے بھی پرائے ہوجاتے ہیں۔ ایک بدنصیب کی لڑکی کی کتھا جس کے سگے رشتوں کا خون سفید ہوگیا تھا۔ قتل کی ایک ایسی واردات جس میں قاتل نے خود اپنا پاؤں کلہاڑی پر دے مارا۔

دوران گردوں
79 عاصمہ زیدی

دولت کے پجاریوں کا نہ کوئی وطن ہوتا ہے اور نہ ان کے دل میں وطن کی محبت ہوتی ہے۔ یہ ہر جگہ صرف اپنے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کالی بھیڑوں کو کوئی بھی باآسانی خرید سکتا ہے۔ یہ لوگ ملک دشمن قوتوں کے ایما پر اپنے ہی ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی سائنس دان کی وطن پرستی جس نے اپنے ملک کے لیے ایک شاندار فارمولا دریافت کیا تھا مگر ــــ

شریف غنڈہ
90 شاداب ضیاء

[illegible]

مرجان
110 مس صبا بہار

[illegible]

منقسم عورت
145 تبسم مہتاب قریشی

خوابوں کی دنیا میں رہنے والے نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ حاصل چیز کی قدر نہیں کرتے اور لاحاصل کے لیے روتے رہتے ہیں۔ ایک ایسی ہی عورت کی داستان حیات اس کی شادی اس کی پسند کے خلاف کردی گئی تھی لیکن وہ اپنی لاحاصل محبت کے لیے بے چین رہی اور جب محبت حاصل ہوگئی تو وہ دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔

نکتہ رسی
152 یاسمین فرحت

پراسرار کہانیوں کی مصنف کی بھتیجی نے اپنے چچا کی ذہنی حالت کو پیش نظر رکھ کر اس کی نئی کہانی کے ایک پیراگراف سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور پھر اپنے منصوبے پر عمل بھی کر ڈالا مگر وہ ایک نکتے کو فراموش کر گئی تھی۔

دل پھینک روح
160 نواز شاہین

تجسس انسانی سرشت میں داخل ہے۔ ایک نوجوان جوڑے کا قصہ انہوں نے ایک مکان لے لیا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس میں کیا اسرار پوشیدہ ہے۔ وہ بے چارے تو اپنی زندگی کے خوشگوار دن گزارنا چاہتے تھے مگر ایسا لگتا نہیں تھا۔ ایک دن جب ہوئی ضروری کام سے گئی ہوئی تھی کہ ــــ

پارہ دری
168 حامد علی

[illegible]

برگشتہ بخت
181 سید علی ارسلان

سچی محبت قربانی کی متقاضی ہوتی ہے۔ ایک اعلا کردار شخص کا قصہ، جس نے شک رفع کرنے کے لیے اپنی محبت قربان کردی۔ انسان [illegible] شک میں مبتلا ہوجائے تو اس کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔

نیند آنکھوں میں نہیں
187 محمد سلیم اختر

[illegible] ہو تو راستہ کٹھن ہوجاتا ہے۔ ایک وفا شعار کا قصہ الم اس نے خیانت کی پاداش میں اپنے جگر گوشے سے انتقام لے لیا۔ پس دیوار زندان سے بیان

تہی دست
194 یاسمین ہاشمی

ایک قلم کار کا قصہ حالات نے اس کی زندگی میں مشکلات ہی مشکلات پیدا کردی تھیں۔ اس نے بہت جدوجہد کی اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے اور آخرکار وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جس کا ہر کوئی خواب دیکھتا ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی میں زمانے کی ٹھوکروں میں پلنے والی ایک خاتون داخل ہوئی تھی جو بعد میں نجانے کہاں گم ہوگئی تھی۔

www.PakistaniPoint.com
پاکستانی پوائنٹ

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37-اردو بازار، کراچی

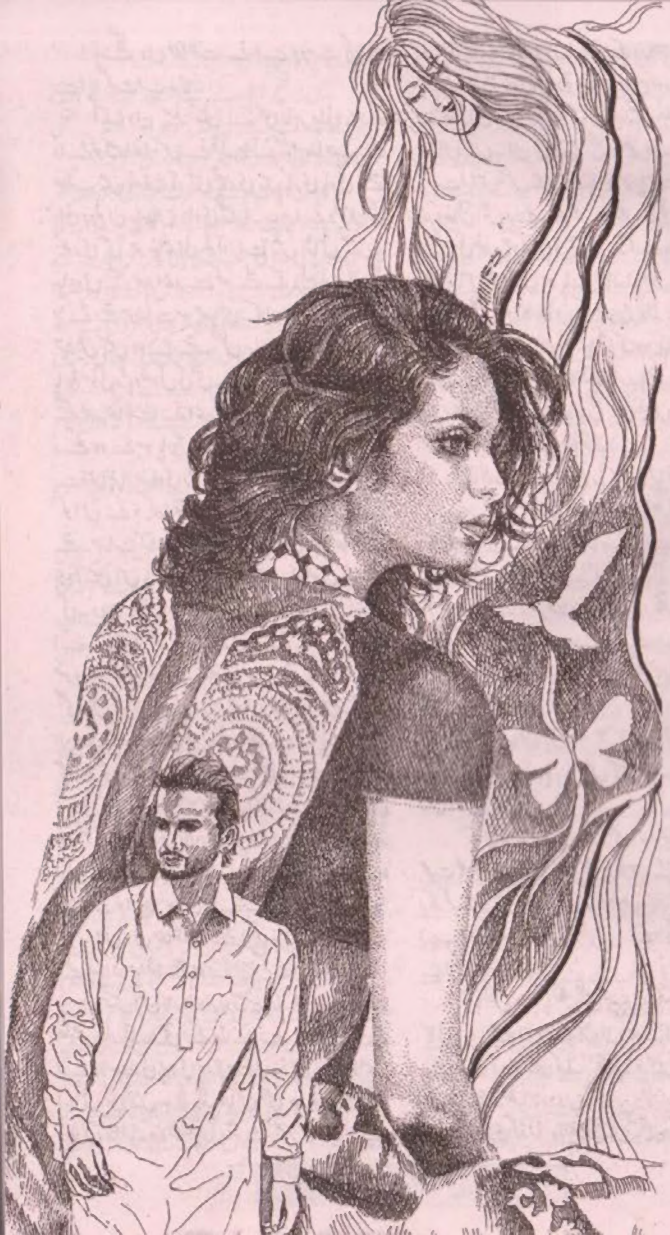

شرم ناک

ایم الیاس

خود غرضی ایک سوچ اور ایک رویے کا نام ہے جس میں انسان اپنی ذات، اپنے فائدے کے لیے سوچتا ہے۔ یہ پروا کیے بغیر کہ اس کا خود غرضانہ رویہ اور سوچ دوسروں کے لیے کتنی نقصان دہ ہے مال و دولت انسان کی ضرورت ہے لیکن دولت کی ہوس انسان کو شرف انسانیت سے گرادیتی ہے۔ ایک دکھی کردینے والی شرم ناک کہانی آدمی کس حد تک خود پرستی، خود غرضی، ہوس پرستی اور اپنا مستقبل بنانے کے لیے شرم ناکی دلدل میں کود جاتا ہے۔

یہ کہانی آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردے گی

دوسری اور آخری قسط

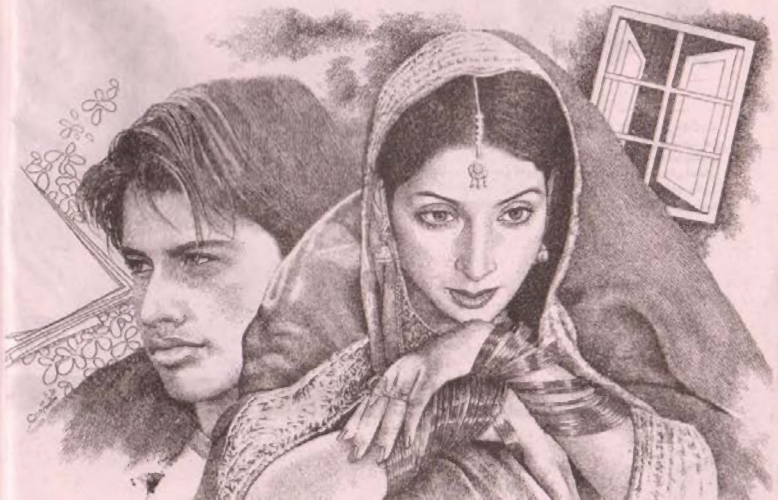

اگلے دن حفاظت نے اپنے دوست کی مدد سے اپنا گیٹ اپ بدلا۔

ایک دن پہلے جمیل نے کسی ماہر چابی بنانے والے کو بھیجا تھا جس نے قبلہ بڑے حکیم صاحب کے مطب میں نصف آہنی تجوری میں باری باری لگنے والی دونوں چابیاں بنادی تھیں۔ یہ پرانے وقتوں کی تجوری تھی جو خاندانی نوادرات میں شامل تھیں۔ چابیوں کے بعد اندر سے کھولنے کے لیے عدد ملانے پڑتے تھے جو سات سو چھیاسی کے اعداد تھے اور جو کبھی تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ قفل ساز نے تجوری دیکھ کر پانچ سو کی رقم وصول کی تھی۔ اس کے رخصت ہوجانے کے بعد حفاظت نے اندر کا خفیہ خانہ کھولا اور تہ در تہ رکھے ہوئے سو پانچ اور ہزار کے نوٹوں کے درمیان سے دس ہزار مساوی رقم نکالی۔ بڑے قبلہ حکیم صاحب کو اس نے دیکھا تھا۔ وہ ہر روز نوٹ رکھتے جاتے تھے۔ حساب کتاب انہوں نے کبھی نہیں رکھا تھا اور نہ ہی انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ لاکھوں میں ہو گی۔ وہ ہر ہفتے پانچ ہزار آسانی سے نکال سکتا تھا۔ اسے اپنے ہی گھر میں چوری کرتے ہوئے افسوس ضرور ہوا لیکن قصوروار حکیم صاحب تھے جو اس عمر میں بھی مال جوڑتے جارہے تھے اور اتنے کنجوس تھے کہ ان سب کا رہن سہن غریبانہ سا تھا۔ بیوی اللہ میاں کی گائے تھی۔ صابر و شاکر عورت تھی۔ اسے کبھی اصل آمدنی کا اندازہ ہی نہ ہوا اور اس نے زیادہ کی کوئی خواہش بھی نہیں کی لیکن ان کا معاون اور جانشین روز اول سے سب دیکھ رہا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ معاملات کو اپنے موافق بنائے۔

اس دن حفاظت نے اپنی زندگی بدلنے کے لیے پہلا قدم اٹھاتے ہوئے اپنا گیٹ اپ بدلا تھا۔

جمیل اس کا راز دار اور مشیر تھا۔ اس نے بڑے خلوص اور نیک نیتی کے جذبے سے بے غرض بن کر اپنے دوست کی پوری پوری مدد کی۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل ہی نہیں بدلا بلکہ لباس بھی جدید فیشن کے مطابق بنالیا۔ وہ شام کو ئی شرٹ، جینز اور جاگر پہنے اور سن گلاسز لگائے چڑیا گھر کے دروازے پر آنے جانے والی لڑکیوں، عورتوں، مردوں اور بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں اکثر لڑکیاں عورتیں مفت تفریح کا سامان تھیں۔ ان کی وضع قطع، بغیر دوپٹے کا تنگ و چست لباس جس میں بے حجابی، عریانیت اور جسم کے خدوخال اہل رہے تھے بھرے بھرے کولھے مٹکاتے دنبوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو پارہا تھا۔ یہ جلوے، سنسنی خیز نظارے فلمی اداکاراؤں کی طرح بولڈ تھے۔ وہ ان میں ایسا کھویا تھا کہ بھول گیا تھا کہ وہ یہاں کیوں اور کس لیے آیا تھا اور کس کا انتظار کررہا تھا۔ وہ تب چونکا جب ایک رکشا سے سیاہ برقع میں ملبوس زیب النساء اتری۔ رکشا چند قدم پر رکا تھا۔

حفاظت نے اسے فوراً پہچان لیا تھا جو کرایہ ادا کرنے کے بعد متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے زیب النساء کے قریب جاکر سرگوشی میں آہستگی سے آواز دی۔ ”زیبی.....“

وہ چونک کر سرعت سے پلٹی اور پتھر کے بت کی طرح منجمد ہوگئی۔ حفاظت نے اس کے روبرو ہوکر کہا۔

”ہیلو.....“ پھر اس نے چٹکی بجائی۔ ”ہوش میں آجاؤ زیبی جان!“

”یہ آپ ہی ہیں.....؟“ زیب النساء ہکلائی۔

”مجھے یقین نہیں آرہا..... میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟“

”باقی باتیں کریں گے بھی اندر جاکر پہلے اپنی محبت بھری نظروں سے دیکھ کر، دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ میں کیسا لگ رہا ہوں.....؟“ اس نے زیب النساء کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ”سچ سچ بے لاگ تبصرہ کرنا۔“

”بالکل..... بالکل فلمی ہیرو..... سلمان خان کی کاپی..... جیسے اس کے جڑواں ہو۔“ اس نے خوشی سے لرزتی آواز میں کہا۔ ”آپ کو کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔ نظر اتار دوں۔“

”ویری گڈ..... اچھا لگا میں تمہیں..... اللہ کا شکر ہے، میں دل میں بڑا ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ اس بہروپ میں دیکھ کر۔“ حفاظت نے آس پاس کسی کو قریب نہ پاکر سرگوشی میں پوچھا۔ ”تم مجھے اس بہروپ میں چوم لوگی؟“ اگر وہ نقاب میں نہ ہوتی تو اس کا لال چہرہ دیکھ لیتا تو سمجھ ہو جاتا۔ اس نے جواب دیا۔

”کیا میں نے تمہیں کبھی چوما نہیں..... تمہیں ہر بہروپ میں چوم لوں گی۔“ اس کی آواز میں شوخی تھی۔

وہ ٹکٹ لے کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اندر چلے گئے۔ چڑیا گھر کا وسیع گھنا باغ خلوت کے بے شمار گوشے فراہم کرتا تھا۔ چناں چہ یہاں میاں بیوی اور بچوں کے علاوہ ان جیسے بھی آجاتے تھے جو صرف ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ اور دیکھنے والے انہیں..... مگر کوئی ان کی تفریح میں دخل انداز نہیں ہوتا تھا۔ ہر کوئی اپنے میں مگن رہتا تھا۔

حفاظت نے زیبی کو ایک گوشہ عافیت میں بٹھا دیا۔ زیب النساء نے خود ہی منہ دوسری طرف رکھتے ہوئے نقاب الٹ دی۔ حفاظت نے دیکھا کہ اس ملاقات کے لیے زیب النساء خصوصی اہتمام کے ساتھ آئی ہے۔ اس کا بھڑکیلا لباس ہی نہیں بلکہ اس کا نفیس میک اپ بھی غیر معمولی تھا۔ حفاظت نے پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھنا شروع کیا تو وہ اس نئے اور انوکھے روپ میں دل کش لگ رہی تھی زیب النساء کے چہرے پر حیا سے زیادہ خوشی کی چمک آ گئی۔

”ایسے دیکھ رہے ہو جیسے مجھے کبھی دیکھا نہیں..... لوگ کیا کہیں گے.....؟“ وہ سرخ ہوکر بولی۔

”لوگ وہی کہیں گے جو میرے جذبات ہیں..... اس وقت باغ جناح میں کیا۔ یہاں سے انارکلی تک تم جیسی حسین لڑکی نہیں ہوگی۔“ حفاظت نے فلمی انداز کا مکالمہ کہنے کے بعد توقف کیا۔ ”ایک درخواست مانو گی میری.....؟“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ کیا میں نے کبھی آپ کے کسی بھی حکم سے انکار کیا..... آپ حکم دیں۔“ اس نے پلکیں جھکائیں۔

”برقع اتار دو؟“ زیب النساء سٹ پٹا سی گئی۔

”کیا بے پردہ ہو جاؤں سب کے سامنے.....؟“

”میں برقع اتارنے کے لیے کہہ رہا ہوں کپڑے اتارنے کے لیے نہیں..... وہ دیکھو..... کتنی لڑکیاں عورتیں اپنا برقع اتار کر تہہ کررہی ہیں۔

جان من! بات یہ ہے کہ صرف تمہاری صورت نظر آرہی ہے۔ ہم جیسے کتنے ہیں..... تم جیسی پردہ دار تو دو چار ہی ہوں گی۔ باقی سب ایسی ہی پھر رہی ہیں۔ بے حجابی کی نمائش کرتی ہوئیں۔ انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ مرد اور جوان لڑکے انہیں ندیدی نظروں سے گھور رہے ہیں بلکہ وہ خوش ہو رہی ہیں وہ ان کی جسمانی کشش کو ستائشی نظروں سے داد بھی دے رہے ہیں..... میں تمہارے لیے آئس کریم اور چاٹ لے کر آتا ہوں۔ تم اس وقت برقع اتار دو گی..... ٹھیک۔“

وہ دس منٹ بعد لوٹا تو زیب النساء کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

اس نے اعتراف کیا کہ اب تک گھر کی مرغی والی برابر والا معاملہ تھا۔ زیب النساء کسی سے کم نہ تھی مگر اپنے دقیانوسی حلیے، گھریلو کپڑوں اور میک اپ کے بغیر وہ عام سی لڑکی نظر آتی تھی جو کسی کو بھی متوجہ نہیں کرتی تھی۔ مگر آج ملاقات کے اہتمام نے اس کے حسن کو گہنائے ہوئے چاند سے ماہ کامل بنا دیا تھا۔

زیب النساء اس خواب ناک ملاقات کے تجربے پر ہنوز بے یقینی میں مبتلا تھی۔ ایسا وہ کب نہیں چاہتی تھی۔ آج ایسی کون سی لڑکی تھی جو نہ چاہے گی۔ اندھا دھند بھاگ رہی تھیں۔ ٹھوکر لگتی تھی۔ اپنے محبوب کے ساتھ ہوٹلوں میں جاکر وقت گزارتی تھیں۔ اس کی دونوں سہیلیاں بھی متعدد بار اپنے محبوب کے ساتھ جاچکی تھیں۔ لڑکیاں ان جانے راستے پر چلتی ہوئیں پلٹ کر نہیں دیکھتی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کی منزل کون سی ہے؟ انجام کیا ہوگا..... وہ آج ذہنی طور پر تیار ہوکر آئی تھی کہ حفاظت اسے کسی ہوٹل میں لے جانا چاہے تو انکار نہیں کرے گی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اس تنہائی میں ناگ بن کر ڈس لے۔ اگر وہ دونوں بہک گئے تو کوئی بات

نہیں...... آخر وہ اس کا مجازی خدا ہونے والا ہے۔

وہ لڑکا جو چھوٹے حکیم صاحب کے روپ میں اس کے منگیتر کی حیثیت رکھتا تھا اچانک ایک رومانٹک ہیرو بن کر سامنے آیا تھا پھر وہ خود کو کسی ہیروئن سے کم کیسے نہ سمجھتی۔ آج ناممکن، ممکن ہو گیا تھا۔ اب آگے کیا ہوگا؟ زندگی درحقیقت ایسی نہ تھی کیا وہ ایسی ہو جائے گی؟ یا جیسی تھی۔ ویسی ہی رہے گی؟

دھک دھک رقص کرتے ہوئے دل کو قابو کرتی جس سے سینہ بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ خوشی کے آنسوؤں کو چھلکنے سے روکتی اور سحر زدہ بیٹھی زیب النساء کا سارا خوف دور ہو چکا تھا۔ وہ کسی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ کسی کے بارے میں سوچ نہیں رہی تھی۔ صرف حفاظت کی آواز سن رہی تھی جو آج جیسے جادو سے اس کا پرانا غیر اہم منگیتر نہیں رہا تھا۔ وہ خوابوں کا ہیرو اور دل کی دھڑکن بن گیا تھا اور اس سے ایک انجانی چاہت بڑھنے لگی تھی۔

''دیکھو زیبی!'' حفاظت نے کہا۔ ''جو اس وقت تم دیکھ رہی ہو...... محسوس کر رہی ہو...... یہ تمہیں جیسے خواب کی طرح لگ رہا ہوگا ...... بے شک یہ خواب ہے مگر ہمارے آنے والے وقت کا ...... یہ سب راتوں رات جادو کی چھڑی گھمانے سے نہیں ہوا۔ اس کا خیال بہت پہلے دل میں خواہش بن کر آیا تھا۔ میں سوچتا رہا تھا کہ آخر کب تک ایسی زندگی گزارتا رہوں گا۔ ایک صدیوں پرانے معمول کے دائرے میں...... جس میں مجھ سے پہلے قبلہ بڑے حکیم صاحب جی چکے...... ان سے پہلے میرے دادا اور ان کے دادا اپنی عمریں گزار چکے۔ میری زیبی! یہ اکیسویں صدی ہے اور ہم اپنے گھروں میں ابھی تک پچھلی صدی کے اسیر ہیں۔ ہمارا رہن سہن ...... لباس...... سوچ سب کتنی فرسودہ، دقیانوسی۔ کیا تمہیں میری یہ باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں؟ یا اور وضاحت سے بیان کروں؟''

''زیب النساء نے سر ہلایا اور اپنا مرمریں ہاتھ حفاظت کے ہاتھ پر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔''

''مجھے فخر ہے آپ پر...... جو آپ نے یہ سوچا۔''

''یہ بات کہہ کر تم نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ دو چند کر دیا۔'' حفاظت خوش ہو گیا۔ ''اگر تنہائی ہوتی تمہاری زبان سے نکلے ان قیمتی الفاظ کے موتیوں کو اور ہونٹوں کو چوم کر خراج پیش کرتا...... لال ایسا کرتا کہ وہ نکھر کر گلنار ہو جاتا۔ اگر تم اس تبدیلی ...... بلکہ انقلاب کی مخالفت کرتیں تو میں اکیلا کچھ نہ کر پاتا کیوں تم نہ صرف میری آدھی طاقت بلکہ جان ہو...... اب میں اور تم مل کر ایک ایسی نئی دنیا آباد کریں گے جس کے خواب ہم دیکھ رہے ہیں۔''

''میں ہر قدم پر آپ کا دل و جان سے ساتھ دوں گی...... مگر آپ یہ سب کچھ کیسے کریں گے آخر......؟'' زیب النساء نے اس کا ہاتھ بڑی مضبوطی سے تھام لیا تو اس کا انوکھا لمس اس کی نس نس میں رقصاں ہو گیا تھا۔ زیب النساء کے ہاتھ میں اس کے ہاتھ کے لمس سے فرحت اور حرارت سی محسوس ہونے لگی۔ ''یہ تو بہت بڑا اقدم ہوگا جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' حفاظت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ''مجھے معلوم ہے، اندازہ اور اندیشہ ہے کہ مخالف کی آندھی آئے گی جو مجھے تہس نہس اور تاخت، تاراج کر دے گی۔ سب سے پہلے تو میں تمہیں بتا دوں۔ کیوں کہ تم نہ صرف میری ذات کا جزو ہو بلکہ میرا وجود بھی ہو...... میں یہ خاندانی پیشے کا بھرم اپنے گلے سے اتار کر پھینکوں گا اس لیے کہ چھوٹے حکیم صاحب کا خطاب مجھے ایک غلیظ، گھٹیا اور قبیح گالی کی طرح لگتا ہے۔ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا میری جان تمنا! جو میرے آباؤ اجداد کرتے آئے اور اپنے وقت میں انہوں نے پیسا بھی کمایا اور نام بھی کمایا ...... مگر اب کیا ہے اس پیشے میں...... حکیم رہے کہاں؟ شہر میں آئے دن ایک سے ایک بڑا اسپتال اور جدید ترین کلینک بھی قائم ہو رہا ہے...... باہر کی ڈگریوں والے ڈاکٹرز سارے مریض کھینچ رہے ہیں...... قصابوں کی طرح ذبح کر رہے ہیں۔ ان کی لیبارٹریز مریضوں کا مکان تک بکوا دے رہی ہیں ٹسٹ کے بہانے...... تشخیص کے جدید سائنسی آلات بھی ہیں...... اور نئی نئی دوائیں بھی...... مریض کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں ہزار سے دس دس ہزار کی فیس لیتے ہیں۔ ان کے اسپتال اور کلینک مذبح خانے سے کم نہیں ہیں۔ ان میں بعض کیا بلکہ اکثر ڈاکٹرز جو باریش اور پنج وقتہ نمازی ہیں یومیہ چالیس پچاس سے دو تین لاکھ گھر لے جاتے ہیں۔ انکم ٹیکس ادا نہیں کرتے ہیں۔ بالفرض کرتے ہیں تو آٹے میں نمک کے برابر...... عمرہ بھی کرتے ہیں اور حج بھی۔ پلاٹ اور فلیٹس اور عمارتیں بھی ہر برس بناتے ہیں...... قبلہ بڑے حکیم صاحب جیسے ہر شہر میں کیا کر رہے ہیں؟ صرف فراڈ اور بے ایمانی ان کا ضمیر بھی بے حس ہو گیا ہے۔ ایمان بھی رہا نہیں ہے۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو؟ کیا سب حکم؟ سچ حفاظت......!''

''چلو سب نہ سہی...... ان کی اکثریت جن میں قبلہ بڑے حکیم صاحب بھی شامل ہیں...... کون لوگ آتے ہیں ان کے پاس وہی جو شہر کی دیواروں پر لکھے ہوئے اشتہار پڑھتے ہیں...... مجھے شرم آتی ہے ان کی عبارت بتاتے ہوئے بھی۔ ان کے امراض اور ان کی دوائیں...... میں کیا کیا بتاؤں، سب ہوس کے مارے عیاش اور بوڑھے بوڑھے لوگ ہیں۔ چوں کہ ان کی بیویاں، جسم اور تناسب ڈھل چکے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی کشش نہیں ہوتی ہے۔ موٹی اور بھدی ان میں بے رغبتی ہوتی ہے...... وہ ہاتھ لگاتا تو درکنار قریب آنے نہیں دیتی ہیں تو وہ گھر کی نوجوان ملازماؤں میں ان کی غیر موجودگی میں فائدہ اٹھاتے ہیں...... اور ہم انہیں بے وقوف بنا کر دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ ان کے شکار زنانہ بھی ہماری طرح ان ہوس پرستوں کو لوٹتی ہیں۔ یہ ساری معجون، سفوف، خمیرے اور طلا، سونے چاندی کے کشتے ان کی یہ حقیقت بتاؤں تو تم کہو گی شاید میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ لیکن تمہیں شریک راز کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ تم میری شریک حیات ہو۔ یہ جو ملتان کا حلوہ کہلاتا ہے...... مختلف ناموں سے...... اس کا ذائقہ دوا جیسا کرنے کے لیے ہم کسی میں ملاتے سونف تو کسی میں سیاہ زیرہ یا دار چینی کا سفوف ان کے الگ الگ نام رکھ دیے ہیں۔ خمیر ابریشم حکم ارشد والا۔''

''اللہ حفاظت! میں کیسے یقین کر لوں......؟'' زیب النساء نے اپنے منگیتر کا نام لے کر گویا روایت سے بغاوت کی۔

''میں سچ بتا رہا ہوں میری جان تمنا!'' حفاظت کہنے لگا۔ ''ایسی بوگس دواؤں کے ہم عیاش رئیسوں اور بڈھوں سے سینکڑوں کی رقم علاج اور ان کی قوت باہ میں اضافے کے بہانے اس لیے لوٹتے ہیں کہ وہ اپنی نوجوان ملازماؤں اور نہ جانے کن کن لڑکیوں عورتوں کی آبرو لوٹتے ہیں۔ ہم انہیں جائز سمجھتے ہیں۔ حکمت کی دواؤں سے تم بھی بہت کچھ واقف ہو۔ ایک ہوتی ہے ''لعوق سپستان'' میں نے خود برفی کی ایک ڈلی میں تھوڑا سا کالا نمک ملایا اور پانی سے پیسٹ بنا لیا...... کسی میں لونگ الائچی کا سفوف ملا دیا۔ ایسا ہی حال شربتوں کا ہے...... بازار کے عام شربت بھی ضروری نہیں۔ پانی میں گڑ چینی گھولی ...... رنگ ڈالا اور ذائقہ تھوڑا سا بگاڑ دیا۔ ادھر ادھر کی سینکڑوں چیزیں ملانے سے شربت فولاد بن گیا۔

''لیکن ...... وہ خود دوائیں کوٹنے چھاننے والے ہیں۔'' وہ بولی۔

''وہ تیل بناتے ہیں...... کیا تم نے اشتہار نہیں دیکھے؟ خاندان مغلیہ کے شاہی حکیم نسخہ خاص ...... خریدار دیکھ بھی سکتے ہیں کہ کتنی محنت سے بنایا جاتا ہے۔ دو سو بھی لاگت نہیں آتی مگر ہم وصول کرتے ہیں دو ہزار ...... جو شوقین دیتے ہیں ...... یہ نفسیاتی حربہ ہوتا ہے...... اگر محنت دو سو رکھیں تو اعتقاد اعتقاد نہیں ہوگا کہ آج دو سو کی اوقات کیا ہے...... دو ہزار میں خریدنے والا متاثر ہوتا ہے کہ یقیناً کچھ خاص ہوگا۔ جو چالیس سے پہلے گنجے ہونے لگتے ہیں وہ بڑے فکر مند اور پریشان ہوتے ہیں کہ اب جوان ہیرو کیسے لگیں گے۔ واد پیسا بھی ہوتا ہے ان کے پاس یہ

نہیں سوچتے کہ گرتے بالوں کا علاج ہوتا تو ہمارے ارب پتی سیاست دان جن کے اٹاثے ہیں وہ گنجے کیوں ہوتے؟ ہال کیوں لگواتے؟ امریکا میں بڑے بڑے گورے میڈیکل سائنس کی ایجاد سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اٹھاتے ہیں..... مگر بال لگائے جارہے ہیں۔ مصنوعی طریقے سے..... ہیئر ٹرانسپلانٹ۔"

"سچ کہہ رہے ہیں آپ! میں نے یہاں ہیئر ٹرانسپلانٹ کے اشتہار دیکھے..... سنا ہے شاہ رخ اور ایتابھ بچن بھی ایسا ہی کرتے ہیں..... لیکن امریکا پوری کے اداکار تو اپنے گنجے پن کی فکر نہیں کرتے ہیں۔"

"زیبی.....! ایک فلم کا معاوضہ کروڑوں میں ملتا ہے تو آدمی کیا نہیں کرسکتا..... ایک ماہر کو رکھ سکتا ہے جو روزان کے بالوں کی گنتی کرے۔ جتنے کم ہو گئے ہوں اتنے لگادے چار اگر کم ہوں تو چار..... کسی کو فرق کا بھی پتا نہیں چلے گا..... ایسا ہی چکر قد بڑھانے والی دواؤں کا ہے..... الہ دین کے چراغ کا جن بھی ہڈی کو لمبا نہیں کرسکتا..... نہ ٹانگ کی نہ کمر کی مگر دراز قد نظر آنا چاہتے ہیں..... ایسوں کو لوٹنا نہایت آسان ہوتا ہے..... رنگ گورا کرنے کے لیے لڑکیاں سب کچھ دے سکتی ہیں..... جو اولاد نرینہ کا خواہش مند ہو یا بے اولاد ہو..... وہ ہر علاج پر اپنا سب کچھ لٹا سکتا ہے۔ ہم یہی کررہے ہیں..... جاننے والے جانتے ہیں مگر ہم پکڑ میں نہیں آتے کیوں کہ یہاں کوئی کنٹرول نہیں پوچھنے والا نہیں اور نہ دوا کے اجزا کو چیک کیا جاسکتا ہے۔ نہ حکیم کے دعوے کو، نہ ہی کوئی عدالت میں جاتا ہے۔ نہ ثابت کرسکتا ہے۔ ایسے کوئی قوانین ہی نہیں ہیں۔ نہ بنانے کی کوئی بات کرتا ہے..... نتیجہ یہ کہ لوٹنے والے لوٹ رہے ہیں۔ لٹنے والے دل کھول کر لٹا رہے ہیں اپنی خوشی اور مرضی سے" وہ بات کرتے کرتے ذرا دیر کے لیے رکا۔

"لیکن زیبی.....! میں تو جانتا ہوں..... یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ہم مجرم اور گناہ گار ہیں۔ یہ حرام کمائی ہے۔ ہماری عزت کچھ نہیں۔" زیبی نے جو اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اسے چھوڑ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے سن کر میرا دل بہت خوش ہوگیا۔ مگر اس کے بعد آپ کیا کریں گے مستقبل بنانے کے لیے.....؟"

"وہ تو میں بہت سوچ بچار کے بعد طے کرچکا ہوں..... ان شاء اللہ سب اچھا ہی ہوگا، لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر ایک دن تم ضرور دیکھو گی کہ ہمارا اپنا گھر گلبرک میں ہوگا۔ ہمارے پاس ایک نہیں دو بہت اچھی قیمتی گاڑیاں ہوں گی۔ بڑی میں لے جاؤں گا۔ چھوٹی میں تم بچوں کو لاؤں گی لے جاؤ گی..... شاپنگ کروگی۔"

زیب النساء کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلنے لگی۔ اس کے مختلف سین ان تمام حسین خوابوں کی عکاسی کرتے تھے جو ہر لڑکی..... کوئی بھی غریب لڑکی، سوتے جاگتے دیکھ سکتی ہے اور دیکھتی رہی رہتی ہے۔ جب وہ آج پر محیط زندگی کے تلخ شب و روز سے کچھ دیر کے لیے ہی فرار حاصل کرنے کا سوچے۔ مختلف خوب صورت عالی شان گھر، کوٹھیاں اور محل..... ان کے لان اور باغ..... ان میں کھڑی ہوئی گاڑیاں..... ان کے سجے سجائے کمروں کی رنگین دیواروں پر آویزاں تصاویر..... ادھر ادھر بکھرے ہوئے ڈیکوریشن پیس اور لیمپ..... ایئر کنڈیشنڈ بیڈ رومز جن کے دبیز قالین اور ریشمی پردے ہم رنگ ہوں اور وہ..... وہ خود ہر لباس میں تصویر رعنائی، پیکر لطافت و دلکشی، رنگینی ریشمی ایک پیکر حسن جس میں وہ شعلہ مجسم نظر آئے..... ہر ریسٹورنٹ اور شاپنگ مال میں مرکز نگاہ..... اور اس کے بچے..... ڈولز کے اور ایک اس کی جیسی لڑکی۔

اس کا یہ رنگین اور سہانا سپنا اس وقت بکھر گیا جب حفاظت نے کہا۔

"جان تمنا.....! کیا سوچنے لگی ہو؟ میرا ساتھ دوگی نا؟"

"میں....." وہ چونکی۔ "کیوں نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہر قدم پر۔ ہر آزمائش پر۔" اس نے پھر ہاتھ تھام لیا۔

"صرف زبانی کہنے سے کام نہیں چلے گا.....

تمہیں کچھ کرنا ہوگا۔" حفاظت نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"چلو۔" وہ اک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "باقی بات باہر چل کر کریں گے۔ یہاں کا وقت ختم ہوگیا۔ رات ہونے لگی ہے۔ تم ڈر تو نہیں رہی ہو؟"

"تم ساتھ ہو تو مجھے کسی کا کوئی ڈر خوف نہیں۔" وہ برقع اٹھا کر پہننے لگی۔

"تو پھر برقع رہنے دو اس کے بغیر ہی میرے ساتھ چلو۔"

"حفاظت! اگر کسی نے سڑک پر دیکھ لیا تو؟" زیب النساء نے عادتاً کہا۔

"دیکھنے دو..... سمجھو کہ تمہاری آزمائش شروع ہوگئی ہے۔ ابھی ابھی تم نے کیا کہا تھا یاد ہے؟"

پھر وہ حفاظت کا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ باغ جناح سے نکل کر چیرنگ کراس کی جانب فٹ پاتھ پر چلنے گئے۔ ان کے گرد و پیش سیکڑوں تیز روشنیوں والی کاروں کا سیل رواں دونوں سمت میں سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا اور ان میں مرد، عورتیں اور بچے بھی تھے جیسے ایک دن وہ بھی ہوں گے۔"

"خالہ کہیں پریشان تو نہیں ہوگئی ہوں گی؟ کیا تم انہیں بتا کر آئی تھیں؟"

"ہاں یہی کہ ایک ہم جماعت سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں..... نام نہیں بتایا تھا۔" وہ فٹ پاتھ پر حفاظت کے شانہ بہ شانہ چلتی رہی۔

"آج تم ڈیٹ پر ہو۔ چھوٹے حکیم صاحب یا تمہارے پیدائشی منگیتر نے نہیں تمہارے بوائے فرینڈ نے تمہیں ڈنر پر انوائٹ کیا ہے..... تمہیں آج ہی پرپوز کرنے کے لیے..... تم سے شادی کی درخواست کرنے کے لیے۔"

زیب النساء لمحے کے لیے سرخ ہوگئی۔ شادی اور شب عروسی کے تصور سے پھر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ رسیلی آواز میں بولی۔

"ایسی باتیں کرنا تم نے کہاں سے سیکھ لیا۔ کیا ایسا کوئی کوچنگ سینٹر ہے جہاں یہ سکھایا جاتا ہو؟"

"وقت سب سے بڑا اور جدید ترین کوچنگ سینٹر ہے جس میں داخلہ فیس ہوتی ہے اور نہ ہی ٹیچرز..... مائی سویٹ ہارٹ! دیکھو کیا کہا تھا میں نے؟ انارکلی تک تمہارے حسن کا راج ہے، کوئی ہے تم سے زیادہ حسین؟ ہر نظر تمہیں دیکھ رہی ہے۔" زیب النساء پر کسی شراب کا سا نشہ طاری ہونے لگا۔ واقعی ایسا ہی تھا۔ حفاظت نے جو کہا تھا اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ یا اسے خوش کرنے والی بات نہیں تھی۔ وہ لڑکیاں عورتیں بھی ساتھ تھیں جن کی بے حجابی اور عریانیت کو متوجہ کرنے والی تھی۔ لیکن مردوں کی نظر میں اسے مسلسل خراج تحسین پیش کررہی تھیں۔ اس نے خوابوں کی تعبیر کے پہلے زینے پر قدم رکھ دیا تھا۔ وہ بے برقع ایک ماڈرن لڑکی بن کر یہاں پر کتنے اعتماد سے جارہی تھی۔ ان کے گھر میں کم از کم ٹی وی تھا لیکن فلموں پر پابندی تھی لیکن اس سے کہیں بولڈ مناظر اب موبائل، ٹی وی، ڈراموں اور کمرشل میں نظر آتے تھے، لیکن ایک شام نے اسے نیا جنم دیا تھا۔

آج کی شام کے لیے جمیل نے اپنے دوست کو ایک ایک جملے کی تیاری اس طرح کرائی تھی جیسے کوئی کامیاب ہدایت کار اپنی فلم کے کرداروں کو پوری پچویشن کی ری ہرسل کراتا ہے۔ اس کے لباس کا انتخاب بھی جمیل نے ہی کیا تھا اور زیب النساء کے کردار کو ذہن میں رکھتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ وہ لڑکی اس فطری جذباتی انقلاب سے یوں اس کے قابو میں آکر بے بس ہوجائے گی وہ جیسے چاہے اس سے عامل ساحل والا کھیل کرسکتا ہے..... وہ جو بھی کہے گا زیب النساء ایک کنیز کی طرح کرے گی۔ کٹھ پتلی بن جائے گی۔ کسی بات حرکت پر تعرض ہوگا اور نہ ہی انکار..... وہ اسے کرنے کی بات بتا رہا ہے۔

پلان کے مطابق حفاظت اسے کھانا کھلانے ایک روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہ چودھویں شب تھی۔ اوپر دودھیا چاندنی کا غبار پھیلا اور وہ مدھم ہوئی ہر میز پر شمع روشن ہوگئی اور ایک گوشے میں ایستادہ بینڈ نے مدھم سروں میں موسیقی فضا میں بکھیر دی تو وہ

کانوں سے من کی اتھاہ گہرائیوں میں گونجنے لگی۔
زیب النساء نہ صرف دنیا کو اور خود کو بھول کر حفاظت کی آنکھوں میں اپنے وجود سمیت ڈوب چکی تھی اور اتنی بے خود تھی وہ اسے اپنے ساتھ کسی ہوٹل کے کسی کمرے میں لے جاتا تو وہ کامل خود سپردگی کے ساتھ اس خواب ناک شب کی سحر کر دیتی اور اسے نہ دنیا کا خیال آتا اور نہ ہی گھر اور عفت و ناموس کے اس گوہر نایاب کا جو مڈل کلاس کی ہر لڑکی کے لیے حفاظت طلب واحد اثاثہ ہوتا ہے۔ اس کی جو راز دار سہیلیاں تھیں اور اس سے کوئی سی بات نہیں چھپاتی تھیں۔ موبائل فون پر اپنی فطری سیلفیاں ہی نہیں بلکہ پرستاروں کی فلمیں دکھائی تھیں جو انٹرنیٹ پر دیکھی جا سکتی تھیں اور اب موبائل پر بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ اپنے محبوبوں کے ساتھ ہوٹلوں میں کامل خود سپردگی سے وقت گزاری کر کے آئی تھیں وہ الف لیلہ ہزار داستان کی طرح منایا کرتی تھیں۔
صبح وقت پر اس نے لوہا گرم دیکھ کر ایک ضرب لگائی۔ اس نے پوچھا۔
"زیب النساء! کیا تم میں اتنی ہمت ہے کہ مجھ سے شادی انکار کر سکو؟"
زیب النساء کو اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔ اس نے سوال کیا۔
"کیا کہا آپ نے، میں نے سنا نہیں۔" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
"سمجھو..... یہ تمہاری آزمائش کا پہلا مرحلہ ہے۔" حفاظت نے سوال دہرایا۔ "مگر غلط مت سمجھو..... ہمیں مناسب وقت پر اپنی ماں سے تمہیں یہی کہنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ کہا ہے..... لگی لپٹی بغیر۔"
"میں اب بھی کچھ سمجھی نہیں۔" زیب النساء کا سینہ دھڑک اٹھا اور دل جیسے ڈوبنے لگا۔
"تمہیں کہنا ہوگا کہ میں اس جاہل فراڈیے حکیم کے ساتھ وہ زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں جو اس کی ماں نے بڑے قبلہ حکیم صاحب کے ساتھ کاٹی..... کسی قید با مشقت کی طرح۔"
"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ ہوش میں ہیں؟"
"جو میں نے تمہیں صاف صاف بتا دیا تم بھی صاف صاف بتا دینا۔" حفاظت بولتا گیا۔ "وہ یہ کہ باپ بیٹا دھوکے باز ہیں..... حرام خور ہیں..... بے ضمیر ہیں ان کی رتی بھر عزت بھی نہیں شہر کی دیواروں پر بیٹا خود اپنے باپ کی پبلسٹی کرتا ہے اور ایسے اشتہار لکھتا ہے کہ جو پڑھ کر صرف لڑکیاں عورتیں ہی نہیں شریف سے شریف مرد بھی شرم سے پانی پانی ہو جائے..... ان کا گھر دیکھو..... ایک کباڑ خانہ ہے۔ ہر چیز سو برس پرانی ہے۔ دیواروں پر رنگ روغن نہیں..... پلاسٹر جھڑ رہا ہے۔ کنجوس اتنے کہ دھیلا بھی خرچ نہیں کرتے۔ دقیانوسی اتنے کہ گھر میں ٹی وی تک نہیں..... پرانی طرز کے کرتے شلوار میں کارٹون نظر آتا ہے وہ..... جس کا نام حفاظت ہے..... اس سے نکاح کرنے سے بہتر ہے کہ میں خود کشی کر لوں..... ایک بار ہی مر جاؤں۔"
زیب النساء ایسی کیفیت میں تھی جیسے اسے زبردست برقی جھٹکا لگا ہو۔ وہ سناٹے میں رہی۔ پھر بولی۔
"خدا کے لیے مجھے بتاؤ تو سہی کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"
"تمہارے انکار کے بعد یہ بات ہمارے گھر تک اور میں وہ کہہ سکوں گا جو آج تک نہیں کہا۔ کیوں اس وقت میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ اب میرے پاس ایک جواز ہوگا۔ میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ زیب النساء میری زندگی ہے۔ میرا وجود اور سب کچھ ہے..... میں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں..... بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کروں گا۔ میں یہ خاندانی کام کیا..... یہ گھر بھی چھوڑ سکتا ہوں وہ بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ اس پر غور کریں اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ اب میں یہ کام کسی قیمت پر نہیں کروں گا خواہ آپ مجھے عاق کر دیں یا گھر سے نکال دیں۔"

چکراتی ہوئی زیب النساء نے خود کو سنبھال کر کہا۔
"وہ پوچھیں گے ضرور کہ تم یہ کام نہیں کرو گے تو کیا کرو گے.....؟"
ان کے سامنے فلم کے کسی ہیرو یا پھر محمد علی کی طرح ڈائیلاگ بولوں گا۔ وہ ہنسا۔ "میں محنت مزدوری کروں گا۔ مجھ سے یہ دھوکے، فراڈ بے عزتی کی کمائی منظور نہیں..... میں زیب النساء کو خوش رکھ سکتا ہوں۔"
"اور اس کے بعد.....؟ تم نے کیا سوچا ہے؟ کیا کرو گے؟"
"کاموں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میں بزنس کروں گا۔" حفاظت نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "میرے ایک دیرینہ دوست نے مجھے اپنے کاروبار میں شریک کر لیا ہے۔ یہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے..... ہم زیادہ تر دبئی، ملائشیا اور ہانگ کانگ کے درمیان تجارتی سامان لائیں گے جو بڑا منافع بخش ہوتا ہے۔"
"کاروبار کے لیے برسوں کا تجربہ ضروری ہوتا ہے۔ آپ نے کبھی کوئی کاروبار نہیں کیا؟ آپ کے پاس تو کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔"
"تجربہ کام کرنے سے آتا ہے۔ میرے دوست نے کہا کہ ہر بزنس ٹرپ پچاس فیصد کا منافع یقینی ہے۔ یعنی چار لاکھ کا مال ہو تو اس پر دو لاکھ کا منافع..... ایک اس کا اور ایک میرا..... مہینے میں دو ٹرپ تو میرے دو لاکھ۔"
"یہ بھی تم نے سوچا ہے کہ چار لاکھ بڑی رقم ہوتی ہے۔ تم کہاں سے لاؤ گے؟" زیب النساء نے فکر مندی سے پوچھا۔
"تم فکر مند اور پریشان نہ ہو۔" اس نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچ لیا ہے اور اس کی ایسی منصوبہ بندی کی ہے کہ مجھے کسی قسم کی پریشانی اور مشکل اٹھانی نہیں پڑے گی نہ ہی کوئی رکاوٹ پیش آئے گی۔"
"کیا صرف سوچنے سے بات بن سکتی ہے؟ اصل مسئلہ رقم کا ہے؟"
"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے کیا منصوبہ بندی کی ہوئی ہے۔ ہر بات میرے علم میں ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے پاس کتنا مال ہے۔ ان کی تجوری میں کتنا مال بھرا ہوا سڑ رہا ہے۔ آخر وہ کس دن کام آئیں گے باپ ہونے کے ناتے؟ کیا اس مال کا وہ مربہ بنائیں گے؟ ہمارے خاندان میں سبھی لمبی عمر پاتے ہیں۔ وہ مزید تیس برس جی جائیں گے تو میں ہو جاؤں گا ساٹھ برس کا..... پھر ان کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا کروں گا؟ کیا مزار بناؤں گا بڑے قبلہ حکیم صاحب کا..... اور میں مجاور بن کر بیٹھ جاؤں؟"
"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" زیب النساء نے اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔
"میری باتیں گستاخانہ اور منحوس ہیں..... مگر سچ تو سچ بڑا تلخ اور کڑوا کسیلا ہوتا ہے..... ان کے لیے دو لاکھ نکال کر دینا ایسا ہی ہے جیسے دو سو روپے..... جبکہ میں قبلہ بڑے حکیم صاحب کی اکلوتی اولاد ہوں۔ وہ مجھے کیسے انکار کر سکتے ہیں..... تم کہہ سکتی ہو کہ یہ بلیک میلنگ ہے مگر میں بھی تو خاندانی پیشے کے نام پر بلیک میل ہی تو ہوا ہوں..... اور آگے جا کر مجھے ذلت و خواری کے سوا کیا ملے گا؟ کہتے ہیں میرے پردادا بڑے نامور حکیم تھے۔ صف اول کے بیسیوں میں شمار ہوتے تھے۔ دادا نے بھی عزت کی زندگی گزاری..... ان کو نہ عزت ملی اور نہ دولت..... پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں..... بچپن سے میں نے تنگ دستی کے سوا دیکھا ہی کیا ہے۔ یہ خاندانی پیشہ میری اعلا تعلیم کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں اور تم مل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے..... یہ سمجھو کہ تم میری آدھی طاقت ہو زیبی جان! تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی محال ہے میرے لیے..... یہ صرف کہنے کی کوئی رسمی بات نہیں..... میں واقعی تم سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا ہوں..... اور اسی لیے میں نے تمہیں شریک راز کیا۔ سب سے پہلے تمہیں بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"
زیب النساء کا سارا تذبذب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور اس نے گہری سانس لی۔

''اگر تم کہتے ہو تو...... میں سب کروں گی...... تمہارے سوا میں نے کبھی آج تک کسی کے بارے میں سوچا تک نہیں...... میں نے ان جانے خواب اور چشم تصور میں تمہاری آغوش میں پایا ہے۔ میں اپنے چہرے اور وجود پر تمہارے بوسوں کا لمس اور ان کی تپش محسوس کرتی رہی ہوں۔ آرزو کرتی رہی کہ یہ سب کچھ جلد سے جلد حقیقت کا روپ دھار لے۔''

''بس تو پھر ہاتھ ملاؤ۔'' حفاظت نے اس کا مرمریں ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا۔

''ہم شادی کب کریں گے حفاظت......؟'' زیب النساء نے لجاتے ہوئے پوچھ لیا۔

کرنے میں تو پل بھر کی تاخیر نہیں ہو سکتی۔ آج ابھی اور اس وقت یہ نیک کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ مگر کامیابی کی جدوجہد تھوڑا سا ضبط، صبر اور قربانی مانگتی ہے۔ تم مجھے صرف دو برس دو...... اور ایک منصوبہ بھی ہے میرے ذہن میں...... تم دیکھو گی کہ دو برس میں اس پر کیسے عمل ہو گا؟ یہ جو ہمارا خاندانی گھر ہے...... لمبائی کے رخ دس مرلے پر پھیلا ہوا ہے۔ پانچ مرلے میں ہم رہتے ہیں اور مطلب ہے...... باقی پانچ میں دواخانہ، اسٹور اور کام کی جگہ ہے۔ یہ مین روڈ پر کمرشل سائٹ ہے...... اس کی قیمت کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں...... ہم تو خاندانی جاگیر سمجھ کر رہتے چلے جا رہے ہیں...... ہم اسے کسی بلڈر کے ہاتھ فروخت کریں تو اتنی رقم مل سکتی ہے کہ یہ آسانی اتنا ہی بڑا کسی بھی نئی آبادی میں لے سکتے ہیں۔ جوہر ٹاؤن، فیصل ٹاؤن، گرین ٹاؤن، تم نے نام بھی نہیں سنے ہوں گے ان کے...... لیکن میں جلد بازی نہیں کرنا چاہتا...... دو برس میں دس دس لاکھ اپنا کما لوں تو پھر اسے بھی ٹھکانے لگا کر ایک بار ہی سیدھے گل برگ جائیں گے...... میں اور تم...... شادی کے لیے ہم یہ ہوٹل بھی بک کرا سکتے ہیں۔''

خوشی...... شرم و حیا سے گلابی ہو کر، حیرانی سے مغلوب زیب النساء ہنسی۔

''ہائے اللہ...... کیا کہیں ہوٹل میں بھی شادی ہوتی ہے۔ میں نے سنا نہیں کبھی......؟''

''نہیں سنا تو سن لو...... پاگل ہو گئی ہو...... آج دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے...... موبائل فون اور انٹرنیٹ پر کیا کچھ دکھایا نہیں جا رہا ہے...... لڑکیوں اور عورتوں تم دیکھتی آ رہی ہو وہ کس حالت میں گھر سے نکلتی ہیں اور یہاں بھی کیسی بے حجابی اور عریانیت کا چلتی پھرتی اشتہار بنی ہوئی ہیں...... نہ ان کے ماں باپ کو شرم اور ان کے بھائیوں اور شوہروں کو اس حالت پر احساس اور شرم...... شوبزنس کی دنیا اور کمرشل میں کام کرنے کے لیے لڑکیاں جاتی ہیں تو تم آبرو کی نہیں بلکہ معاوضہ کی فکر کرنا۔ ان کی ہر بات کو مان کر انہیں خوش کرنا...... نخرے اور شرم نہیں کرنا...... یہ شوبزنس کی ہر لڑکی عورت اور مرد بھی طوائف سے بدتر ہوتے ہیں۔ ماں کنواری لڑکیوں کو سمجھا کر بھیجتی ہیں کہ آبرو آنی جانی ہوتی ہے...... ورنہ ماضی میں مائیں لڑکیوں کو تاکید کرتی تھیں کہ ایک لڑکی کی آبرو بہت قیمتی ہوتی ہے۔ جان چلی جائے لیکن آبرو پر آنچ نہ آئے اس کی پاکیزگی اور تقدس ایک لڑکی کی عزت اور وقار ہے۔ کیا آج کی ماں یہ کہتی ہے؟ سمجھاتی اور نصیحت کرتی ہے آج الٹی گنگا بہہ رہی ہے گھر والے لڑکی کو کمرشل، ڈراموں اور فلموں میں انہیں ہیرو کی آغوش میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور تعریفی انداز سے کہتے اور تبصرہ ہماری بیٹی کا پرفارمنس کو دیکھو...... ارے یار! میں بھی نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ بکے جا رہا ہوں۔ کبھی کبھی وعظ کا دورہ پڑ جاتا ہے جذباتی ہو جاتا ہوں ہاں تو میری جان! کہو تو تمہیں دکھاؤں...... ہوٹل والوں کا ایک برائیڈل سویٹ ہے اردو میں حجلہ عروسی سمجھ لو...... اور ایک ہنی مون پیکج ہوتا ہے کہ آپ یہاں شادی کریں...... دو چار دن رہیں اور عیش کریں ہاں ہنی مون کے لیے تمہارا ارادہ کہیں باہر جانے کا ہے تو اور بات ہے۔ ہم لندن، نیویارک اور پیرس بھی جا سکتے ہیں کیا خیال ہے جانی! اب چلیں۔''

''ہاں چلو...... گھر پر مجھے ایک طوفان کا اکیلے

سامنا بھی تو کرنا ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کاش! ایک ایسا گوشہ تنہائی ہوتا کہ تمہارے ہونٹوں کی مٹھاس اپنے ہونٹوں میں جذب کر سکتا......؟'' حسرت بھرے لہجے میں بولا۔

''تم نے جب کبھی تنہائی میں یہ حسرت پوری کی تو مجھے ایسا نڈھال کیا کہ دو تین جوڑ جوڑ میں درد ہوتا رہا۔'' وہ گلابی ہو گئی۔

باہر آ کر زیب النساء پھر اپنے برقع میں روپوش ہو گئی۔

بادل ناخواستہ...... اسے یوں لگا جیسے وہ پنجرے میں قید مینا تھی جس کو کسی دست غیب نے کچھ دیر کے لیے کھلے آسمان میں پروانہ کی اجازت اور طاقت عطا کر دی تھی مگر لوٹ کر تو اسے پھر اسی قفس کی تنہائی میں جانا ہے۔ شاید اب اس کے لیے آنکھوں میں بس جانے والے خوابوں کے ساتھ اپنے پرانے گھر میں زندگی زیادہ دشوار اور کرب ناک ہو گی...... حالاں کہ اس گھر میں بیس برس گزارنے کے بعد وہ کسی امید کے بغیر جینے کی عادی ہو چکی تھی۔ اب آنے والے دنوں اپنے خوابوں کی تعبیر کے انتظار کا ہر لمحہ کس قدر صبر آزما اور اذیت ہو جائے گا۔ جس کا تصور ہی روح فرسا اور وجود کو دہلا دینے والا تھا۔

حفاظت نے باہر آ کر ایک رکشا لیا اور زیب النساء کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اس کی حرکات دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے زیب النساء کی مرمریں کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کر لیا کہ قرب سے اس کے دل اور بدن میں فرحت سی پیدا ہو۔ گداز اور پرشباب بدن اس کے وجود میں سرور و کیفیت پیدا کرنے لگا۔ زیب النساء کسمسائی تو اس نے سرگوشی میں کہا۔

''تم کسی بات کی فکر نہ کرو اور بالکل پریشان نہ ہو۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ اتار دوں گا اور واپس چلا جاؤں گا جہاں کوئی بھی تمہیں میرے ساتھ نہ دیکھے۔ ویسے بھی تم برقع میں ہو اور آج تمہاری نظر دھوکا کھا گئی تھی تو بھلا مجھے کون پہچانے گا۔''

رکشا والے نے اس کے محلے کی مسجد کے باہر بنے استنجا خانہ پر رکشا رکوا کر اور ایک منٹ کہہ کر اندر گھس گیا۔ نماز کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اس کا مرکزی دروازہ کھلا ہوا نہیں بلکہ مقفل تھا۔ گلی اندھیرے اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ حفاظت نے ان ساعتوں کے فائدے کو جانے نہیں دیا۔ ڈرائیور جتنی دیر میں آیا اس کے ہاتھ اور ہونٹ بہکے تو زیب النساء نے تعرض نہیں کیا۔ وہ بھی مستی میں آ گئی۔ پھر اس نے حفاظت کا ہاتھ تھام لیا جو بے لگام سا ہو رہا تھا۔

حفاظت نے اسے دوسری گلی کے نکڑ پر اتار دیا جو وہ بھی ویران اور سنسان پڑی تھی لیکن آس پاس کے گھروں سے ٹی وی کے پروگراموں اور کمرشل کے گانے سنائی دے رہے تھے۔ جب وہ گھر کی طرف بڑھی جو دوسری گلی میں واقع تھا۔ اس پر حفاظت کی من مانیوں کا نشہ طاری تھا۔ اس کی دونوں سہیلیوں کو اس نے جب بتایا کہ اس کے منگیتر نے اسے شام باغ جناح میں ملنے کے لیے کہا ہے تو انہوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ تمہیں کسی ہوٹل کے کمرے میں لے جانا چاہے تو تعرض اور تامل نہ کرنا۔ وہ یقیناً احتیاط برتے گا۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایسی آزادانہ اور فطری ملاقاتوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے۔ اسی لیے تو وہ اور آج کی بہت ساری لڑکیاں، دفاتر میں ملازمت کرنے لڑکیاں عورتیں بے دھڑک اور بے وقوف ان کے ساتھ ہوٹلوں اور فلیٹوں پر لے جاتے ہیں۔ اسے مایوسی ہوئی تھی کہ حفاظت اسے کسی ہوٹل کے کمرے میں نہیں لے گیا۔

جمیل کے بہت اطمینان دلانے کے باوجود کہ وہ بات ایک لمحاتی حادثہ سمجھ کر بھلا دی گئی ہو گی حفاظت نے دوبارہ خالہ کے ڈیرے پر جانے کی ہمت نہیں کی۔ اسے خوف اور اندیشہ تھا کہ شیدے کے نہ ہونے باوجود کہیں خالہ اسے بلیک میل کر کے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ جکڑے۔ ایک ایسا امکان تھا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خالہ نہ صرف بدکار اور بدچلن بلکہ شکاری عورت تھی۔ جب اس نے خالہ اور شیدے کو جس عالم میں دیکھا تھا خالہ ایک طوائف کی طرح بے

شرمی سے کھڑی رہی۔ اس نے اپنا تن چادر سے ڈھکا نہیں اور نہ ہی دوسرے کمرے میں گھسی تھی۔ وہ کتیا کی طرح کھڑی رہی تھی۔

گڑھی شاہو میں جمیل کا دوسرا ٹھکانا پرانے کراؤن سینما کے عقب میں ایک بیٹھک تھی۔ پیچھے والے گھر کے بارے میں جمیل نے بتایا کہ میرپور آزاد کشمیر کے کسی آٹو میکنک کا تھا جو اپنی فیملی بھی یو کے لے گیا ہے اور مکان برائے فروخت ہے۔ اس کی چابی جمیل کے کسی جاننے والے پراپرٹی ڈیلر کے پاس تھی۔ وہ اس کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ حفاظت کے اطمینان کے لیے جمیل کی وضاحت کافی تھی۔ اگر وہ یہاں بھی کسی خالہ کا ذکر کرتا تو اسے دور ہی سے سات سلام کرلیتا۔ لیکن ایک ایسی بات تھی جو وہ جمیل کو بھی بتانا نہیں چاہتا۔ خالہ تین نوجوان لڑکیوں کی ماں نہیں بلکہ بڑی بہن دکھائی دیتی تھی۔ اس نے خالہ کو جس حالت میں دیکھا اس میں جو گداز تھا اس پر بجلی گرادی تھی۔ اگر شیدے نے تشدد نہیں کیا ہوتا تو شاید وہ کسی دن موقع دیکھ کر ان کی جب تینوں لڑکیوں اسکول کالج جا چکی ہوتیں تو پہنچ جاتا۔ خالہ اسے خالدہ اور رانی کی طرح آلودہ کردیتی۔ اسے پیش قدمی کی نہیں بلکہ وہ خود ہی پیش قدمی کرتی اور فیاضی سے مہربان ہوجاتی۔ کیوں کہ وہ بدچلن اور شکاری عورت تھی۔ کبھی کبھی رات کو وہ چشم تصور میں آتی تو اس کے جذباتی کیفیت بے قابو ہوکر ماہی بے آب کی طرح تڑپاتی۔

آج اسے جمیل سے زیب النساء کی رپورٹ پیش کرنے کے بعد اس نے جو مستقبل بنایا تھا اس پر تبادلہ خیال کرنا تھا۔ معاملات تیز رفتاری سے ایک سمت بڑھ رہے تھے اور اس کا طے کرنا نہایت ضروری بھی تھا۔ وہ رکشا والے کو کرایہ کی ادائیگی کرکے گلی میں چند قدم دور چلا گیا تھا کہ اس نے بیٹھک کا دروازہ کھلتا دیکھا۔ روشنی باہر آئی اور اس کے ساتھ ہی بیٹھک سے نکلنے والے کا چہرہ نظر آیا۔ پھر دروازہ بند ہوگیا۔ وہ شخص حفاظت کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزرا تو حفاظت نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔

یہ وہی تجوری کی چابی بنانے والا تھا۔ حفاظت حیران ہوا کہ وہ اس وقت جمیل سے ملنے کیوں آیا تھا؟

''آؤ شہزادے......!'' جمیل نے کہا۔ ''بڑی دیر لگادی اپنی چھمک چھلو کے ساتھ...... کیا تنہائی میں من مانیاں کرنے لگے تھے؟''

''یار! یہ قفل ساز وہی تھا نا؟ یہ کیوں ملنے آیا تجھ سے؟''

''کیوں......؟'' جمیل ہنسنے لگا۔ ''کیا مجھ سے ملنے صرف چھوٹے حکیم صاحب ہی آسکتے ہیں۔''

حفاظت نے اس کی بند مٹھی کو دیکھا۔ ''تیرا جاننے والا ہے نا؟''

''ابے او احمق...... اگر جاننے والا نہ ہوتا تو میں ایسے خفیہ اور خطرناک مشن پر کیا تیرے پاس بھیجتا؟''

☆☆☆

حفاظت نے اس کی دل کش انداز سے مسکراتی ہوئی جیتی جاگتی تصویر کو جو کسی فوٹوگرافر نے بڑی مہارت سے اسی طرح کھینچی تھی کہ اس کے کشش کے خزانے ابل پڑے تھے۔ پرشباب بدن کا گداز آتش فشاں کی طرح دہک رہا تھا...... عورت کے بدن کا گداز سم قاتل ہوتا ہے...... یوں لگتا تھا کہ ابھی وہ پلک جھپکے گی اور اس کے گلاب کی پنکھڑی جیسے لب شیریں وا ہوجائیں گے۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے اپنا نام انجلینا جولی کیوں لکھا ہے؟''

''میری بات کا جواب دو کہ تم نے اپنا حفاظت کیوں لکھا ہے؟''

''اس لیے کہ میرا یہی اصل نام ہے جو میرے والدین نے رکھا ہے۔'' حفاظت نے کہا۔

''میں نے تصدیق کیے بغیر مان لیا تھا اور کیا نام سے فرق پڑتا ہے؟''

''کالے کالے بال، کالی کالی آنکھیں یہاں عام ہیں میرا کمپلیکشن تمہیں کنفیوز کرتا ہے تو میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''فیس بک پر تمہارے ہر ملک کے دوست

ہوں گے؟'' حفاظت نے سوال کیا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ کوئی بھی نہیں...... تو کیا تم یقین کرلو گے؟ مگر حقیقت یہی ہے جو بہت جلد کھل جاتی ہے اور اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ بھروسے کے قابل نہیں...... بہت ہی کھوکھلے اور غیر دلچسپ ہیں۔ اچھا اب تم اپنے دوستوں کے بارے میں بتاؤ؟''

''سمجھ لو کہ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا...... ہر تجربہ غیر دل چسپ اور ناکام رہا۔''

''کیا تم اسے اپنی ناکامی نہیں مانتے ہو؟ آخر وہ کون لوگ تھے؟''

وہ جو کوئی بھی تھے ان کے ساتھ میں نہیں چل سکا...... نہ وہ میرے ساتھ۔''

''ان میں خوب صورت، نوجوان اور سیکسی لڑکیاں بھی ہوں گی؟''

''لیکن ان میں تم جیسی ایک بھی نہیں تھی...... مجھے کوئی اچھی نہیں لگی۔ جب کہ ہر لڑکی خود کو نہایت حسین اور سیکسی سمجھتی ہے۔'' حفاظت نے لکھا۔

''اچھائی کا تمہارے نزدیک کیا معیار تھا؟ خصوصاً ایک لڑکی میں......؟''

حفاظت کو ایک پل کے ہزارویں حصے میں سوچنا پڑا۔ پھر اس نے لکھا۔

''اگر تم میری صاف گوئی کا صبر نہ مانو...... کیوں کہ ان میں تم جیسی کوئی بھی نہیں تھی...... بلاشبہ تم ہر لحاظ سے ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہو...... تمہارے مقابلے میں انہیں بدصورت قرار دیا جاسکتا ہے۔''

''کیا تم نہیں سمجھتے کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ بعض کا دل نیگرو لڑکیوں پر آجاتا ہے...... کہتے ہیں کہ گدھی پر بھی آجاتا ہے۔ کتنے بے جوڑ جوڑے بھی دکھائی دیتے رہتے ہیں۔''

''یہ تو ہر نظر اور ہر دل کا معاملہ ہوتا ہے یا مجبوری...... اچھا تو بتادو کہ میں کیسا لگتا ہوں؟''

''یقیناً فیس بک پر اب تک ہر لڑکی نے یہی کہا ہوگا کہ تم مردانہ وجاہت کا نمونہ ہو...... تصوراتی محبوب کی طرح لگتے ہو۔ ہیرو معلوم ہوتے ہو۔ لڑکی کی آرزو ہوتی ہے اور ہم آغوشی کے خواب دیکھتی ہے۔ میری رائے مختلف کیسے ہوسکتی ہے۔ آخر میں بھی تو ایک حساس دل رکھتی ہوں۔''

''کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا نہیں ہے؟'' حفاظت کا دل جھوم اٹھا۔ ''حسن کے عالمی معیار پر تم بلاشبہ نہایت حسین اور سیکسی ہو تم بے انتہا حسین ہو۔''

''کہنے والے تو بہت کچھ کہتے ہیں۔ کوئی مشورہ دیتا ہے کہ میں ماڈلنگ کرلوں۔ میرے فگر اس معیار پر اترتے ہیں۔ اس پیشے میں، شوبز میں سیکسی لڑکیوں کی مانگ ہمیشہ رہی ہے۔ میں سب کو پیچھے چھوڑ سکتی ہوں۔ حالانکہ میں نے فطری حالت کی نمائش نہیں کی...... ان کا کہنا ہے کہ لباس میں ہی میں قیامت نظر آتی ہوں ایسے بھی ہیں جو یقین دلاتے ہیں کہ میں مقابلہ حسن میں شرکت کروں تو مس یونیورس بن سکتی ہوں مگر میں یقین نہیں کرتی...... میں ایک حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ کبھی خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوں گی۔''

''ساری دنیا غلط تو نہیں ہوسکتی...... وہ خودغرض نہیں ہوں گے جو تمہارے حصول کے لیے تعریف کرتے ہوں۔''

''میری ایک سہیلی دو برس پہلے مس یونیورس منتخب ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ عالمی حسن کے مقابلے اس لڑکی کو یونیورس منتخب کیا جاتا ہے جو ججوں کو ہر طرح سے خوش کریں۔ اسے بھی مشروط منتخب کیا گیا ہے۔ وہ میری روم میٹ تھی۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی پردہ نہیں تھا۔ ایک بستر پر بے لباس سوتی تھیں۔ اس نے میرے فگر سے متاثر ہوکر کہا تھا کہ تم بھی آئندہ سال حصہ لو...... اس میں بہت سارے فائدے ہیں۔ منتخب ہوتے ہی دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ دار، شیخ اور فلم ساز فلموں کے آفر کرتے ہیں۔ ہر کالی رات کے لاکھوں ڈالر ملتے ہیں۔ شہرت، دولت اور مقبولیت قدم چومتی ہے۔ پھر بھی میں نے حصہ نہیں لیا۔ لیکن اپنی سہیلی اور ان کو مشورہ

دینے والوں کی بات نہیں مانی..... کیوں کہ میں انہیں درست نہیں سمجھی۔"

"مگر وہ خود غرض اور قصور وار نہیں..... ان کے جذبات مختلف نہیں ہو سکتے۔"

"مرد اور عورت کے لیے ایک دوسرے کی کشش محض حیوانی جذبہ ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "جب کہ مجھے خلوص چاہیے..... ہم دردی اور شرافت چاہیے۔ میں ایک دوست کی تلاش میں ہوں جو مخلص اور بے غرض ہو۔"

کیا اتنی بڑی دنیا میں واقعی تمہارا کوئی دوست نہیں.....؟ حیرت ہے۔"

"اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے..... اور مجھے غلط بیانی سے کیا ملے گا؟ میں نے جسے دوست بنانا چاہا اسے خود غرض، ہوس پرست اور مجھے آلودہ کرنے کا جذبہ کار فرما محسوس ہوا۔ عورت بہت جلد کیا بلکہ ایک نظر اور ایک ملاقات میں مرد کی آنکھوں میں اس کی نیت کو بھانپ لیتی ہے۔"

"میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔" حفاظت نے فوراً ہی وضاحت کی۔ "جس سوسائٹی میں تم رہتی ہو وہاں تو بوائے فرینڈ زبچپن ہی سے بن جاتے ہیں اور وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ بنتے رہتے ہیں۔"

اس نے جواب چند لمحوں کے بعد جواب دیا جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

"شاید میں تمہیں اپنے دل کی بات سمجھا نہیں سکتی..... بوائے فرینڈ میرے فرینڈ نہیں..... وہ بھی حسب ضرورت اپنی گرل بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی دوستی جسمانی خواہشات پر استوار ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے کھلونے ہوتے ہیں۔ ایک ہی کھلونے سے جی بھر جاتا اور اکتا جاتا ہے۔ لہٰذا نئے کھلونے کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ یہاں ایسا ماحول ہے۔ میں جذباتی طور پر خود کو تنہا محسوس کرتی ہوں۔ کوئی بھی میری توقعات پر پورا نہیں اترتا..... ہر کسی کی آنکھوں میں میل ہوتا ہے..... پتا نہیں میں کیا چاہتی ہوں۔ میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"تم مجھے بھی آزما کر دیکھ سکتی ہو؟ شاید میں ہی ہوں جس کی تمہیں تلاش تھی؟"

"اسی لیے تو میں یہ سب تمہیں کسی امید پر ہر بات صاف اور وضاحت سے بتا رہی ہوں۔ تمہیں اندھیرے میں رکھنا اور فریب دینا نہیں چاہتی۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس مجھے یہ خوش خبری دیتی ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔"

"کیا تم میری اس بات کا یقین کرو گی کہ میں بھی خود کو اتنی بڑی دنیا میں تنہا محسوس کرتا ہوں۔" حفاظت نے لکھا۔

"لیکن میں نے سنا جیسا کہ میرے علم میں آیا ہے کہ تمہارے ملک میں بھی لڑکیاں بہت زیادہ آزاد خیال اور بولڈ ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ کوئی لڑکی عورت ایسی نہیں ہے جو ہر وقت موبائل تھامے نہیں رہتی ہو..... انٹرنیٹ نے انہیں بہت بے باک اور بولڈ بنا دیا ہے۔ وہ موبائل اور انٹرنیٹ سے بے باک اور بولڈ ہوتی جا رہی ہیں اب بوائے فرینڈ بنانا دقیانوسی اور معیوب بات نہیں رہی ہے..... جیسا کہ تمہارے معاشرے میں آبرو جو بڑی اہم اور عزت سمجھی جاتی تھی اب وہ ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔ لڑکوں سے آزادانہ میل بڑھتا جا رہا ہے۔ جب کہ ایسی لڑکیاں جو مغرب لڑکیوں سے دو قدم آگے ہیں اور اپنا دل بھی پے لیے پھر رہی ہیں اور ان کا حصول آسان نہیں رہا تو پھر تنہا کہوں ہو؟ جب کہ تم دراز قد، وجیہہ ہی نہیں بہت خوب صورت بھی ہو۔"

"لیکن اس کے باوجود میں نے خود کو کبھی داغ دار اور میلا نہیں کیا۔" یہ لکھتے ہوئے اس کے چشم تصور میں خالدہ، رانی آ کھڑی ہوئیں۔ خالہ اس کی کمزوری تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اس پر مہربان ہو جائیں۔ "کیا پتا ایک دوسرے سے یہ تعارف اور دوستی ہم دونوں کے لیے مبارک ثابت ہو۔ ہم دونوں جو راہی ہیں تلاش بالآخر ختم ہو جائے منزل مراد پر پہنچ کر ایک دوسرے کو پا لیں۔"

"فیس بک تعارف کا اچھا ذریعہ ہے لیکن اس میں دھوکا بہت ہے۔ اکثر لوگ اپنے بارے میں جھوٹ بولتے ہیں لیکن میں ایک بے وقوف ہوں جو صاف بتا دیتی ہوں۔ کوئی بات چھپاتی نہیں۔"

"چلو اعتماد کے اس نئے رشتے کا آغاز میں کرتا ہوں۔ میں بھی تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ میں جیسا تصویر میں نظر آتا ہوں۔ درحقیقت ایسا نہیں ہوں۔ میرے ایک دوست نے میری اصل صورت کو بہت بدل دیا ہے۔ پھر بھی تم مجھے پہچان سکتی ہو۔"

"میں بھی اعتراف کرتی ہوں کہ انجلینا جولی میرا اصل نام نہیں ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہوگا فلموں میں۔"

"ہاں....." حفاظت نے سوچ کر لکھا۔ "لیکن وہ تم سے زیادہ حسین اور پرکشش تو نہیں..... پھر یہ نام اختیار کرنے کی وجہ؟"

"ایک تو میں اس کی اداکاری سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ پھر اس کی اور میری صورت میں اتنی مشابہت ہے جیسے میں اس کی جڑواں بہن ہوں۔ قد اور جسامت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے پہلے میں سمجھتی تھی کہ فائدہ اٹھانے کے لیے سب جھوٹ بولتے ہیں۔ مجھے بے وقوف بناتے ہیں لیکن ہر شخص نے کہا تو میں نے مان لیا..... کیا تم شادی شدہ ہو؟" حفاظت کا اگلا سوال کچھ اور ہوتا لیکن دوسری طرف سے اچانک اور انتہائی غیر متوقع سوال آ گیا۔

"ابھی تک تو مجھے وہ لڑکی نہیں ملی جو میرے لیے اس حد ناگزیر ہوتی کہ میں اسے زندگی بھر کے لیے اپنانے پر مجبور ہو جاتا۔

پاکستان میں تو بیٹے کے جوان ہوتے ہی اور برسر روزگار ہوتے ہی ماں باپ زبردستی اس کی شادی کر دیتے ہیں..... جو پہلے سے طے ہوتی ہے، کسی کزن کے ساتھ..... اسے پسند کی شادی کی اجازت نہیں دی جاتی۔"

"آف کورس، یہ ہوتا آیا ہے..... اللہ کا شکر ہے میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ میں بچا ہوا ہوں، تمہارا تجربہ کیا ہے؟"

"وہی جو تمہارا تھا..... میں بھی ایک مسافر کی طرح منزل کی تلاش میں سرگرداں..... امید پر ہر ایک سے خود کو وابستہ کر لیتی آئی ہوں۔ پھر مایوسی کے سوا ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ کیوں کہ جب ان کی آنکھوں میں ہولنا کی دیکھتی تھی، دور ہٹ جاتی تھی۔ پھر بھی مایوس نہیں ہوں۔"

"بڑی حیرانی کی بات ہے۔ وہاں روز شادی ہوتی ہے۔ بعض شادیاں ایسی ہوتی ہیں، ایک دن نہیں بلکہ ایک گھنٹے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ شاید اس لیے کہ لڑکیاں بچپن میں باغی اور خود مختاری کے تجربات شروع کر دیتی ہیں۔ سیانی ہوتے ہی وہ کلی سے پھول، لڑکی سے عورت بننے کے لیے بے تاب ہو جاتی ہیں۔ ایک لڑکی اس بات پر فخر کرتی اور نازاں ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں بہت سارے لڑکے، مرد آتے ہیں، پھر وہ مواز نہ مقابلہ کرتی ہیں۔ اس ان جانے راستے پر ہمارے ہاں کی طرح لالچ دے کر زبردستی ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا جب کہ تمہارے ہاں ہر سیانی ہو جانے والی لڑکی اپنی مرضی اور خوشی سے لذتیت کے لیے بہکتی، بگڑتی اور داغ دار ہوتی ہیں۔ تمہاری عمر تو اب چوبیس برس کی ہو چکی ہے۔ تم گندے تالاب میں کنول کی طرح ہو۔"

"معلوم نہیں تم کتنا یقین کرو گے؟ مجھے پرپوز کرنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی۔ لیکن میں نے عجلت اور جذبات کی رو میں بہہ کر فیصلہ نہیں کیا۔ گو جوان اور مردوں، لڑکیوں کے جذباتی مناظر، راتوں کو دکانوں کے سائبانوں، انڈر پاس کے کنارے، ساحل سمندر..... نائٹ کلبوں..... شراب خانوں اور پارکوں میں نظر آتے تھے۔ ہم آغوش اور باہم پیوستگی عام تھی اور اب بھی ہے..... جو کسی نے اپنا گھر بسانے کے لیے شادی کی پیش کش کی تو مجھے ان میں ایک بھی سنجیدہ قابل نہیں لگا، جس کے ساتھ میں اپنی ساری زندگی گزار لیتی۔ جو مخلص ہو، ظاہر و باطن ایک رکھتا ہو۔ شادی کو میری طرح لمبے سفر کی ذمہ داری سمجھتا

ہو...... اور جیسے کہ ہم سے شادی کے وقت کہا ضرور جاتا ہے...... ہم ہر حال میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھائیں گے...... جب تک موت جدا نہ کردے۔ آج کل تو عملاً شادی نہ صرف مذاق بن کر رہ گئی ہے بلکہ ایک جسمانی لذت۔‘‘

’’حیرت ہے کہ تم مغرب کی پروردہ ایک روایتی مشرقی عورت کی طرح سوچتی ہو۔ اب تو تم میں اس کا وجود بھی نہیں رہا ہے۔‘‘ اس بار جواب اتنے طویل وقفے کے بعد حفاظت فکر مند اور پریشان ہوگیا۔ اس نے ایسی کوئی دلی اور جذبات کو ٹھیس لگانے والی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کی اہانت کی تھی۔ پھر گفتگو کا سلسلہ منقطع کیوں ہوگیا؟ لنک ٹوٹ گیا یا پھر سسٹم میں کوئی خراب پیدا ہوگئی؟ مگر اسی وقت جواب آ گیا۔

’’ڈاکٹر......! اب تم نے پوچھا ہے تو میں بتا دیتی ہوں۔ تمہارا شک صحیح تھا۔ میں واقعی ایشیائی ہوں۔‘‘

’’گویا یہ تمہارا نام اصل نہیں ہے......؟‘‘

’’نہیں...... میرا نام صوفیہ ہے۔ میری ماں ہندوستانی تھی۔ باپ کا تعلق پاکستان سے تھا۔ میں لندن میں پیدا ہوئی اور امریکا آ گئی۔‘‘

’’تمہارے نام سے ظاہر نہیں ہوتا کہ تم مسلمان ہو یا کرسچین؟‘‘

’’کیا تمہیں اس سے فرق پڑتا ہے؟ کیا اس کا جاننا ضروری ہے؟‘‘

’’نہیں یہ بات نہیں۔‘‘ حفاظت نے جلدی سے کہا۔ ’’یہ میں نے رسمی طور پر پوچھا تھا۔‘‘

’’دوستی اور محبت میں...... ملک و قوم یا مذہب کی دیوار کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کیا خیال ہے؟‘‘

’’میں تمہارا ہم خیال ہوں۔‘‘ حفاظت کا جواب تھا۔ ’’تم کیا کرتی ہو؟‘‘

’’وہی جو تم کرتے ہو۔ ہم دونوں کا پیشہ مشترکہ ہے۔‘‘

’’یعنی تم بھی ڈاکٹر ہو؟‘‘ حفاظت لمحے بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گیا۔

’’نہیں، میرا لیول تم سے کم ہے۔ میں ایک تربیت یافتہ نرس ہوں۔ دکھی انسانیت کی خدمت میں دن رات مصروف رہتی ہوں۔‘‘

’’کون سے اسپتال میں ملازمت کرتی ہو؟ یہ تو بڑا مقدس پیشہ ہے۔‘‘

’’کسی اسپتال میں نہیں...... میرا مطلب ہے ملازمت کیوں کہ میرا اپنا نرسنگ ہوم ہے۔ آج میں اپنی وال پر جو تصویریں پوسٹ کروں گی، ان سے تمہیں میری پرائیوٹ لائف کے بارے میں بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔‘‘

’’ویری گڈ...... اچھا تو اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ بریف تو کرو۔‘‘

’’میری ماں دس برس قبل الگ ہوکر ایک ہندوستانی ڈاکٹر کے ساتھ چلی گئی، جو بنگالی تھا۔ کیوں کہ ان کے درمیان جو محبت تھی وہ تعلقات میں بدل گئی تھی۔ ڈاکٹر کا کول کتا میں بہت بڑا اسپتال ہے جو میں نے جا کر آج تک نہیں دیکھا البتہ اس کی تصویریں دیکھی ہیں، میں نے اپنی ماں سے کوئی رابطہ نہیں رکھا...... کیوں کہ اس کی بدچلنی نے میرے دل میں اس کے خلاف نفرت پیدا کردی تھی۔ میرا باپ بہت محنتی اور وفادار تھا۔ وہ اتنا خوب صورت اور وجیہ تھا کہ لڑکیاں عورتیں اس سے تعلقات کی خواہاں ہوتی تھیں لیکن وہ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ وہ الیکٹریکل انجینئر تھا اور اتنا زیادہ دولت مند نہیں تھا۔ میری ماں نے اس بنگالی ڈاکٹر سے تعلقات استوار کرکے بے وفائی اور بدکاری کی تھی۔ میرے بالغ ہونے تک میرے باپ نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ پھر میں نے اس کا گھر چھوڑ دیا تاکہ وہ دوسری شادی کر سکے۔ اس نے مجھے نرسنگ کے شعبے میں تعلیم دلوائی تھی اور یہ نرسنگ ہوم بھی قائم کرکے دیا۔ اب اس سے میرا کوئی رابطہ نہیں۔ کیوں کہ وہ ساؤتھ افریقہ چلا گیا۔ بہت دکھی تھا۔ اس نے میری ماں سے لومیرج کی تھی اور بہت چاہتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا میری ماں ڈاکٹر سے تعلقات

قائم کرے گی اس نے ایک دن میری ماں اور ڈاکٹر کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ چاہتا تو ان دونوں کو قتل کردیتا اور اس پر آنچ نہیں آتی...... ڈاکٹر کی بیوی کے فلیٹ پر وہ دونوں ہم آغوش تھے۔ ڈاکٹر کی بیوی بھی بنگالی تھی۔ دنیا جانتی تھی کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے ہیں مگر میرے باپ نے ان دونوں کو آلودہ دیکھ کے خاموشی اختیار کرلی تھی۔‘‘

’’یعنی تم اکیلی رہتی ہو...... بالکل اکیلی؟ کوئی خوف نہیں آتا؟‘‘

’’اس میں اس قدر حیران ہونے والی کون سی بات ہے...... آدمی پیدائش سے پہلے بھی اکیلا اور موت کے بعد بھی زندگی تو چار دن کی ہوتی ہے دو دن چاندنی کے دو دن اندھیرے کے۔‘‘

’’تم اپنا وقت کیسے گزارتی ہو؟ کیسے گزر جاتا ہے؟‘‘

’’میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ نرسنگ ہوم میں بہت کام ہے۔ اس کے لیے دن رات کی قید نہیں...... روح کی تسکین اور خوشی کے علاوہ اس کام میں مجھے بڑی معقول آمدنی ہے۔ اس کام کو میں بڑھانا چاہتی ہوں تاکہ میری زندگی آج کے مقابلے میں زیادہ باعزت اور پرآسائش ہو۔ کسی کی محتاج نہ ہوں۔ آج کے مقابلے میں میرے پاس زیادہ بڑا گھر ہو۔ اس سے اچھی کار ہو۔ لیکن افسوس کہ میرا ساتھ دینے والا کوئی مخلص آدمی جس پر میں بھروسا کرسکوں۔‘‘

’’کیا تمہاری دوست مس یونیورس کا تم سے رابطہ ہے؟ وہ تمہیں بھول تو نہیں گئی؟‘‘

’’مس یونیورس بننے کے بعد اس میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہوچکا تھا۔ وہ تین ماہ تک میری روم میٹ رہی تھی۔ ہم دونوں جس حالت میں سوتی تھیں ایک بستر میں اس نے ہم دونوں میاں بیوی بنا دیا تھا۔ ودمن ہوٹلز میں جو اکیلی ایک کمرا افورڈ نہیں کرسکتی تو وہ مل جاتی ہیں۔ ایک بستر پر دو ساتھ سوتی ہیں تو یہ فطری امر ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی ساتھی اور زینت بن جائیں۔ مس یونیورس بننے کے بعد وہ ایک کال گرل بن گئی۔ فلموں میں کام کیا لیکن وہ ایک کامیاب اداکارہ نہ بن سکی۔ ایک بوڑھے دولت مند کی بیوی بن گئی۔ ہندوستان کی جتنی لڑکیاں یونیورسٹی بنیں۔ وہ عرصہ تک کال گرل رہیں۔ پھر شادی کرکے گھر بسا لیا۔‘‘

حفاظت کا دماغ دوبارہ اس راستے پر چل پڑا تھا جو اپنی موت سے پہلے شاہ جی صاحب نے اسے دکھایا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو شاید اسے سنہری موقع کی سرزمین امریکہ پہنچا بھی دیتے۔ اب میں ہوں اور یا تم یک شہر آرزو، رانی ابھی تھانوں میں زیر تفتیش ہے۔ کیوں کہ شاہ جی صاحب کی امریکہ سے آئی لڑکی نے ایک تھانہ دار کے ساتھ نہ صرف رات گزاری بلکہ بڑی رقم بھی دی تھی کہ وہ رانی کو تھانوں کی رانی بنا کر رکھیں۔ اس کے بعد جیل کی ’’مشقت کرے گی۔ رانی کا حسن اور اس کی جسمانی کشش دیوانہ بنانے والی ہے۔

’’ڈاکٹر حفاظت حسین کیا تم لائن پر ہو؟‘‘ سوال آیا۔

’’ہاں میں سوچ رہا کیا بتاؤں کیا سوچ رہا تھا کہ تم نہ جانے کیا مطلب نکالو گی میری بات کا...... ابھی سے میں اپنے بارے میں کوئی دعوے کروں تو کیسے ثابت کروں کہ اس میں صداقت کی سوا کچھ نہیں۔‘‘

’’مجھے تمہارا لہجہ ہی تمہاری صداقت کا گواہ محسوس ہوتا ہے۔ کہو تمہارے دل میں کیا ہے؟‘‘

’’مجھے خیال آیا تھا کہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرسکتا ہوں...... مگر کیسے کروں؟‘‘

’’اٹ اس سو سمپل رئیلی...... مگر پہلے تمہارا آنا لازمی ہے...... نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم مختلف ہو اور شاید ایک جیسا ظاہر و باطن رکھتے ہو اسے پچ کرسکتے ہو۔ اچھا اب میں چلتی ہوں اتنا وقت میں نے کسی کے ساتھ چیٹ کرنے میں صرف نہیں کیا لیکن واقعی میں نے بہت انجوائے کیا بائے۔ ہاں، اس

پرسنجیدگی سے عمل کرنے کا سوچنا ضرور...... جو تم نے کہا تھا...... شام کو وال پر میری فوٹو دیکھنا جو تمہارے لیے ہوں گی۔"

وہ اس وقت اپنی فیس بک کھولے مانیٹر کو گھورتا رہا جب تک صوفی نے خود آ کر اسے یاد نہیں دلایا کہ اس کا ایک گھنٹہ کب پورا ہو چکا ہے۔ حفاظت نے جیب سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

"کیا پہلے والا نوٹ ختم ہو گیا صوفی صاحب؟ کچھ حساب بھی رکھتے ہو کہ نہیں؟"

مرحوم شاہ جی صاحب کی فیاضی کے طفیل اب وہ بھکو نہیں رہا تھا۔ وہ اب باپ کے خزانے پر بھی نقب لگاتا تھا جس کا ابھی قبلہ بڑے حکیم صاحب کے فرشتوں کو بھی ہوا نہیں لگی تھی اور انہیں کیسے پتا چلتا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ آنے والے وقت میں اس کی زندگی بدل جائے گی۔ انقلاب خود اپنا راستہ ہموار کر رہا تھا۔ وقت غیر محسوس انداز سے بدلنے لگا تھا۔

جمیل نے اسے جو منصوبہ بتایا تھا وہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ آج وہ اسے بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔ وقت آ گیا تھا کہ خاندانی تاریخ کی جرنیلی سڑک چھوڑ کر وہ تابناک اور خواب ناک مستقبل کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے۔ پرامن ہو۔ وہ انقلاب کیسا...... جو نقش کہن نظر آئے مٹا دو...... یہ بھی اپنے شاعر مشرق نے فرمایا تھا اور یہ بھی کہ شاہین بن الوعی دم...... ترے سامنے آسمان اور بھی ہیں۔ وہ جمیل کے انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے پرستان کی سیر میں مگن ہو گیا۔ پھر وہ تصور میں صوفیہ کی وہ تصویریں دیکھنے لگا جو وہ اسے دکھانے والی تھی خاص اور خاص صرف اس کی نذر کرنے والی تھی...... ایسی تصویریں جو صرف اور صرف اسے دکھانا چاہتی تھی۔ سیلفیاں...... ہر انداز اور زاویے کی جو فطری حالت کی پھر اس کی جگہ خالہ نے لے لی تھی۔ اس روز اس نے خالہ کو جس حالت میں دیکھا اسی حالت میں اس کے روبرو کھڑی انجانی دعوت رہی تھی۔ اس نے ایک بات محسوس کی تھی وہ یہ کہ چالیس برس کی عورت کے پرشباب بدن میں جو گداز ہوتا تھا اور کشش ہوتی تھی وہ نوجوان لڑکیوں میں نہیں ہوتی تھی۔ خالدہ، رانی اور خالہ...... پھر اس نے دیکھا کہ خالہ نے اس کے قریب آ کر اس کے گلے میں اپنی گداز، مرمریں اور عریاں سڈول بانہیں حائل کر کے شیر خوار بنا دیا۔ آج وہ جمیل کو بہت کچھ بتا دینا چاہتا تھا جو بہت سنسنی خیز اور لذت انگیز تھا۔ وہ اس تصوراتی دنیا میں ایسا کھویا اور مگن تھا کہ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ چھاپا کب پڑا۔ ادھر ادھر کے ہر کیبن سارے مجرم رنگے ہاتھوں دھر لیے گئے تھے۔ یہ ہاتھ خالہ کے نہیں تھے ایک پولیس مین کا تھا جس نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ لمس، لذتیت اور بانہوں کا گداز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آیا۔ اس سپاہی نے کوئی سوال کیے بغیر اسے مارنا شروع کیا۔ وہ بدحواس ہو کر اٹھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ہزیانی انداز سے چلانے لگا۔

"صوفی! آخر کیا بات ہے صوفی! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس سپاہی نے اسے کھینچ کر کیبن سے باہر کر دیا اور کرخت لہجے میں بولا۔

"بات بھی پتا چل جائے گی...... تیری ماں کا یار صوفی بھی وہیں ملے گا تھانے میں۔"

حفاظت پر تھپڑوں، مکوں اور گالیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ ایسی ننگی اور فحش گالیاں طوائف اور رنڈیاں بھی نہیں دیتی تھیں جو پولیس دیتی تھی۔ جیسے انہیں خصوصی طور پر ایسی گالیاں ازبر کرا دی جاتی تھیں تا کہ ان کی فطرت ظاہر ہو کہ ان کا خاندان، ماں باپ اور بہنیں اور دیگر عورتوں کا تعلق اور حسب نسب کا پتا چلتا تھا۔ وہ یہ بھول جاتے تھے کہ ان کی گالیاں رنڈیوں کو بھی شرماتی ہیں۔ یہ قانون کے محافظ تھے اور ان کا تقدس خود ان کے ہاتھوں پامال ہوتا تھا۔ حفاظت خود مار پیٹ سے بھاگنے والا آدمی تھا اور اس کے مقابلے پر وہ تھے جو سفاکی اور بربریت کے مظاہرے کا تجربہ رکھتے تھے۔ خون آشام بھیڑیوں کو بھی شرماتے تھے۔ آدمی کو آدمی نہیں حیوان سے بھی بدتر اور حقیقت سمجھتے

تھے۔ وین تک جاتے جاتے حفاظت کا ایک ہونٹ پھٹ گیا اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ تھانے کی نفری نے اسے کسی لاش کی طرح اٹھا کر گاڑی میں پھینکا دوسرے نو گرفتار لڑکے اس سے زیادہ شور کر رہے تھے اور دھمکیاں دے رہے تھے۔ پولیس نے دو لڑکیوں کو موبائل میں آگے بٹھا دیا تھا۔ انہیں مارا پیٹا تو نہیں گیا تھا لیکن بٹھانے کے بہانے ان کے جسموں کے حساس حصوں پر بہکے اور دست درازی کیے بغیر نہ رہے اور انہیں ڈرایا دھمکایا اور گالیاں بھی ان کے حصے میں بھی وہی آئی تھیں۔ وہ رو رہی تھیں...... کانپ رہی تھیں اور ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔ لباس کی شکنیں اور بال درست رہی تھیں۔ جب موبائل اپنی شرمناک اور درندگی کی کارروائی روانہ ہوئی تو اس کے گرد تماشا بینوں کا مجمع اس تمام کارروائی پر ایسا خوش تھا جیسے انہوں نے کوئی رنگین اور سنسنی خیز منظر دیکھا ہو۔ پولیس والوں نے لڑکیوں کو بٹھاتے وقت غیر محسوس انداز سے جو دست درازی اور بے حرمتی کی تھی۔ ان کا بس نہیں چلا وہ ان لڑکیوں کو بے لباس بھی کر دیتے۔ پولیس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ کیوں کہ جب وہ اپنے ماں بہنوں اور بیٹیوں کی عزت کرنا نہیں جانتے تھے وہ دوسری عورتوں کے ساتھ سب کچھ کر سکتے تھے...... دوسری طرف لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اچھا ہوا جو فحاشی کے اڈے پر چھاپہ پڑا۔ صوفی بڑی بدمعاشی دکھاتا تھا۔ سارے لوفر بدکردار لڑکے لڑکیاں جمع ہو جاتی تھیں...... کچھ لوگ اسے پولیس کا ڈراما قرار دے رہے تھے یہ سب پبلک کو دکھانے کے لیے ہے۔ یہ سارے بڑے گھروں کی بگڑی ہوئی اولادیں ہیں۔ ماں باپ پیسے دیں گے اور انہیں چھڑا کے لے جائیں گے۔ تھانے میں فون آنے لگیں گے اور ڈانٹ پڑے گی کہ کس کو پکڑ لائے ہو پاگل کے بچے...... کیا نوکری نہیں کرنی ہے۔ صوفی کل تک سارا معاملہ سیٹ کر لے گا۔ یہ چھاپا پہلی بار تو نہیں پڑا ہے۔ اس کی سرپرستی کرنے والوں کے ہاتھ لمبے ہیں۔

حفاظت نے کچھ دیر بعد خود کو ایک بھیڑ میں پایا۔ وہ سب سلاخوں کے پیچھے تھے۔ پولیس نے بند کرنے سے پہلے سب کے موبائل فون، پرس اور گھڑیاں رکھوالی تھیں۔ وہ اب ایک ساتھ شور کر رہے تھے کہ انہیں فون کرنے دیا جائے۔ ان میں سے کچھ ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ کچھ واقعی بے خوف تھے اور کچھ اپنے آپ کو بے خوف ظاہر کر رہے تھے۔ پولیس والوں کو بتا رہے تھے کہ انہیں گرفتار کر کے وہ سب مشکل میں پڑ جائیں۔ انہوں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا اور ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔

پولیس اسٹیشن میں ان کی کوئی سن نہیں رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لڑکے پہلی بار تھانے آئے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں کہ تھانے میں کیا ہوتا ہے اور کیا کیا ہو سکتا ہے اور کیا کچھ نہیں...... تھانے دار فرعون کا باپ ہوتا ہے۔ فرعونیت کا راج ہوتا ہے۔ اس لیے وہ معمول کے مطابق اپنے کام کر رہے تھے۔ حوالات میں پہلے سے بند مجرموں کی حالت مردہ سے بھی بدتر تھی۔ ان میں سے ایک دیوار کے ساتھ یوں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا جیسے مر چکا ہو۔ اس کے جسم پر مار اور تشدد سے نیل پڑے ہوئے تھے اور سوجن بھی تھی۔ وہ کبھی کبھی بڑی دل خراش آواز میں کراہتا تھا۔ حوالات کے بارہ فٹ، تیرہ فٹ کمرے میں گھٹن اور پیشاب کی بو تھی۔ وہ سب وہیں ایک کونے کے سوراخ کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتے تھے اور وہیں ایک کھلا مٹکا رکھا تھا اور ایک مٹی کا پیالہ جو پانی پینے کے کام آتا تھا۔ آدھا گھنٹہ سلاخوں کے باہر کھڑے سنتری سے ننگی ننگی گالیاں کھانے کے بعد وہ سب مایوس ہو کر دیوار کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئے۔

کسی نے بھی قیدیوں سے کھانے پینے کی بات تک گوارا نہیں کیا۔ جو کھانے کو ملا وہ صرف گالیاں...... انہوں نے جو پرس قبضے میں لیے تھے ان میں رقم نکال کر چکن تکے، چکن بروسٹ، مٹن بریانی، قورمہ، تافتان اور مکس مٹھائی منگوا کر ایسا کھایا جیسے ان کے باپ کا مال ہو۔ وہ سب حرام خور تھے۔ حلال کبھی نہ کھایا اور نہ کھاتے تھے۔ کہیں چھاپہ مار کر آتے تو ان

کی عید اور جشن ہو جاتا تھا۔ یوں بھی ڈیوٹی پر ہوتے تو موبائل کے سپاہی موٹر سائیکل سوار، کسی خوانچے، ہوٹل اور کار والے سے کسی نہ کسی بہانے رقم اور کھانا لے کر کھا لیتے تھے۔ کھانے کے مد میں ان کی جیب سے ایک روپیا نہیں نکلتا تھا۔ مال مفت کی فراوانی تھی۔ بہتی گنگا تھی۔ تھانے داروں کی پتھارے داروں سے جو بھتہ وصول ہوتا تھا یومیہ ہزاروں میں، ان کا یہ سرکاری خزانہ کسی بھی مالیاتی ادارے سے کم نہ تھا۔ تھانے دار نہ صرف سیاہ سفید کا مالک ہوتا تھا بلکہ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ..... جمیل نے حفاظت کو ایک واقعہ سنایا تھا کہ گنے کا رس والا ایک برتن میں بچا ہوا جھوٹا رس جمع کر رہا تھا۔ جمیل نے اس سے کہا کہ بڑی شرم کی بات ہے کہ تم گاہکوں کو یہ جھوٹا رس پلاتے ہو..... اس نے کہا یہ اس میں حرام خوروں کو پلاتا ہوں۔ یہ حرام خور کہتے ہیں کہ ہمیں نہ تو مرنا ہے۔ نہ کوئی عذاب ہوگا نہ آخرت میں حساب کتاب..... گنے کا رس بیچنے والے نے کہا کہ کاش! کوئی مفتی اور علما؟ ان کی نماز جنازہ کو ممنوع قرار دے دے۔ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں اس طرح ان کی بھی نہ ہو۔

یہ جو قیدی تھے انہیں گھر والوں کا خیال پریشان کرنے لگا تھا۔ حفاظت کی پریشانی دہری تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آج زیب النساء اس کی ہدایات کے مطابق یہ اعلان کیا ہوگا کہ وہ چھوٹے حکیم صاحب سے شادی نہیں کرے گی۔ اس سنسنی خیز اعلان کے بعد حفاظت کا پراسرار طور پر غائب ہو جانا طے شدہ پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ معلوم نہیں اس کے پریشان حال ماں باپ کیا مطلب نکالیں گے۔ سمجھنے کو وہ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ دل شکستہ حفاظت نے مسترد کیے جانے کے بعد خودکشی نہ کر لی ہو۔ ایسا فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ زیب النساء کو مجنوں اور فرہاد کی طرح چاہتا ہے اور پھر جب ان پر حقیقت آشکار ہوگی؟

رات کے وقت ایک سنتری کاغذ اور بال پوائنٹ لے کر آیا۔

''اس پر اپنے اپنے نام اور گھر کے فون نمبر لکھ دو..... خبردار جو کچھ اور لکھا۔''

اپنی باری آنے پر حفاظت نے بھی قبلہ بڑے حکیم صاحب کا نام نمبر لکھ دیا۔ اپنے قابل فخر سپوت کے پرستان کی سیر کرتے ہوئے پکڑے جانے پر کیا گزری ہوگی۔ کیا وہ اسی دن کے لیے زندہ تھے؟ بدنامی اور ذلت کا طوق ان کے گلے میں اپنا ہی خون ڈال دے گا؟ بیٹے نے انہیں ایسا خوار کیا کہ وہ گھر سے باہر نکلنے کے قابل ہی نہیں رہے۔ اس کا اندازہ وہ صرف کر سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ اور گزر گیا۔ پھر تھانے دار نے ان میں سے ایک کو طلب کیا۔ وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کے بعد جانے والے دو لڑکے بھی نکل گئے۔ پھر جو تین لڑکے نکل گئے ان کے اذیت چیخنے کے دل خراش آوازیں سن کر باقی کے رنگ بے لہو ہوتے گئے۔ ان کے چہرے سفید چادر کی طرح ہونے لگے۔ جب ان نوجوان خوب صورت لڑکوں کو لایا گیا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے، رہنے کے قابل نہیں تھے۔ نہ صرف ان کے چہرے کا حلیہ بگڑا ہوا تھا بلکہ لباس بھی بے ترتیب ہو رہا تھا۔ ان کے بشروں سے ظاہر تھے کہ کئی ایک نے ان کے ساتھ انسانیت سوز حرکتیں بھی کیں اور تشدد کے ساتھ ان کے حلق سے نکلنے والی کراہوں سے لگتا تھا کہ وہ شاید مرنے والے ہوں۔ وہ مر گئے اور پولیس کی تحویل میں ان کی درندگی، ایذا رسانی اور تشدد سے جو بھی مرتا تھا۔ پولیس اس کا جواز پیدا کر لیتی تھی۔ جیل اور حوالات جانے کتنے بے گناہ قیدی مر جاتے تھے پولیس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لڑکے بھی اگر مر گئے تو ان پر کوئی آنچ آنے سے رہی تھی۔ جب انہیں لا کر حوالات میں پھینکا گیا تو وہ مردوں کی طرح بے سدھ پڑے رہے۔ حفاظت کی حالت بھی غیر تھی مگر دوکا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ وہ آنسوؤں سے روتے، گڑگڑاتے اور منت سماجت کرتے رہے اور رحم کے بھیک مانگتے رہے تھے مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیوں

کہ ان کے سینے میں دل نہیں پتھر تھے۔ وہ قانون کے محافظ تھے۔ ملزم اور مجرم کو سزا دینے کا اختیار انہیں نہیں عدالت کو تھا لیکن وہ قانون کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔ اڑاتے تھے۔ ان کے ہاں جو عقوبت خانے تھے ان میں ملزم اور مجرم کو اس قدر ایذا دیتے تھے تاکہ ان کے لواحقین سے مال بٹور سکیں۔ اگر وہ دنیاوی دولت قبر میں لے جاتے تو جانے کیا ستم ڈھاتے۔ ان کی فرعونیت کے آگے عدالتیں بھی بے بس ہو جاتی تھیں۔ یہ لاوارث قسم کے لڑکے تھے جنہیں نمونہ بنایا گیا تھا۔ ان کے ساتھ کون سی حرکت اور فعل نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے ان سے ہر قسم کا سلوک کر کے بتایا گیا تھا تاکہ ان کے دلوں پر پولیس کی دہشت بیٹھ جائے۔ اس کے بعد طلب کیے جانے والے بھی یوں گئے جیسے انہیں پھانسی دینے لے جا رہا ہو۔ یہ سلسلہ ساری رات چلتا رہا۔ جانے والوں کے گھر والے آتے تھے اور ہاتھ جوڑ کر منہ مانگی رقم ادا کر دیتے تھے۔ تھانے دار کی جیبیں نوٹوں سے بھرتی جا رہی تھیں۔ منہ مانگی رقم دینے کا مطلب اپنے لاڈلے کو جسمانی تشدد کے عذاب سے بچانا ہوتا تھا۔ دوسرا خود کو بدنامی سے بچانا..... ایک عورت آئی جس کا سولہ برس کا لڑکا تھا۔ وہ چھتیس برس کی خوب صورت اور جاذبیت سے بھری تھی۔ اس کے چہرے مہرے اور وضع قطع سے وہ عام سی عورت لگتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ایک غریب اور بیوہ عورت ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ وہ سلائی کا کام کر کے گھر چلاتی ہے۔ اس کے بیٹے کو معاف کر دیں۔ وہ ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی۔ پہلے تو اسے حوالات کے تشدد زدہ لڑکوں کو دکھایا گیا۔ انہیں دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ لرزنے اور کانپنے لگی۔ تھانے دار نے کہا کہ تمہارے پاس رقم نہیں ہے لیکن تم کشش کے خزانوں سے بھری عورت ہو۔ ہماری خدمت کر سکتی ہو انہیں منا کر عورت نے رو رو کر التجا کی کہ وہ اسے بے آبرو نہ کریں۔ ان کا دل پسیج نہیں۔ اس کے بیٹے کو برہنہ کر کے مارنے کے لیے ہنٹر اٹھایا تو وہ ان کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہو گئی۔ جب وہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد باہر تھانے سے نکل رہی تھی اس کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ اس کے بشرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ بہہ رہے تھے چہرے پر سرخ سرخ نشانات جیسے مچھروں نے کاٹا ہو۔ لباس اور بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔ اس سے ایک قدم چلنا بھی دوبھر تھا۔ بیٹے کے سہارے وہ ہچکیاں لیتی گئی تھی۔ یہ کہانی کوئی نئی نہیں تھی۔ اس کے خزانوں کو لوٹا گیا تھا۔ ہر اس لڑکی عورت کے ساتھ جو تھانے اپنے بھائی، باپ اور شوہر کو چھڑانے جاتی تھی۔ اس کے ساتھ دہرائی جاتی تھی۔ ماں ساٹھ ستر برس کی بھی ہوئی تو وہ قابل معافی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک بخشش نہ ہوتی تھی۔ وہ بڑے استہزائیہ اور تمسخرانہ انداز سے کہتے تھے کہ بخشش کرنے والا تو اوپر ہوتا ہے۔

بالآخر دہشت سے نیم جان حفاظت کی باری آ گئی۔

اس وقت صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ وہ لڑکا اپنی ماں کو نکلتے ہی اس کی طلبی ہوئی تھی۔ اس نے بدنصیب ماں کی آہیں، التجائیں اور کراہیں بھی سنی تھی جو حیوانی جذبے کا نشانہ بن رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ایسی معیوب، شرمناک اور نامناسب حرکتیں کی جا رہی ہیں وہ عورت نہیں ہے۔ اسے کھلونا بنایا ہوا ہے۔ حفاظت کانپتا رہا تھا۔ اسے نہ بھوک کا احساس نہ پیاس کا..... اس کی ٹانگیں تھانے دار کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کم زوری سے کانپ رہی تھیں۔ حسب روایت، تھانے کے قانون کے مطابق اس کا استقبال اس کی شلوار اتار کر اور فرش پر لٹا کر تھوڑی سی چمتر ول سے کیا گیا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ ساتھ والے کمرے میں قبلہ بڑے حکیم صاحب اور اس کی ماں ہر آواز سن رہے ہیں۔ وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلاتا رہا مگر کام کرنے والے اپنا کام کرتے رہے خون آشام بھیڑیوں کی طرح۔

جب اسے کھڑا کیا گیا تو وہ اپنی ہی غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا۔ ایک سفاک صورت تھانے دار نے

درندہ لگ رہا تھا اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''کیوں بھئی..... چھوٹے حکیم صاحب.....! ہمارا طریقہ علاج کیسا لگا؟ رانی کو جانتے ہو؟''

یہ سوال اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ پہلے وہ سمجھ ہی نہیں سکا۔ اس پر لرزہ طاری تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ایسی ذلت آمیز تشدد کی حرکت، اذیت اور اس کا درد اور تکلیف اپنی جگہ تھی۔ اس کے سامنے برہنہ حالت میں کھڑا رہنے کا عذاب اپنی جگہ..... کمر پر پڑنے والی بید کی ضرب سے وہ بلبلایا۔

''سنا نہیں..... میں نے کیا پوچھا؟'' تھانے دار نے رعونت سے اپنا سوال دہرایا۔

''جی..... جی، جانتا ہوں۔'' حفاظت نے کرب سے چیخ کر جواب دیا۔ ''اس کی شاہ جی صاحب سے شادی ہونے والی تھی۔

''تو..... تو بھی شریک تھا اس قتل کی سازش میں؟'' وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔

''تھانے دار صاحب! خدا کی قسم لے لیں۔ میں تو ان کا علاج کرنے جاتا تھا۔'' حفاظت نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

''شاہ جی صاحب کی ایک بیٹی نے کہا تھا کہ چھوٹا حکیم بھی رانی سے ملا ہوا تھا۔ تم بھی سنا اس کے ساتھ ہم بستر ہوتے رہتے تھے..... شاہ جی صاحب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر..... کون سی زہریلی جڑی بوٹی لا کر دی تھی اسے باپ کے دوا خانے سے.....''

حفاظت کا اس خیال سے خون خشک ہو گیا کہ اس قتل کے جھوٹے الزام کی تفتیش قبلہ بڑے حکیم صاحب سے بھی ہوگی..... اسی طرح جس طرح جیسے خود اس سے کی گئی تھی۔ اس نے اپنی نفرت اور غصہ دباتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔

''خدا کے لیے رسول کے لیے وہ ضعیف ہیں انہیں کچھ پتا نہیں۔ آپ خود رانی سے پوچھ لیں۔ وہ سب جانتی ہے میرے بارے میں۔''

تھانے دار کچھ دیر رہا اور پھر بولا۔ ''اسے ملوا دو رانی سے.....''

اس وقت دوسری طرف کچھ شور سنائی دیا۔ حفاظت کو یوں لگا جیسے ابھی ابھی اس نے قبلہ بڑے حکیم صاحب کی آواز سنی ہے۔ دو ہاتھوں نے دروازے کی طرف دھکیلا۔ حفاظت نے اپنی شلوار اٹھالی۔ اسے شلوار پہننے کی اجازت دے دی گئی۔

''یہ کیا شور شرابا ہے؟'' تھانے دار سے کسی نے سوال کیا۔

''وہ سر جی..... ادھر ایک بڑی بیٹی تھی۔ اسے کچھ ہو گیا تھا۔ اسپتال لے جا رہے ہیں۔'' کسی نے بتایا۔

لرزتے کانپتے غلیظ حالت والے حفاظت کو ایک سپاہی دھکیلتا ہوا تھانے کے عقبی حصے میں لے گیا۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور حفاظت کو اندر دھکا دے دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا اسٹور نما کمرا تھا جس میں کوئی فرش پر چادر اوڑھے پڑا تھا۔ آہٹ پر اس نے سر سے چادر ہٹائی تو اس نے رانی کو اپنے سامنے دیکھا۔ اس کی شلوار ایک کونے میں پڑی تھی۔ پیروں سے چادر سرک گئی تھی۔ اس نے دیکھا وہ تہمد میں ہے۔ اس کا بالائی جسم زیر جامے میں تھا۔

وہ اک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اگر وہ اکیلا ہوتا رانی جیسے اس سے ہم آغوش ہو جاتی۔

''چھوٹے حکیم صاحب! آپ.....'' اس کا لہجہ جو حیرت میں ڈوبا تھا وہ بڑا درد انگیز تھا۔ ''آپ یہاں کیسے.....؟''

حفاظت اس کے پاس بیٹھ کر اس قدر جذباتی ہو گیا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''یہ لوگ کہتے ہیں تم نے جو شاہ جی صاحب کو زہر دیا تھا وہ میں نے لا کر دیا تھا..... اس لیے کہ ہم دونوں میں تعلقات تھے۔''

رانی بڑی محبت سے اس کے آنسو اپنے ہونٹوں میں جذب کرتی رہی۔ اس مرد و دسپاہی کی موجودگی کی پروا نہ کر کے چوم کر بولی۔

''یہ سب اس حرام زادی امریکی کتیا کا کیا دھرا ہے..... وہ امریکہ سے اس لیے آئی تھی۔ اس کی باپ سے بہت تلخ کلامی ہوئی۔ وہ کہتی تھی کہ میں تمہیں شادی کرنے نہیں دوں گی..... باپ نے اس سے کہا تھا کہ تو وہاں جا کر رنڈی بن گئی ہے..... نائٹ کلبوں میں برہنہ ناچتی، امریکی نیگرو لڑکیاں جو نائٹ کلبوں میں رقص کے دوران اختلاء کرتی ہیں تو بھی امریکی اور نیگرو مردوں کے ساتھ کرتی ہے..... تیری ماں جیسی ہے..... تو بھی ایسی ہی ہے۔ میں ایک دھیلا نہیں دوں گا..... کتیا، حرام زادی تو نجانے کس کا خون ہے؟ یہ اپنی ماں سے پوچھا..... کل صبح ہوتے ہی گھر خالی کر دے۔ رات کو کسی وقت اس نے باپ کا گلا گھونٹ کر مار دیا اور پولیس کو بلا لیا، پولیس نے مجھے پکڑ لیا، اس کتیا نے تھانے دار کو ہر طرح سے خوش کر کے اور ڈالر دے کر اپنا زر خرید غلام بنا لیا تھا..... اس حرام زادی نے تمہارا نام بھی اسی نے لیا ہوگا۔''

''تم جانتی ہو کہ میں نے قتل نہیں کیا..... یہ کیوں مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں..... وہ کہتے ہیں کہ تم نے میرا نام لیا۔''

''وہ جھوٹ بولتے ہیں مگر ان کا ہر جھوٹ سچ ہے..... وہ نہ تو خدا سے ڈرتے ہیں نہ موت سے..... ان کا دین ایمان صرف پیسہ ہے۔ اس کے حصول کے لیے اپنی ماں، بہن اور بیٹی کو بھی بیچ سکتے ہیں..... کیا معلوم بیچتے بھی ہوں گے۔ جب وہ خدا کا وجود نہیں مانتے ہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔'' رانی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''انہوں نے مجھ سے اعتراف کرایا ہے۔''

حفاظت دکھی ہو گیا۔ اس کے دل پر چوٹ لگی۔ رانی نے پولیس کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ وہ غلط نہ تھا۔ اس نے رندھی آواز میں پوچھا۔

''کیا انہوں نے..... تمہارے ساتھ بھی برا سلوک کیا..... اقبال جرم کرانے کے لیے؟''

''برا سلوک.....؟'' وہ تلخی سے بولی اور اس کے چہرے پر کرب ابھر آیا۔ ''دیکھ سکو گے کہ انہوں نے کیا سلوک کیا ہے؟ کوئی اور پوچھتا تو تو میں اپنے سارے کپڑے اتار دیتی اور کہتی کہ لو دیکھو..... گدھوں نے میرا کیا حشر کیا ہے۔ مجھے کوئی شرم نہ آتی..... یہ ان کا حکم ہوتا تھا۔ جب میں ایک عورت تھی تو شرم کا مطلب سمجھتی تھی۔ اور تم بہت اچھے اور معصوم اور سیدھے سادے آدمی ہو..... مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کب تک رہنا..... یہ میرا نیلام کر دیں یا کسی بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس شہر میں بہت سارے پرائیوٹ قحبہ خانے ہیں۔ اس میں بٹھا کر میری آمدنی کھائیں..... ان سے کچھ بعید نہیں، یہ قحبہ خانوں کی سرپرستی کر کے بھتہ لیتے ہیں۔ کوئی تھانے دار ایسا نہیں ہے جو بھتہ سے ہر ماہ لاکھوں نہ کماتا ہو..... مجھے نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے..... کیا کیا جھیلنا ہے..... لیکن میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ..... صرف اس شہر سے ہی نہیں بلکہ اس ملک سے بھی..... شاہ جی صاحب کہتے تھے کہ باہر کی پولیس کسی مجرم کو ایک تھپڑ بھی مارے تو اسے خلاف قانون سمجھا جاتا ہے۔ قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے اور سب کی عزت نفس محفوظ ہے۔ ایسے ہی کسی ملک سے چلے جاؤ..... بھول کر بھی اس ملک میں دوبارہ نہ آتا۔''

وہ بات کرتے کرتے حفاظت کے سینے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ چند لمحوں کے بعد وہ دونوں جذباتی ہو کر ایک دوسرے کو چومنے لگے۔

''ابے چل..... بڑی اچھی اداکاری کر رہی ہے یہ فاحشہ۔'' سنتری نے رانی کی سسکیاں سن کر اندر باہر سے کہا۔

حفاظت کے دل میں آیا کہ اس سپاہی کے منہ پر تھوک دے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا کیا حشر نشر کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ جو فعل، حرکت اور بداخلاقی کی گئی تھی وہ ساری زندگی نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ تھانہ نہیں عقوبت خانہ تھا وہ کچھ دیر اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی کو بھول گیا۔ اس کے دل میں نفرت اور غصے کا الاؤ سا بھڑکا اور اس کے دل میں شدید

خواہش پیدا ہوئی کہ اسے کہیں سے کلاشنکوف مل جائے تو وہ یہاں موجود ایک ایک شخص کو بھون کر نکل جائے۔ باہر موجود سنتری اسے پھر تھانے دار کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں تھانے دار کی بجائے انٹرنیٹ کیفے کے صوفی کو ایک کرسی پر بیٹھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

''کمینے.....'' حفاظت اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''یہ سب تیری کارستانی تھی۔''

صوفے نے غصے میں سگریٹ کو ایش ٹرے میں اس طرح مسل دیا جیسے کسی عورت کو مسل رہا ہو۔

''بکواس مت کرو۔ تمیز سے بات کرو..... تمہاری وجہ سے میرا اتنا بڑا نقصان ہوا۔ آج تک میری جگہ پر چھاپا نہیں پڑا تھا۔ نہ صرف میری بے عزتی الگ نقصان ہوا۔''

''تم پولیس کو بھتہ دیتے تھے۔'' حفاظت نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ''بدکاری کا اڈا چلانے کے لیے..... اوپر جو دو کمرے بنے ہوئے ہیں تم نے لڑکیوں عورتوں کے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔ بدچلن لڑکیاں لڑکے پھانس کر لاتی ہیں۔ انٹرکیف کی آڑ میں بدکاری ہو رہی ہے..... تم دلال ہو..... کٹنجر ہو..... تم جانتے ہو کہ کبھی میں بدکاری کے لیے نہیں آتا تھا۔''

''کیا مجھے نہیں معلوم کہ کون کس کام کے لیے آتا ہے..... تم کتنے شریف ہو حفاظت حسین..... تمہاری وجہ سے پولیس وہاں آئی۔''

''میری وجہ سے.....؟'' حفاظت بھنک گیا۔

''تم الٹا مجھے قصوروار ٹھہرا رہے ہو۔ خود معصوم بنتے ہو۔ تمہارے ہاں بدکاری ہو رہی تھی۔''

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی کوئی بدکاری ہو رہی تھی۔'' صوفی نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ''تم قاتل ہو۔''

''قتل میں نے بھی کبھی کسی کو نہیں کیا۔'' حفاظت نے اتنی اونچی آواز میں کہا۔

''تم پر الزام ہے اس لیے تمہیں پولیس پکڑنے آئی تھی۔ باقی سب خواہ مخواہ دھر لیے گئے۔ وہ بے گناہ اور معصوم تھے..... کسی نے پولیس کو مخبری کی تھی تم وہاں ہو..... وہ تمہاری تلاش میں تمہارے گھر نہیں گئے۔ سیدھے میرے ٹھکانے پر آ گئے..... کون تھا وہ.....؟'

'صوفی ایک غلیظ گالی دی۔ ''یقیناً کسی طوائف کی اولاد ہوگا۔''

''مجھے کیا معلوم.....؟ یہ پولیس کا جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ نہ صرف جھوٹ بولتی ہے بلکہ معصوموں کو جھوٹے الزام میں گرفتار کرتی ہے۔''

''اس نے پولیس کو تمہارے بارے میں ایک ایک بتائی۔ تم شاہ جی صاحب کا مردانہ کم زوری کا علاج کرتے تھے اسے شک ہے کہ ان کا علاج کرتے کرتے اس دوران تم نے رانی سے بھی شاید تعلقات استوار کر لیے۔ اس میں ایسی جنسی کشش تھی کہ ایک جوان مرد کا بے قابو ہونا فطری بات ہے..... چوں کہ رانی کی پیاس نہیں بجھتی تھی اور وہ تشنہ رہتی تھی اس لیے اس آسودگی کی خاطر تم سے تعلقات استوار کر لیے ہوں گے..... اور تم ان کے نکاح میں شریک ہونے بھی گئے تھے اور وہیں تمہیں ان کی بیٹی ملی تھی..... سوچو تو سہی وہ کون ہو سکتا ہے! ایسا کون ہے تمہارا دوست نما دشمن..... مار آئیں..... وہی شاید جسے تم جمیل کہتے ہو۔''

حفاظت دم بخود بیٹھا رہا..... یہ رانی نے تمہیں بتایا.....''الزام تو اس پر ہے؟''

''الزام تم پر بھی آ جائے گا اگر تم نے اپنی جان نہ چھڑائی..... رانی سے کسی کو کچھ ملنے کی امید نہیں ہے۔ بالآخر وہ بھی چھوٹ جائے گی۔ اپنے باپ سے کہو کہ تین لاکھ ادا کر کے تمہیں لے جائے۔ سب نے اپنی اپنی آزادی کی قیمت کی ہے..... ان دو لڑکیوں نے اپنا کنوارپن نچھاور کر کے..... ورنہ انہیں رہائی اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔''

''مگر تین لاکھ.....''

صوفی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تمہاری ماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شاید دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا ہے۔''

☆☆☆

مطب ایک ہفتے سے مقفل پڑا تھا۔ پرانے مریض یا نئے ضرورت مند علاج معالجے کے لیے آتے تھے تو مایوس لوٹ جاتے تھے۔ اردگرد کے لوگ بھی نہیں جانتے تھے کہ مطب جو کبھی بھی بند نہیں ہوا وہ کیوں اور کس وجہ سے بند ہے اور قبلہ بڑے حکیم صاحب یا چھوٹے حکیم صاحب کہاں غائب ہیں۔ انہی میں چوہدری شجاعت بھی تھے۔ ان کے ڈرائیور نے ایک دن کھوج لگا کر یہ معلومات حاصل کر لی تھیں کہ تین چار دن پہلے باپ بیٹا نہیں تھے۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب کی بیوی فوت ہوئی تھی۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ حکیم صاحب اسے کسی اسپتال لے گئے تھے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے سوئم کے بعد سے یہاں تالا پڑا ہوا ہے۔ معلوم نہیں کہ کب کس دن، کس تاریخ کو مطب کھلے گا۔

شاہی خاندانی حکیموں کے اس قدیم مطب خاص سے بہت دور شہر لاہور کے دوسرے کنارے پر (جہاں ایک زمانے میں چار نمبر کی ڈبل ڈیکر بس کا آخری بس اسٹاپ تھا) ذہنی امراض کے اسپتال میں حفاظت سر جھکائے ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ملاقات کی اجازت دینے والا ڈاکٹر ابھی راؤنڈ پر تھا۔ مریض کی آج کی رپورٹ دیکھنے کے بعد ہی وہ اجازت دے سکتا تھا۔ ڈاکٹر کے اندر آتے ہی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک ماتحت نے اس کے آگے آٹھ دس فائلیں رکھ دیں۔

''کس سے ملنا ہے تمہیں؟'' ڈاکٹر نے سگریٹ جلا کر بنچ پر بیٹھے حفاظت سے پوچھا۔

''میرے والد یہاں داخل ہیں ڈاکٹر! ان کا نام صداقت حسین ہے۔''

''اچھا..... اچھا.....'' ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ''قبلہ بڑے حکیم صاحب..... ابھی وہ نارمل ہیں۔ جاؤ مل لو۔''

حفاظت اندر چلا گیا۔ بہت سے مریض ایک اجڑے ہوئے باغ میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایسے مریض تھے جو بھی کبھار دورے کی حالت میں بھی خطرناک نہیں ہوتے تھے۔ وہ پاگلوں جیسی حرکتیں اور باتیں ضرور کرتے تھے۔ چنانچہ پاگل تھے۔ وہ ایک تو کمر پر ہاتھ رکھ کر اجمن کے انداز میں رقص کر رہے اور کوکے مٹکا رہے تھے۔

حفاظت نے اپنے باپ کو ایک دیوار کے ساتھ فرش خاک پر دونوں گھٹنوں پر ٹھوڑی لگائے خلا میں نظریں جمائے دیکھا۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے کپڑے میلے تھے۔ ان کے سر پر ٹوپی نہیں تھی۔ چنانچہ درمیان سے بالکل صاف سر پر گرد اور میل نظر آیا تھا۔ ان کی داڑھی کسی پرندے کے گھونسلے جیسی ہو رہی تھی۔ کم زور تو وہ پہلے ہی سے تھے۔ اب ایک ڈھانچا نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں پر عینک بھی نہیں تھی اور وہ گہرے سیاہ حلقوں میں ڈوب گئی تھیں۔ حفاظت کو دیکھ کر بھی ان کے چہرے پر ویرانی اور اجنبیت ہی رہی۔

حفاظت باپ کی یہ حالت دیکھ کر آبدیدہ سا ہو گیا۔ اس نے آنسوؤں کو روک کر پوچھا۔

''ابا جی.....! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے..... کچھ کھائیں گے تو لا دوں؟''

قبلہ بڑے حکیم صاحب نے بیٹے کے اس سوال کے جواب میں کہا۔

''کیا تجھے معلوم ہے کہ..... تجوری توڑی نہیں گئی تھی..... دو چابیاں لگتی تھیں اس کے قفل میں..... اس کے بعد اندر کے قفل کے عدد ملانے ضروری تھے۔ یہ کام تو نے نہیں کیا تو پھر کیا کسی جنات نے کیا؟''

''مجھے کیا معلوم ابا جی!'' حفاظت نے جواب دیا۔ ''مجھے کچھ خبر نہیں۔''

''ہاں اور کسے معلوم ہوگا؟'' وہ فکرمندی سے کہنے لگے۔ چابیاں تو ہمارے پاس ہی رہتی تھیں اور میں انہیں ایک لمحے کے لیے کہیں اور نہیں رکھتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ پھر تجوری کو چابیاں لگا کر کس نے کھول لیا تھا اور پھر اسے عدد کا کیسے پتا چلا؟ کیا یہ

حیرت کی بات نہیں..... میرے سوا کوئی جانتا بھی نہیں تھا اور نہ میں نے کسی کو بتایا تھا۔"

"اب آپ اس ذکر کو چھوڑیں۔" حفاظت کو وہ قفل ساز یاد آ گیا جو جمیل عرف شاہد کے گھر سے نکلا تھا۔

"لو جب تک یہ معمہ حل نہیں ہوتا کیا ہم اس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیں، پتا ہے جب ہمیں رقم کی ضرورت پڑی تو اس میں تین لاکھ کیا تین روپے بھی نہیں تھے۔ اس میں نہ صرف جھاڑ و پھیر دی گئی تھی اور بند بھی تھی..... کیا یہ کام جنات کر سکتے ہیں؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں حفاظت؟"

اس جن کا نام شاہد تھا مگر وہ اسے جمیل سمجھتا تھا۔ حفاظت نے دکھ سے سوچا۔ چابی اس کی مٹھی میں تھی۔ حفاظت کو یاد تھا۔

"اس میں کل کتنی رقم تھی آپ کو یاد ہے؟" حفاظت نے پوچھا۔

"یہ ہم کیوں بتائیں کہ اس میں دس لاکھ سے بھی زیادہ تھے..... تمہاری تو کوئی بات نہیں..... مگر کسی اور نے سن لیا تو؟" وہ رازدارانہ لہجے میں ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں بولے۔

"آپ کو تین لاکھ کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی ابا؟"

"کسی نے ہم سے مانگے تھے۔" انہوں نے سوچ کر جواب دیا۔ "کوئی ضرورت مند تھا..... یاد نہیں آ رہا ہے۔"

حفاظت کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ نیزہ سینے میں اترتا جا رہا ہو۔ پھر اس نے پوچھا۔

"اماں کو کیا ہوا تھا.....؟ انہیں کس لیے اسپتال میں داخل کیا گیا تھا؟"

"تیری ماں کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا رے۔" وہ ہنسے۔ "بس ایسے ہی وہ کبھی کبھی اس لیے روٹھ جاتی تھیں کہ ہم ان سے محبت بھری باتیں نہیں کرتے تھے۔ ناراض ہو کر میکے چلی جایا کرتی تھیں..... پھر ہم انہیں جا کر منا اور من مانیاں کر کے لے آتے تھے..... اب بھی وہ روٹھ کر میکے بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہم جا کر منا کر لے آئیں گے۔"

"جب تجوری میں تین روپے بھی نہیں تھے تو پھر تین لاکھ کا بندوبست آپ نے کیسے اور کہاں سے کیا تھا؟ اتنی بڑی رقم کس نے دی؟"

"چھوٹے.....! کیا تو نے سنا نہیں کہ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ ایک ہمارے پرانے کرم فرما ہیں شیخ عبدالرشید صاحب..... انہوں نے کہا کہ قبلہ بڑے حکیم صاحب! آپ اتنی چھوٹی رقم کے لیے کیوں متفکر ہوتے ہیں..... پریشان ہیں۔ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ درخواست نہیں حکم کریں۔"

"اس دنیا میں کوئی اتنا بے غرض نہیں ہوتا ہے؟ اس کے بدلے انہوں نے آپ سے کیا مانگا اور کہا تھا؟"

انہوں نے کہا کہ بس..... آپ ایک رسید کاغذ پر دستخط کر دیں۔

"گویا آپ نے اس خاندانی جگہ اور مطب کی فروخت کی دستاویزات پر دستخط کر دیے تھے ابا جی! آپ کو معلوم ہے کہ اس جگہ ایک کمرشل ویلیو تھی۔ اس کی قیمت چالیس لاکھ سے بھی اوپر تھی۔"

قبلہ بڑے حکیم صاحب ہنسنے لگے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہنے لگے۔

"میاں! تم گھاس کھا گئے ہو..... پرانی چیزوں کی بھی کوئی اتنی قیمت دیتا ہے..... اور شیخ عبدالرشید صاحب نے ہم سے کہا کہ اب آپ کو یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے اصرار پر ہم اس محل میں آ گئے۔ تم دیکھ رہے ہو نا؟ یہ شالیمار اتنا بڑا باغ ہے..... اور یہ خادم، کنیزیں۔" انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر با آواز بلند کہا۔

"ارے کوئی ہے؟ جلدی سے ہمارا حقہ تازہ کر کے لاؤ۔"

حفاظت کو ان کے پاس مزید ٹھہرنا لاحاصل

لگا۔ انہوں نے دیوانگی میں اپنا ایک جہاں سب سے الگ بسایا تھا۔ ہوش اور شعور کی دنیا سے انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق کچھ لے لیا تھا تو کچھ چھوڑ دیا تھا۔ ہر یاد جو باعث آزار تھی، حافظے سے محو کر دی تھی اور جو یاد رہا اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ مثلاً حفاظت یاد تھا۔ یہ انہوں نے بھول جانا بہتر سمجھا کہ وہ اس سے تھانے میں کیوں ملے تھے؟ بیوی کی موت ان کے حافظے سے غائب ہو گئی تھی مگر وہ وقت یاد تھا جب بیوی روٹھ کر میکے چلی جاتی تھی۔ یہ سب ایسا تھا جیسے زندگی کے ورق کی تحریر کو انہوں نے جہاں سے چاہا مٹا دیا۔ کیوں کہ وہ تلخ حقیقت تھی اور جو چاہا چھوڑ دیا۔ کیوں کہ وہ کوئی حسین یاد تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے کوئی طبی اصطلاح استعمال کی تھی اور حفاظت کو بتایا تھا کہ اپنی بقیہ زندگی وہ دل کو خوش رکھ کر گزاریں گے جو بہر حال مختصر تھی۔ ان کی شفایابی کسی بھی علاج اور دوا سے ممکن نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ خود ایسا نہیں چاہتے تھے۔

آج جمعرات تھی۔ وہ شام کو قبرستان گیا۔ ماں کی قبر پر پھول ڈالے اور اگربتیاں سلگا کر فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ دکھ سے زیادہ احساس جرم کا بار لیے لوٹ آیا۔ پھر وہ اسپتال گیا جہاں نفسیاتی مریضوں کے وارڈ میں رانی کے جسمانی دکھوں کا علاج کیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ جسمانی اور جنسی تشدد کے زخم مندمل ہو تو جائیں گے لیکن رانی شاید واپس ایک نارمل زندگی کی طرف پلٹ کر نہ جا سکے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اگر اسے ایک محفوظ، آرام دہ اور باعزت زندگی میسر ہو۔ لیکن یہ سب رانی کے نصیب میں کہاں تھا۔ اس کا تو دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا تھا۔ دشمنوں کے سوا شاہ جی صاحب کو عالم فانی سے حیات جاودانی کی جانب روانہ کر دیا گیا تھا۔ اور اپنی دنیا میں لوٹ گئے تھے۔ وہ رانی یا چھوٹے حکیم صاحب سب کو بھول چکے تھے۔ انہیں صرف یہ یاد تھا کہ قانونی معاملات سے نمٹنے کے بعد باہر ان کے اکاؤنٹ میں کتنی رقم منتقل ہو گی۔

ملک صاحب میں اتنی مروت تھی کہ انہوں نے اپنی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہائش کے لیے حفاظت کو جگہ فراہم کر دی تھی۔ ان کے کہنے پر حفاظت نے ملک صاحب کے دوست شاہ جی صاحب کا راز داری سے علاج کیا تھا جس سے ان کی مردانہ کمزوری دور ہو گئی تھی۔ بہت فائدہ ہوتا گیا تھا لیکن پھر اس جرم کی سزا بھی بھگتی تھی۔ حفاظت کو طلب کرنے پر چائے کھانا..... مل جاتا تھا۔ دن میں وہ شہر کی سڑکوں اور بازاروں گزرتے لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں اسے اپنا دوست جمیل نظر آ جائے جو درحقیقت شاہد تھا، ظاہر ہے اس نے اپنے بارے میں جو بھی بتایا تھا محض جھوٹ تھا۔ غلط بیانی کی تھی۔ عقل سے پیدل اور دنیاوی سمجھ بوجھ سے عاری چھوٹے حکیم صاحب نے دوستی کے چکر میں اسے اپنا ہر بھید دے دیا تھا اور حفاظت نے اعتماد کے دھوکے میں اس کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہا تھا۔ صرف خالدہ اور رانی کی مہربانی اور فیاضی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ ذرا بھی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتا تو آج کم سے کم ایک گھر اس کا تو ہوتا جہاں اسے عزت بھی ملتی اور محبت بھی..... اس کے کہنے پر حفاظت نے زیب النساء کو ایک ایسے کام پر آمادہ کیا جو وہ ہرگز کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک تو وہ پرانے وقتوں کی لڑکی جو حفاظت کو مجازی خدا کا درجہ دیتی تھی اور اس کی کسی بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی قائل ہی نہ تھی۔ پھر حفاظت نے اس کی آنکھوں پر پڑے محبت کے پردے پر دوسرا پردہ مستقبل کے فلمی خوابوں کا ڈال دیا تھا۔ اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر وہ سب کہہ دیا جو شرافت نے کہا تھا۔ اس نے یہ بات کس طرح سے نکالی یہ اس کا دل یا خدا جانتا تھا۔

زیب النساء کا یہ اعلان کہ وہ ہرگز ہرگز اس فراڈ جاہل اور احمق چھوٹے حکیم صاحب سے شادی نہیں کرے گی۔ بے وقوفی میں آنکھیں بند کر کے پھینکا گیا دسواں بم کا دھماکا ثابت ہوا۔ پہلے اس کے ماں باپ کو یقین نہ آیا اور جب مجبوراً انہوں نے اس کا ذکر انتہائی رنج اور دکھ کے ساتھ قبلہ بڑے حکیم

صاحب کے گھر میں کیا تو رشتوں کی عمارت صرف ایک ملبہ رہ گئی۔ حفاظت کی ماں نے خوب صورت جوان ہونہار، لاکھوں میں ایک بیٹے کی ماں بن کر اپنی بہن کو اور ان کی آوارہ، بدچلن اور بے حیا بیٹی کو ایسی کھری کھری سنائیں کہ منگنی کیا آپس کا تعلق بھی ختم ہوگیا اور وہ، وہ بہنیں نہیں ایک دوسرے کی جانی دشمن بن گئیں۔ خون کی پیاسی۔

اس وقت جمیل نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ۔ ''دیکھا ہمارا نسخہ چھوٹے حکیم صاحب! آپ کو زیب النساء سے شفا ہوگئی۔ جیسے یہ عرق النساء جیسی کوئی بیماری تھی۔'' تو درحقیقت اس نے ان دونوں کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ دکھ اٹھانا اور پچھتانا زیب النساء کی تقدیر ہوگیا تھا۔ اس نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔ وہ کیسے بتاتی کہ اس نے یہ شرافت کے کہنے پر اس کی محبت میں یہ قدم اٹھایا اور عمل کیا تھا اور کون اس کی بات پر یقین کرتا؟ نہ وہ حفاظت سے پوچھ سکتی تھی کہ آخر تم نے زہر کا یہ پیالہ مجھے کیوں دیا تھا۔ اپنی زندگی میں تم زہر گھول ہی چکے تھے۔

بالآخر نہ چاہتے ہوئے ایک دن بسنت روڈ کے اس گھر کی سیڑھیاں چڑھ گیا جہاں سے اس کی خانہ خرابی کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عورت مجھے گی کہ چوں کہ حفاظت نے اسے جس حالت میں دیکھا تھا وہ اسے مقناطیسی طور پر کھینچ لائی ہے تاکہ اس پر مہربان ہو کر فیاضی سے پیش آئے۔ حفاظت نے سوچ لیا تھا کہ خالہ نے اس پر مہربان ہونا چاہا تو وہ اسے ہر طرح سے خوش کردے گا تاکہ اس کا مقصد حل ہوسکے۔ اس کے سوا کوئی چارہ اور صورت اسے دکھائی نہ دیتی تھی۔ دروازہ خود اس عورت نے کھولا جسے جمیل نے خالہ کہہ کر متعارف کرایا تھا۔ وہ اس وقت ململ کے کرتے میں ملبوس تھی جس نے بے پردہ سا کردیا تھا۔ وہ بے ترتیب اور شکن آلود ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کوئی آلودہ کر کے گیا یا پھر اندر موجود ہے۔ اس کے بال بھی بے ترتیب ہو رہے تھے اور چہرے پر سرخ نشانات تھے۔ اس کا خیال تھا کہ خالہ اسے خود پردگی اور مستی بھری نظروں سے گھورے گی اور اندر آنے کے لیے کہے گی۔ اسی کے برخلاف وہ اسے اجنبی اور زہریلی نگاہوں سے گھور کر زہر خند بولی۔

''کیا بات ہے؟ کس سے ملنا ہے؟ کون ہو تم.....؟''

''دیکھیے..... مجھے جمیل کے بارے میں پوچھنا تھا جس کا نام شاہد ہے؟''

''میں نہ تو کسی جمیل کو جانتی ہوں اور نہ کسی شاہد کو۔'' وہ دروازہ بند کرنے لگی۔

''دیکھو.....'' برق سرعت سے حفاظت نے اپنا پاؤں بیچ میں اڑا دیا۔ ''اس دغاباز انسان نے مجھے اور میرے گھر کو تباہ کردیا۔''

''یہ کیا بدمعاشی ہے؟'' وہ برہمی سے بولی۔

''میں نے کہہ دیا میں اسے نہیں جانتی..... کیا تم میری عزت لوٹنے آئے ہو؟''

''یہ جھوٹ اور بہانہ نہیں چلے گا۔'' حفاظت نے عاجزی سے کہا۔ ''تم اسے اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہارے اس سے تعلقات بھی رہے ہیں۔''

''پیر ہٹاؤ.....'' وہ تڑخ کر بولی۔ ''ورنہ میں شور مچادوں گی اور محلے والوں کو اکٹھا کرلوں گی۔''

''ضرور مچا دو۔'' حفاظت کو بھی تاؤ آ گیا۔ ''میں بھی محلے والوں کو بتا دوں گا تمہارے شیدے سے تعلقات ہیں۔ میں نے تم دونوں کو کس حالت میں دیکھا تھا..... نہ صرف تم بلکہ تمہاری بیٹیاں بھی آبرو باختہ اور.....''

اچانک اس عورت نے دروازہ کھول کر حفاظت کو دھکا دیا۔ حفاظت اس حملے کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ توازن قائم نہ رکھ سکا مگر پیچھے سیڑھیاں تھیں۔ وہ پیچھے کی طرف گرا اور لڑھکتا ہوا آخر زینے تک گیا۔ چوٹیں اس کے جسم کے ہر حصے پر لگی تھیں مگر سر کی چوٹ نے اسے بے سدھ کردیا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر کتنی دیر پڑا رہا۔ اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ ہوش آنے پر اس نے

اپنے گرد لوگوں کو دیکھا جو اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کون ہے؟ اوپر سے خالہ کی ہنریانی انداز سے چلانے کی آواز آ رہی تھی۔

''یہ بدمعاش زبردستی گھر میں اس لیے گھسنا چاہتا تھا کہ میں اکیلی ہوں۔''

حفاظت نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی کہ وہ ایک شخص کو تلاش کر رہا تھا جس نے اسے یہی پتا دیا تھا۔ اس کی صفائی اور عاجزی سے زیادہ ملک صاحب کے حوالے نے حفاظت کو بچالیا ورنہ کچھ لوگ اسے پولیس کے حوالے کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے حفاظت کے ساتھ غیر شریفانہ رویہ کافی سمجھا کیوں کہ پولیس کے چکر میں وہ خود بھی پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید وہ جانتے ہوں گے کہ الزام عائد کرنے والی عورت اتنی شریف اور سچی نہیں ہے۔ وہ اور اس کی لڑکیاں مشتبہ قسم کی ہیں۔ انہوں نے گالیاں اور دھمکیاں دے کر حفاظت کو چلتا کیا..... جب وہ محلے سے باہر آیا تو اسے یاد آیا کہ جب عورت نے اسے دھکا دیا تھا تو اس کی نظر کمرے میں لحظہ بھر کے لیے گئی تھی تو اس نے دیکھا کہ ایک اٹھارہ برس کا دراز قد اور وجیہ لڑکا کپڑے پہن رہا ہے۔ وہ لوگوں کو بتانا بھول گیا تھا۔

جمیل اسے ایک روز نجانے کس رو میں بتا گیا تھا کہ خالہ اس سے کرایہ نہیں لیتی بلکہ کچھ نہ کچھ رقم دیتی رہتی تھی۔ خالہ کی شرط یہ تھی کہ رات کے کسی وقت وہ جب کبھی بھی طلب کرے آ کر علی الصباح تک وقت گزاری کرے۔ وہ نوجوان، دراز قد اور خوب صورت لڑکوں کا شکار کرتی رہتی ہے۔ جب لڑکیاں اسکول کالج چلی جاتی ہیں تو محلے کے لڑکوں کو کسی نہ کسی بہانے شکار کرلیتی ہے۔ اگلے کئی دن حفاظت نے لاہور پریس کلب کے چکر لگائے جہاں سے اسے جمیل یا شاہد کا کوئی سراغ ملنے کی توقع تھی لیکن مایوسی کے سوا اسے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ ان کا تفتیشی انداز شکوک پیدا کرتا تھا اور وہ لوگ لاعلمی کا اظہار کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ اس نے پریس کلب پر چند لڑکیوں سے بھی رابطے کیے جن کے بارے میں شاہد نے دعوے کیے تھے کہ وہ سب اس پر مرمٹی ہیں۔ بری طرح فریفتہ ہیں اور اس کی ہر بات، ہر خواہش اور آرزو پوری کرنے تیار ہیں اور اسے بلاتی ہیں کہ وہ پاکستان چھوڑ کر برطانیہ امریکہ آجائے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ شاہد سے واقف تھی نہ جمیل سے..... معلوم نہیں وہ اسے کس نام سے جانتی تھیں۔ خود حفاظت نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ جمیل نے جو فیس بک اکاؤنٹ کھولا ہے۔ اس پر کیا نام ہے اور تصویر کس کی ہے۔ پاس ورڈ جاننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ کسی چہرے اور نام رکھتا ہو اور اس نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا تو اس میں صوفیہ کی طرف سے موصول ہونے والے ای میل میں شکایات کے طومار تھے اور اس کی ارسال کردہ درجنوں تصاویر تھیں..... کچھ تصاویر اس کے نرسنگ ہوم اور اس کے گھر کی تھیں۔ چند میں وہ نرسنگ ہوم کی یونی فارم پہنے کام کر رہی تھی..... کچن میں بیڈ روم میں کالے رنگ کی جان دار نائٹی میں اس کا گورا بدن اور نشیب و فراز اس طرح چھلک رہا تھا جیسے کانچ کی صاف و شفاف صراحی میں شراب چھلکتی ہو..... ایک کسی ساحل پر وہ مختصر سی بیراکی کے لباس میں جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا..... اس نے شلوار قمیص بھی پہن رکھی تھی.....

حفاظت کو ان تصاویر نے مسحور کر دیا..... اس کے پرشباب گداز بدن سے زیادہ اس کی ادائے حسن کی معصومیت اور مشرقی انداز حفاظت کو بھا گئے۔ اس کا گھر امیر کی معیار سے عام تھا، پاکستان کے حساب سے پرتعیش طور پر آراستہ..... اس کی کار بھی وہ تھی جو یہاں صرف امرا کے پاس نظر آتی تھی۔

ای میل میں اس نے شکوہ کیا تھا کہ آج چار دن ہوگئے۔ آج آٹھواں دن ہے..... آج دوسرا ہفتہ ختم ہو رہا ہے۔ آخر وہ ہے کہاں کہ نہ نظر آتا ہے اور نہ ہی جواب دیتا ہے..... بقول شاعر یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک..... مگر ایسی بھی کیا بے رخی کہ سلام تک نہ پہنچے..... اس نے بتایا اب وہ اکثر اس کے بارے میں بھی سوچتی ہے۔ وہ حفاظت سے اتنی

متاثر ہو گئی ہے کہ اسے محبت ہو جانے کا ڈر ہے۔ جب وہ رات سونے کے لیے بستر پر دراز ہوتی ہے تو وہ چشم تصور میں خود کو اس کی آغوش میں پاتی ہے...... اپنے رخساروں پر اس کے سانسوں کی تپش جھلساتی اور اس کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں پیوست پاتی ہے اور پھر گلے سے نیچے اتر آتے ہیں ...... پھر بہکتے ہاتھ اس کے وجود کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر قابو میں کر کے بے بس کر دیتے ہیں تو میں ان جانی کیفیت کی لذتیت سے سرشار ہونے لگتی ہے۔ پھر مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ تصور نہیں ایک حقیقت ہے۔ پھر مجھے تمہاری طلب اور قرب ماہی بے آب کی طرح تڑپانے لگتی ہے اور اکثر میں سوچتی ہوں کہ کسی طرح حفاظت اس کے پاس امریکا پہنچ جائے تو کتنا اچھا ہو، محبت جو غیر محسوس انداز سے پروان چڑھ رہی ہے وہ منزل کے بعد صوفیہ کی باتیں اسے یوں لگیں جیسے کوئی جلے ہوئے پر برف سے ٹکور کرے ...... جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادنسیم ...... اس نے دل کے درد کو مٹانے والے سکون سے حوصلہ پایا جیسے یہ کوئی امرت جان تھا جس نے زخموں کو مندمل کر کے درد ختم کر دیا ہو۔

اس نے صوفیہ کو جواب میں غیر حاضری کا سبب اپنی معروفیت کو بتایا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پریشانی کے اس دور میں میں بھی کسی لمحہ وہ اس کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ وہ بھی رات جب سونے کے لیے دراز ہوتا ہے اسے تصور میں اور بستر میں ساتھ دیکھتا ہے۔ چوم رہا ہوتا ہے۔ لیکن حفاظت میں ہمت نہ تھی کہ اسے حقیقت سے آگاہ کر سکے۔ اس نے وہ جواب آں غزل ...... اپنی بے چینی اور بے قراری کا بیان بڑھ چڑھ کر کیا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ دونوں طرف سے آگے برابر لگی ہوئی ہے...... اور یہ محبت ہی تو ہے۔ صوفیہ نے کہا کہ جب بھی تم سے ملاقات ہو گی تو میرے دل اور جذبات پر قابو نہ رہے گا۔ ایئرپورٹ کے لاؤنج میں ہی تمہیں چوم لوں گی ...... بوس و کنار عام سی بات ہے۔ معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ اسے محبت سمجھا جاتا ہے...... والدین بھی نہ ٹوکتے اور برا مناتے ہیں جب کوئی ان کی بیٹی کو چومتا ہے۔ بور بازی بھی تو ماں باپ بھی اپنے بچوں کی سامنے کرتے ہیں...... دل کو خوش رکھنے کا یہ کھیل اسے اچھا لگا...... نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی ...... اس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے صوفیہ کو اپنا موبائل فون نمبر میں دے دیا کہ وہ مناسب سمجھے تو نیٹ کی دنیا سے نکل کر براہ راست رابطہ کرے۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے اور قریب رہیں گے۔

اسی روز آدھی شب کا وقت تھا کہ حفاظت کے موبائل کی گھنٹی گنگنائی۔

اس نے اک دم سے نیند سے نکال کر تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا۔ اسے اسکرین پر ایک عجیب نمبر نظر آیا۔ اس کے ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز دبے دبے لہجے میں کہا۔

"ہیلو...... ڈاکٹر حفاظت حسین!"

"صوفیہ ......!" آواز پہچان کر اک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ تم ہو؟"

"پھر کیسے یقین آئے گا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی۔

"کیا میں خود فون سے نکل کر تمہاری آغوش میں آ جاؤں؟ کیا کر رہے تھے؟"

"سچ بتاؤں؟ کیا تم یقین کرو گی۔ تمہارے تصور میں کھویا تم سے باتیں کر رہا تھا۔"

"جب میری کئی ایک ہوش ربا تصویریں دیکھ لیں تو تصور کیسا؟ مجھے تو بڑی مایوسی ہوئی کہ تم نے کوئی تبصرہ ہی نہیں کیا؟ نہ اچھا نہ برا...... میں کیسی لگی؟"

"اس لیے کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہا تمہیں دیکھا تو میں سب کچھ بھول گیا۔ بس ایک خلش ہی رہی کہ ہمارے درمیان بہت فاصلہ ہے۔"

"فاصلے آپ ہی آپ مٹ جاتے ہیں ...... اگر عزم کر لیا جائے۔"

"واں یار! فقط آرزو کی بات نہیں۔" حفاظت نے شاعرانہ انداز سے کہا۔

"پھر اس نے صوفیہ کے لیے اپنی لیاقت کے مطابق ترجمہ کیا جو قدرے آسان فہم سا تھا۔"

"شاعری سے مجھے دلچسپی نہیں، میں نے سنا ہے کہ ہندوستان، پاکستان کی لڑکیاں شاعری کا بڑا ادبی ذوق رکھتی ہیں۔ بعض شاعری کے جال میں پھنس کر محبت کرنے لگتی ہیں اور محبت اور جنگ میں [illegible] ہوئے اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہیں۔ لیکن آج کی لڑکی شاعری سے نہیں جیب کے جادو میں پھنستی ہیں...... خصوصاً مغربی لڑکیاں ...... میں نے تمہیں شاید بتایا ہوا ہے کہ میں اردو سمجھ لیتی ہوں لیکن لکھ نہیں سکتی۔ پڑھنا بھی نہیں آتا۔"

"میری انگلش اتنی اچھی نہیں کہ فراوانی سے بول سکوں۔ تم نے محسوس کیا ہوگا؟" حفاظت نے وضاحت کی۔

"زبان کبھی دو افراد کے مابین کوئی مسئلہ نہیں بنتی ...... اگر وہ دل اور محبت زبان سمجھتے ہوں۔ تم مجھے اردو میں ماہر کر سکتے اور میں تمہیں انگریزوں میں ماہر کر دوں گی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم فرصت کے اوقات کیا کرتے ہو؟"

حفاظت کو ذہن پر بہت زور دینے پر بھی یاد ہی نہیں آیا کہ جمیل نے اس کے کیا مشاغل لکھے تھے۔ وہ بولا۔

"تصور میں تم سے باتیں کرتا ہوں اور خوابوں میں دیکھتا ہوں۔ دیکھنے کے علاوہ تم نے مجھے نائٹی میں ملبوس اور پیراکی کے لباس میں ملبوس جو تصویریں بھیجی ہیں۔ پرشباب گداز جسم کا سراپا ایسا جادو ہے کہ مجھے سونے نہیں دیتا ہے۔ اس نے مجھے شاعر بنا دیا ہے...... میں ان کی دل کشی اور کشش کی شاعری کرتا ہوں۔ شعر موزوں کرتا ہوں۔"

"تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم بڑے تجربہ کار کھلاڑی ہو ...... تمہیں لڑکیوں کو شیشے میں اتارنے کا فن آتا ہے۔ لڑکیاں ایسی ہی باتیں سننا پسند کرتی ہیں اور دل اور اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی ہیں۔ مگر میں ایسی لڑکی نہیں ہوں جو اپنے حسن و جمال اور جسمانی دل کشی کی تعریف سن کر جھولی میں پکے پھل کی طرح ٹپک پڑوں ...... اگر ایسی ہوتی جانے کتنے بھونرا صفت میرا کسی کلی پھول کی طرح رس چوس چوس کر مجھے بے رس کر چکے ہوتے۔"

"اپنے مشاغل میں نے فیس بک میں لکھے تھے لیکن حقیقت اب وہی ہے جو میں نے تم سے بیان کی...... تم یقین کرو یا نہ کرو۔ آج تک میری زندگی میں کوئی لڑکی یا عورت نہیں آئی نہ ہی میں نے کسی رس بھرے ہونٹوں کی مٹھاس اپنے ہونٹوں میں جذب کی ہے اور نہ ہی اس کے تن کا لمس میرے وجود میں رچا ہو۔ نہ ہی میں نے اسے بے لباس دیکھا ہو۔ انٹرنیٹ پر پرستان کی سیر ہو جاتی ہے۔ لندن کے مضافات میں جو درجن آئی لینڈ ہے اس کی سیر کی ہے ...... جہاں ہر عمر کی لڑکیاں لڑکے، مرد اور عورتیں حیوانوں کی طرح باہم پیوست نظر آئے۔ یوں تو کئی لڑکیوں نے میری طرف پیش قدمی کی تاکہ مشروط مہربان ہو جائیں۔ لیکن میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔ چوں کہ تمہارے حسن و شباب کے گداز پن نے مجھ پر جادو کر دیا جس کے سامنے کالا جادو بھی بے اثر ہے اس لیے صرف تمہارے خواب دیکھتا ہوں۔"

"میرا جادو...... کیا میں کوئی جادوگرنی ہوں جس نے تمہیں اپنا اسیر بنا لیا۔"

"تمہارا پرشباب بدن کا گداز اور حشر سامانیاں کیا جادو نہیں ہیں......؟"

"تم نے جو مجھے نائٹی میں اور پیراکی کے مختصر لباس میں دیکھا تو گھائل ہو گئے اور ہر وقت ان کے حصول کا سپنا دیکھتے رہتے ہو نا۔" وہ کھل کھلا کر ہنسی۔

"اگر ایسے ہی تمہارے جذبات ہیں تو پھر بتاؤ مجھے کہ خیالوں کی دنیا میں کب تک رہو گے اور تصور میں تم مجھے اپنی آغوش میں دیکھتے رہو گے؟ عملی قدم کب اٹھاؤ گے میرے پاس اور تصورات کو حقیقت بنانے اور روپ دینے کے لیے؟ کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میں بھی تمہارے قرب کے لیے تڑپتی ہوں۔"

"سویٹ ہارٹ! کاش! یہ اتنا آسان ہوتا...... جتنا محبت کرنا۔"

"ٹھیک کہا تم نے ...... ایک لڑکی ہونے کے

ناتے مجھے اس سے انکار نہیں..... محبت کرنا تو شاید سب سے آسان کام ہو گیا ہے۔ محبت میں بہک جانا اب ایک روایت سی بن گئی۔ یہاں کیا، تمہارے ہاں جو لڑکیاں محبت میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ تنہائی میں جذبات کے سیلاب میں بہہ کر آلودہ ہو جاتی ہیں کہ یہ محبت کا اثر اور ثمر سمجھتی ہیں۔ اس کے بغیر محبت میں شدت پیدا نہیں ہو پاتی لیکن اس کے برعکس محبت کر کے نبھانا ان کی آزمائش میں پورا اترنا واقعی بہت ہی مشکل ہوتا ہے..... دیکھو اگر تم میں ہمت نہیں ہے تو اس تعلق کو یہیں ختم کر دو۔ کیوں کہ میں محبت نبھانے والی ہوں۔"

"پلیز! خدا کے لیے ایسا مت کہو۔" حفاظت نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں۔ اس روگ کو پالنے اور اس کا علاج تمہارے پاس نہیں تو میں کیا کروں؟ اس کے سوا چارہ نہیں..... تم میری تصویریں دیکھ کر وقت گزاری کرتے رہو گے؟" وہ تنک کر بولا۔

"میں نے مشکل ضرور کہا لیکن ناممکن نہیں..... دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہوتی ہے..... دراصل تمہیں اندازہ ہی نہیں یہاں کے مسائل کا..... پہلے صرف ایک ملک تھا جہاں کوئی پاکستانی جا نہیں سکتا تھا..... اسرائیل..... اب امریکا جانا بھی اتنا ہی مشکل بنا دیا ہے۔ اگر آپ کو وسائل کا کوئی مسئلہ نہ ہو، آپ اپنا ہوائی جہاز رکھتے ہوں..... خود اسے اڑ کر لے جا سکتے ہیں پھر بھی آسمان کی بلندی رکھنے والا پہاڑ بیچ میں حائل رہتا ہے جسے ویزا کہا جاتا ہے۔ صرف ایک مہر جو یہاں امریکی سفارت خانے کا ایک معمولی افسر لگاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اتنا بااختیار ہے کہ اس کی..... نہ..... کو امریکی صدر بھی نہیں بدل سکتا جو یہ کمینہ صدر ٹرمپ جو کسی شیطان سے کم نہیں ہے اور مسلط ہے بدل نہیں سکتا..... اس شیطان کے باوجود یہ مطلب نہیں کہ میں کوشش نہیں کروں گا۔"

"تمہاری باتوں سے مجھے مایوسی ہو رہی ہے کہ..... اگر ویزا نہ ملا..... تو پھر؟"

"پھر بھی میں ناممکن کو ممکن بناتا ہوا آؤں گا..... اگر آسان راستہ نہ ملے تو مشکل راستہ بہرحال ہے..... پرخطر اور غیر قانونی لیکن آج ارادہ کر لیا ہے تو اب کوئی میرا راستہ روک نہیں سکتی۔ کسی دنیا میں اچانک پہنچ کر تمہیں سرپرائز دے کر حیران کر دوں گا۔ بوسوں سے تمہیں نڈھال اور چور چور کر دوں گا۔"

"ایسا مت کہو..... ابھی سے میں انتظار کے عذاب اور اذیت میں مبتلا رہنا نہیں چاہتی۔ میری راتوں کی نیند غارت ہو کر رہ جائے گی۔"

"وہ تو میری پہلے سے ہی اڑی ہوئی ہے اسی لیے تمہاری تصویریں دیکھتا رہتا ہوں۔"

"وعدہ کرو کہ تم ضرور آؤ گے؟ اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

"میں کچھ بتا نہیں سکتا نہ اس کی کوئی ضمانت دے سکتا ہوں..... چند ہفتے یا چند مہینے..... یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تمہارے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا۔" حفاظت نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"میں سمجھ گئی، تمہیں اپنے معاملات سمیٹنے ہوں گے..... مثلاً پراپرٹی کا ڈسپوزل۔" یہ بتاؤ اپنے پروفیشن کا تم کیا کرو گے؟ کیا یہاں بھی وہی کام کرو گے تو اس کے لیے تمہیں نئے سرے سے لائسنس حاصل کرنا ضروری ہوگا۔"

"سچ پوچھو تو میں اس کام سے اتنا بیزار اور اکتا گیا ہوں کہ اب کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔" حفاظت نے جواب دیا۔

"او مائی گاڈ..... یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہہ دی..... کاش میرے لیے بھی ممکن ہوتا کہ میں اس اعصاب شکن کام کو چھوڑ سکوں جس میں دن رات دکھ، بیماری اور موت کے عذاب کو سہنا پڑتا ہے۔ تڑپتے، کراہتے، بیمار اور زخمی..... بچے، جوان، بوڑھے..... بہتا ہوا خون، کبھی شریانوں سے فرش پر تو کبھی بوتل سے شریانوں۔"

"اگر تمہیں موقع ملے تو تم کیا کرو گی.....؟" حفاظت نے پوچھا۔ "کیا کوئی کام تلاش کر رہی ہو؟"

"پہلے تو تم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا لہٰذا بتاؤ کہ تم کیا کرو گے؟"

"میں....." حفاظت سوچ میں پڑ گیا۔ "میرا خیال ہے کہ میں چاہوں گا کہ شہر چھوڑ کر کسی پرسکون سرسبز و شاداب علاقے میں ایک چھوٹا سا کاٹیج بنالوں..... ارد گرد پھلوں اور پھولوں کے باغات ہوں۔ پس منظر میں پہاڑ ہو۔ اس کے مقابل پہاڑی جو ہے اس کے دامن میں سبک خرام ندی رواں دواں ہو..... اور ہم دونوں ہم آغوش ہو کر کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک رہے ہوں..... فضا اتنی جذباتی اور رومانی۔"

"خدا کے لیے بس کرو..... یہ تو تم بتا رہے ہو؟ حفاظت کیسی عجیب اور اتفاق کی بات ہے کہ ایسا ہی میں سوچتی ہوں..... تم نے مجھے دبوچ رکھا ہے باہر کے حسین قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے..... ہم مل کر ٹیکساس یا فلوریڈا میں چھوٹا سا فارم ہاؤس بنا سکتے ہیں۔ وہاں ہم پھل یا سبزیاں کاشت کر سکتے ہیں..... ڈیری فارمنگ بھی کر سکتے ہیں۔ بھیڑ میں یا مرغیاں پال سکتے ہیں۔ کام کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں جتنے چاہیں مل جائیں گے۔ ہمیں اتنی آمدنی ہو سکتی ہے کہ ہم پرآسائش زندگی ٹھاٹ سے بسر کر سکیں جو پرسکون اور خوش گوار اور قدرت کے بہت نزدیک بھی میں اپنا یہ گھر اور نرسنگ ہوم بیچ دوں تو مجھے اچھی خاصی رقم مل سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ شہر کی پراپرٹی ہے۔ اس کی کاروباری ساکھ بھی اچھی ہے اور گاہک وقوع بھی..... تم جلد آنے کا سوچو میں جانے کا سوچتی ہوں۔ تمہارے ساتھ اپنے سپنوں کی دنیا میں..... کوئی رات ایسی نہیں ہوگی کہ میں تم پر فیاضی سے مہربان نہ ہو..... میں ہر طرح سے خوش کروں گی اور کسی بات سے تعرض۔" لائن اچانک کٹ گئی۔

اس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ صوفیہ خود ہی پھر اس کا نمبر ملائے گی ایسا نہیں ہوا۔ ایسا لگا جیسے اسے کسی نے دبوچ کر قابو میں کر کے بے بس کر دیا ہو۔ بقول اس کے وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جس کا بوائے فرینڈ اس سے حد سے زیادہ فری ہو۔ اس کے لیے کال بیک کرنا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ بوگس نمبر تھا۔ اس نے اخبار میں پڑھا تھا اور جمیل نے بھی بتایا ہوا تھا کہ بہت سے لوگ اپنا پرائیویٹ ایکس چینج چلاتے تھے اور بیرون ملک کالیں بک کرا کے ٹیلی فون کے محکمے کو لاکھوں کا نقصان پہنچاتے تھے۔ یہ ساری رقم ان کی جیب میں جاتی تھی۔ شاید امریکا میں بھی ماہر جعل ساز پاکستانیوں نے ایسا ہی کوئی طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔ پاکستانی جہاں کہیں جاتے اپنی نازیبا اور غیر قانونی حرکتوں سے باز نہیں آئے تھے۔ وہ راتوں کو صوفیہ کی ان تصویروں میں کھویا رہتا تھا جو نائی اور پیرا کی کے لباس میں ملبوس تھی۔ جو اس کے دودھیا، گداز اور دل کش تن پر دمکیاں لگتا تھا۔ اس کے تناسب ناگن کی طرح پھنکارتے تھے۔ انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ چوں کہ وہ دراز قد تھی۔ اس میں جو جاذبیت تھی اس نے اس کے جسمانی نشیب و فراز اور سراپا کو دیا تھا۔ یہ مختلف زاویوں کی چار عدد تصویریں تھیں..... خوب صورت جذبوں اور خوابوں کی خوشی اور سکون دیتی باتیں کر کے اس کے دکھوں کی ساری اذیت مٹ گئی تھی۔ یہ گپ شپ بالکل ہیروئن کے نشے جیسی تھی۔ بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے، صوفیہ کا حسن و شباب اور جسمانی فگر کے بارے میں اس کی سہیلی مس یونی ورس جو ہوسٹل کے کمرے میں روم میٹ تھی۔ وہ دونوں بے لباسی کی حالت میں سوتی تھیں اور ہم جنس پرست بھی تھی۔ اس کا یہ کہنا سو فیصد درست تھا کہ اگر صوفیہ عالمی مقابلہ حسن میں شریک ہو اور اشیاء قربانی کر کے آلودہ ہو جائے تو مس یونی ورس بن سکتی ہے۔ اس پر یہ صوفیہ سے غلط نہیں کہا تھا لیکن صوفیہ نے اپنی روم میٹ کی بات نہیں مانی تھی۔ یہ خود فریبی ہی سہی علاج غم بھی تو یہی تھا۔ اسے صوفیہ کا فارم ہاؤس والا آئیڈیا بے حد پسند آیا تھا۔ وہ اس پر مزید بات کرنا چاہتا تھا اس کا خیال تھا کہ وہاں پہنچنے پر دونوں میاں

بیوی کی طرح رہنے لگیں گی۔

’’خاصی دیر گزر جانے کے باوجود کال پھر بھی نہ آئی۔ وہ ساری رات ملک صاحب کی کوٹھی کے آخری حصے میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹر کی کوٹھری میں اندھیرے کی آغوش میں سونے کی کوشش کرتا رہا۔ جاگتا رہا۔ یہ کوارٹر نہ جانے کب سے خالی پڑا ہوا تھا۔ اس میں ایک پرانے متروک بیڈ پلاسٹک کی ایک سال خوردہ کرسی اور ایک ٹوٹی تین ٹانگوں والی میز کے سوا کچھ نہیں تھا جس کو چوتھی کی طرف دیوار میں ٹیک لگا کر سہارا دیا ہوا تھا۔ اس میں بلب خود حفاظت نے لگایا تھا۔ اسے خود ہی خریدنا پڑا تھا۔ اس کے چند جوڑے کپڑے بیڈ کے نیچے ٹین کے صندوق میں رہتے تھے۔ پھر اس کی ڈریسنگ ٹیبل تھی جس پر وہ اپنا سیفٹی ریزر...... چھوٹا سا، آئینہ تیل اور کنگھا رکھتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کے کہنے پر حفاظت گھر جا کر شاہ جی صاحب کو نئی جوانی دینے پر آمادہ ہوگیا تھا (ہمیں تو موت ہی شباب کے بدلے) یا کسی تعلق کی بنیاد پر نہیں ملک صاحب نے اس کوٹھری میں چھوٹے حکیم صاحب کو جگہ دی تھی اس کی وجہ خود اپنی آسانی تھی۔ وہ ہر روز اس سے بلا معاوضہ مشورہ کر سکتے تھے...... احسان اپنی جگہ اب پیاسے کو کنوئیں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کنواں خود ہی پیاسے کے پاس آ گیا تھا۔‘‘

ملک صاحب کو اپنے دوست شاہ جی صاحب کی موت اور اس کے تمام حالات کا علم تھا لیکن وہ صرف نئی جوانی پیکج میں دل چسپی رکھتے تھے۔ نہ انہوں نے کبھی حفاظت سے ہم دردی کی اور نہ اس معاملے میں کسی قسم کی مدد...... کہ وہ قانونی معاملات میں کچھ کر سکتے تھے۔ یہ بات انہوں نے بڑی بے رخی سے کہہ دی تھی۔ جمیل کی دھوکے بازی سے حفاظت کو قتل میں ملوث کرانے، چوری، ڈکیتی سے لے کر قبلہ بڑے حکیم کی ساری جائداد ہتھیانے تک تمام معاملات قانونی ہی تو تھے۔ یہی غنیمت تھا کہ اسے سر چھپانے کا ایک ٹھکانہ ملا ہوا تھا۔ آگے جو کچھ بھی کرنا تھا حفاظت کو خود ہی کرنا تھا۔ زبردستی شاہ جی صاحب کے قتل میں اسے گرفتار کرانے ...... تھانے میں اس کی ذلت، رسوائی، اس کی موت اور باپ کی دیوانگی ...... اس ایک شخص نے کیا تھا جسے وہ اپنا دوست سمجھتا تھا۔ اس کی اپنی ایک غلطی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اذیت ورسوائی کے جہنم میں جھونک دیا تھا۔

وہ یہاں اس کوٹھری میں پڑا امریکا میں صوفیہ کے ساتھ فارم ہاؤس بنانے کی باتیں کرتا۔ اس کی تصویروں میں ڈوب جاتا۔ تصویر میں اسے چومتا اور ان جانے راستے پر دور چلا جاتا جس سے اس کا ٹینشن کم ہو جاتا۔ ایک رسی بھی نہ تھی جس سے وہ خود کو پھانسی لگا لے...... وہ چاند پر کمند ڈالنے کی سوچتا تھا۔ اصولاً تو اسے بھی باپ کے ساتھ پاگل خانے میں بند ہو جانا چاہیے تھا لیکن حالات کی طرح دماغ پر بھی اس کا قابو نہیں رہا تھا۔

معمول کے مطابق چوکی دار نے صبح اسے چائے پراٹھا لا کر دیا۔ جسے کھانے کے بعد وہ اپنی بے مقصد تلاش کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ اسے جمیل کی تلاش تھی لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ جمیل مل گیا تو وہ اس سے کیا کہے گا...... پوچھے گا کہ آخر اس نے حفاظت کی ساتھ دوستی کی آڑ میں دشمنی کیوں کی؟ وہ تو حفاظت کو پہچاننے سے انکار کر دے گا۔ تو وہ اس کا کیا بگاڑے گا؟ جمیل ایک شاطر، چال باز اور مکار شخص جو ہے۔

وہ گلی سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک مکان کا دروازہ جو بھڑا ہوا تھا۔ طوفانی ہوا کے جھونکے سے کھلا تو اس کا صحن اور سامنے کا کمرا نظر آیا جس کے کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اس نے دیکھا ایک جوڑے کو چارپائی پر ہم آغوش تھا۔ وہ چوں کہ یہ منظر دیکھنا نہیں چاہتا اک دم سے آگے بڑھ گیا۔ یہ منظور وہی تھا جو خالہ اور شیدے کا تھا۔ اک دم سے ایک خیال کوندا بن کر اس کے ذہن میں لپکا۔ اس کی خاندانی رہائش گاہ اور مطب کی جگہ کا سودا اس نے تین لاکھ میں کیا تھا۔ جمیل یا شاہد اسے جانتا تھا اور وہ شاہد کو...... وہ اس علاقے کا چھٹا ہوا خطرناک بدمعاش تھا۔ اس سے نہ

[illegible] محلے کے بھی لوگ ہی نہیں ڈرتے تھے بلکہ پولیس بھی ...... اسے کسی ایس پی کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہ ان کی ہر طرح کی سیوا کرتا تھا۔ کیا ہوگا اگر وہ اس کے سامنے جا کر روئے پیٹے، گڑگڑائے اور اس کے قدموں میں کتے کی طرح لوٹنے لگے؟ وہ اسے [illegible] اس کو گولی تو نہیں مار دے گا...... خنجر تو نہیں جھونک دے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اسے گالیاں دے کر اور دھکے دے کر نکال دے گا۔ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ پھر بھی ایک فیصد اس بات کا یقین کہ اسے رحم آجائے۔ وہ پولیس نہیں ایک بدمعاش ہے لیکن پولیس کے مقابلے میں بدمعاش لاکھ درجے بہتر ہوتا ہے۔ شاید اسے رحم بھی تو آ سکتا ہے؟ وہ چھوٹے حکیم صاحب کے لیے کچھ کردے۔ ظلم اور ناانصافی کے خلاف قانون کے آسرے پر رہنا خود کو تباہی کے غار کی جگہ بربادی کے اندھے کنویں میں دھکیلنا ہوگا۔ نہ کوئی اسے حق دلوا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اسے حق دلوا سکتا ہے اور نہ غاصبوں کو سزا ...... کسی کو سزا دلوا کر اسے کیا ملے گا؟ لیکن شیدے پہلوان کو ترس آ جائے تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ آبائی جاگیر تو واپس ملنے کی توقع رکھنا دیوانگی ہے۔ وہ تو خواب میں بھی نہیں مل سکتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ رقم اور کسی نہ کسی طرح دلوا دے۔ شیدا پہلوان کسی جگہ چھوٹے حکیم صاحب کو مطب کرا دے اور کوئی جگہ دلوا دے۔ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی کرن بن سکتا تھا۔

اس امید نے حفاظت کو اس حد تک قائل اور متاثر کیا کہ وہ لکشمی چوک سے بیڈن روڈ تک شیدے پہلوان کو اس طرح پوچھتا گیا جیسے کولمبس امریکہ دریافت کرنے نکلا تو پوچھتا گیا تھا۔ دکاندار اسے [illegible] نظروں سے دیکھتے تھے۔ یا تو ٹال دیتے تھے کہ ہم نہیں جانتے یا لاعلمی کا اظہار کر کے جان چھڑا لیتے [illegible] کیا معلوم اسی وقت وہ کہاں نہ ملے۔ ایک دو [illegible] میں معنی خیز لہجے میں کہا کہ شاید کسی بیوہ یا [illegible] کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوگا۔ یا کسی جوئے کے اڈے پر تال وصول کر رہا ہوگا۔ بالآخر وہ بیڈن روڈ پر امرتسری حلوائی کی کسی پر پہنچا۔ لسی پینے کے بعد اس نے چوکی پر اہرام مصر کی طرح رکھے ہوئے کسی لسی بنانے والے پہلوان سے بھی سوال کیا تو اس کا سدھائی کو خود کار مشین کی طرح رڑکنے والا ہاتھ رک گیا۔

’’تو کیوں پوچھ رہا ہے شیدے استاد کو؟ اس سے کیا کام آن پڑا؟‘‘ اس نے حفاظت کو گھور کر دیکھا۔

’’کام انہی کا ہے۔‘‘ حفاظت نے مبالغہ سے کام لیا۔ ’’آپ کی بڑی مہربانی مجھے ان کے پاس پہنچا دیں۔‘‘ اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

پہلوان نے ایک موبائل فون پر کوئی نمبر ملا کر رابطہ کیا اور کہا۔

’’کوئی نوجوان ہے یار! اپنا نام حفاظت حسین بتاتا ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے۔‘‘

پھر اس نے رابطہ منقطع کر کے ادھر لسی رڑکنے میں مصروف ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد کہا۔

’’بیٹھ جا ادھر...... منڈا آئے گا تو اس کی ساتھ چلے جانا۔‘‘

اسے صرف دس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ پھر ایک نوجون آیا اور اسے بائیک پر بٹھا کر لے گیا۔ پرانے لاہور کی تنگ اور گندی گلیوں میں آتے جاتے لوگوں کی پروا کیے بغیر موٹر سائیکل کا ایک ہی رفتار سے دوڑانے کا مظاہرہ نہ صرف مہارت تھی بلکہ کارنامہ بھی تھا۔ موٹر سائیکل نے کسی کو چھوا بھی نہیں مگر دیوار سے لگ جانے والوں کی گالیاں اس نوجوان کے لیے باعث مسرت ہو رہی تھیں۔ تندی باد مخالف نہ گھبرا اسے عقاب! یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے۔ عقاب ہارن دے کر ایک دروازے سے بھی گزر گیا اور صحن میں جا کر رکا۔

چند لمحوں کے بعد وہ شیدے استاد کے سامنے مودبانہ اور عاجزی، انکساری اور غم کا پیکر بنا بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ نظارہ گھوم گیا جو اس نے

خالہ کے ہاں خالہ کے ساتھ باہم پیوست دیکھا تھا۔ اگر خالہ نے اسے بچایا نہ ہوتا تو شاید کئی دنوں تک اسپتال میں زیرِعلاج رہ جاتا۔ وہ اس کی بدکاری کا چشم دید گواہ تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اس کے باوجود وہ اس سے ملنے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اسے یہ خوف بھی دامن گیر ہوا تھا کہ کہیں وہ اس واقعہ پر اس کی درگت نہ بنا دے۔ اس کا خیال خام نکلا۔ جس کا اندیشہ تھا وہ نہ ہوا۔ وہ فرش کے قالین پر گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر چہرے پر ایسے تاثرات نہیں ابھرے تھے جس پر حیرت ہو۔ ایک نوجوان اور تندرست اور کسرتی جسم کا لڑکا اس کے ہاتھ پیر دبا رہا تھا۔ استاد تین من گوشت کا تھل تھل کرتا ڈھیر تھا اور اس کے چہرے پر ایک قدرتی بچوں جیسی معصومیت تھی جو مصنوعی لگتی تھی۔ حفاظت کو نجانے کیوں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ خالہ نے ہم آغوشی میں منوں وزن کیسے برداشت کرلیا اور کرتی آ رہی تھی۔ کیوں کہ خالہ کے اس سے تعلقات جانے کب سے چلے آ رہے تھے۔ نشاط انگیز لمحات میں عورت مرد کا بوجھ اٹھا لیتی ہے۔

”ہاں بھئی...... تو کیوں ملنا چاہتا تھا مجھ سے...... چل بیٹھ ادھر۔“

”استاد!“ حفاظت نے کہا۔ ”میں حفاظت حسین ہوں۔ چھوٹے حکیم صاحب کے نام سے مشہور ہوں۔“

”ہاں پتا ہے تیری وجہ شہرت کا...... اپنی مشہوری کے لیے اشتہار خود دیواروں پر لکھتا ہے...... کام بتا کام۔“

”استاد! ایک تو مجھے جمیل کا پتا چاہیے...... وہ شاہد نام کا بھی ہے...... مجھے اس سے ملنا ہے۔“

”وہ تو اب تجھے میدان حشر ہی میں ملے گا...... اس کا قتل ہوگیا ہے۔“

”حفاظت کو دکھ تو نہیں ہوا مگر برقی جھٹکا لگا۔ کیسے؟ میرا مطلب ہے کب؟“

”وہ تیرے ... والا صوفی نہیں تھا جہاں وہ تجھے لے جاتا تھا۔ شاید صوفی سے اس کا کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا۔“

”استاد!“ حفاظت اتنا کہہ کر کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے دل بھر آ رہا تھا۔ ”میرے ساتھ بڑا ظلم ہوا...... پولیس نے مجھے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کرکے مجھ پر کیا کیا تشدد نہیں کیا۔ اذیت نہیں پہنچائی اور ایذا رسانی نہیں کی...... پھر میرے باپ سے تین لاکھ کی رشوت مانگی...... گھر میں ڈاکا مار کر وہ شاید سب کچھ لے جا چکا تھا...... میرے باپ کو مجھے چھڑوانے کے لیے وہ جگہ کوڑیوں کے مول اسے بیچنی پڑی جو ہمارا گھر تھا اور مطب بھی تھا۔“

استاد یوں سنتا رہا جیسے شاگرد رٹا ہوا سبق سنا رہا ہو۔ اس نے کان نہیں دھرے۔ بے زار سا بیٹھا رہا پھر اس نے پاؤں دبائے لڑکے کے ایک مارا۔ ”حرام خوری مت کر......“ پھر اس نے ایک گالی اگل کر حفاظت کی طرف دیکھا۔ ”تو بولتا رہ۔“

”استاد! میری ماں میرے غم میں دنیا سے چلی گئی...... اب پاگل خانے میں میرا باپ ہے۔ میرے پاس رہنے کی جگہ نہیں۔“

”اوئے چھوٹے حکیم حفاظت! اس میں میرا کیا قصور ہے جو مجھے سنا رہا ہے؟ میرے پاس کیوں آیا ہے تو...... میں نے مدد کی تھی تیرے باپ کی...... فٹافٹ تین لاکھ اپنی حفاظت پر دلوائے تھے ورنہ کوئی بڑے قبلہ حکیم کو جانتا تھا اس نے تو صرف کاغذ پر دستخط کیے تھے۔ میں درمیان میں نہ ہوتا تو اسے تین روپے بھی نہ ملتے۔“

”استاد!“ وہ لجاجت سے بولا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ وہ جگہ تین لاکھ کی نہیں چالیس لاکھ کی تھی۔“

”اوے تیس لاکھ کی نہیں تیس کروڑ کی تھی۔“ استاد نے برہمی سے کہا۔ ”ایسا کر تو تین لاکھ دے اور کاغذ لے جا، تیرے باپ نے گروی رکھی تھی ایک مہینے کے لیے...... اب تو ایک مہینے سے اوپر ہوگیا مگر چل تیرے لیے رعایت۔“

”استاد! میں تین لاکھ کہاں سے لاؤں گا...... میرے پاس تو رہنے کی بھی جگہ نہیں...... مطب بھی کھلواؤں گا تو کہاں؟ آپ کچھ انصاف سے کام لو...... آدھے پیسے تو دو مجھے تاکہ میں کچھ کرسکوں...... یہ کام کرنے کا ارادہ پہلے ہی نہیں تھا جو میرا باپ کرتا تھا...... میں تو یہ شہر ہی نہیں ملک چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ اب ہماری کوئی عزت نہیں۔“

”کہاں جانا چاہتا ہے تو؟ اور وہاں جا کر کیا کرے گا؟“

حفاظت کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

”میں نے امریکا جانے کا سوچا ہے استاد! کسی ایجنٹ کے ذریعے، اس میں آٹھ دس لاکھ لگتے ہیں۔“ استاد اسے اس طرح دیکھتا رہا جیسے اس کا بشرہ بھانپ رہا ہو۔ پھر بولا۔

”چل ٹھیک ہے اور اب پیسوں کی بات چھوڑ میں تجھے امریکا بھجوائے دیتا ہوں۔ تیرا ٹکا خرچ نہیں ہوگا۔“

”وہ کیسے استاد......!“ حفاظت کو سماعت پر اعتبار نہ آیا تو اس نے سوال کیا۔

شیدا پہلوان یا استاد گرم ہوگیا۔ اس نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔

”اوے تو پولیس یا وکیل کی طرح جرح مت کر، آئی سمجھ میرا دل نرم ہے۔ روئی جیسا تو پتھر بھی ہے۔ تیری فریاد سے رحم آ گیا تھا اس لیے ایک کام کرا دوں گا تیرا، زیادہ بولے گا تو چھتر مار کر باہر نکلوا دوں گا...... جا کر عدالت میں کیس کر دینا کہ میری تیس لاکھ کی پراپرٹی لے لی گئی ہے تین لاکھ میں۔“

اس کے ہاتھ پیر دبانے والے لڑکے نے پیچھے سے منہ پر انگلی رکھ کر حفاظت کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بنتا کام بگڑتا دیکھ کر حفاظت نے بھی مصلحت اور دور اندیشی سے کام لیا۔

”غلطی ہوگئی استاد! بس آپ مجھے امریکا بھجوا دو...... بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔“ اس کے لہجے میں عاجزی در آئی۔

”چل کل شام کو آ جانا ادھر ہی...... جہاں سے وہ لڑکا تجھے موٹر سائیکل پر لایا تھا...... اب جا اور خبردار جو یہ بات کسی اور کو بتائی۔“

حفاظت چپ چاپ شرافت سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اب کوئی موٹر سائیکل نہیں تھی۔ وہ باہر والا دروازہ کھول کر گلی میں نکلا اور اسی طرف چلنے لگا جس طرف سے موٹر سائیکل آئی تھی مگر چلتے چلتے، پوچھتے پوچھتے آدھے گھنٹے میں وہ بھاٹی گیٹ پہنچ گیا۔ وہ مایوس بھی تھا اور پرامید بھی...... وہ نہیں ہوا جو اس نے سوچا تھا...... وہ ہو رہا تھا جو اس کے خیال میں نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں انتقام کی آگ کے شعلے سرد پڑتے جا رہے تھے۔ جمیل یا شاہد کے قتل کی خبر سن کر اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے کچھ کرنے کو نہیں رہا...... ماں وہاں جا چکی تھی۔ جہاں سے واپسی نہیں آ سکتی تھی۔ باپ شاید پلیٹ فارم پر وہیں لے جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا...... اور خاندانی پیشہ جاگیر اور عزت سب بعوض تین لاکھ روپے نقد نیلام ہو چکے تھے، دیواروں پر لکھے ہوئے قبلہ بڑے حکیم صاحب کے نام والے اشتہارات بھی وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود غائب ہوتے اور مٹتے چلے جائیں گے۔ رہے نام اللہ کا۔

☆☆☆

معلوم نہیں کیسے اور کیوں کر وہ بھولے بھٹکے اس گلی میں جا نکلا جہاں خالہ رہتی تھی۔ وہ تو ایک قریبی محلے میں کسی کام سے آیا تھا۔ وہ بے دھیانی میں چلا جا رہا تھا کہ ایک مانوس نسوانی آواز نے اس کا نام لے کر آواز دی۔

”حفاظت! چھوٹے حکیم صاحب......! سنیں تو......“

وہ آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ رک گیا گلی دوپہر کے سناٹے میں ڈوبی ویران پڑی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے والے گھر کے دروازے میں خالہ کھڑی اسے ان جانی دعوت دیتی دل کش مسکراہٹ آنکھوں میں خود سپردگی لیے اسے دے رہی تھی...... وہ اس زہریلی ناگن کو کیسے بھول سکتا تھا جس نے گلی اور

محلے والوں کے سامنے ذلیل ورسوا کیا اور بری طرح تشدد کیا اور بری طرح پٹوا دیا تھا۔ وہ بغیر دوپٹے کے ایسے دبیز لباس میں کھڑی تھی اس کا بدن شراب کی طرح چمک رہا تھا۔ خالہ نے ہاتھ کے اشارے سے بڑی شیریں آواز میں کہا۔

''چھوٹے حکیم صاحب! بھئی ایسی بھی ناراضی کیا..... آیئے نا۔''

''نہیں، میں معافی چاہتا ہوں۔ میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔'' اس کے دل میں ایک خوف سا دامن گیر ہوگیا تھا کہ وہ اسے کسی بہانے سے اندر بلا کر شور مچادے گی۔ پڑوسیوں کو جمع کر کے کہے گی یہ ناگ آج پھر آ گیا ہے اسے ڈسنے کے لیے اور پھر شیدا آ گیا تو اسے شہید کر کے رکھ دے گا کہ وہ اس کی داشتہ پر ہاتھ ڈال رہا ہے..... وہ کسی مشکل سے اس کا محسن بن گیا ہے جو اسے ایک خواب سا لگتا ہے..... اس روز خالہ نے جس نفرت اور غصے سے اس کی لوگوں سے شکایت کی تھی۔ اس کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا شاید خالہ کے دل کی بھڑاس نہیں نکلی تھی۔ آج وہ اس کی کسر پوری کرنا چاہتی تھی۔

اسی سے پہلے کہ وہ سرعت سے نکل جاتا خالہ نے لپک کر اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا اور غیر محسوس انداز سے کھینچ کر گھر میں لے آئی اور دروازے بند کر کے چٹخنی لگا دی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کیوں کہ وہ جس لباس میں تھی اس نے اسے بے حجاب کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بے لباس ہے۔ جس روز اسے جمیل خالہ کے ہاں لے گیا تھا اس کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ جوان لڑکیوں کی موجودگی اور غیر مردوں کے سامنے بھی وہ بے شرم بنی ہوئی تھی۔

''آپ مجھے جانے دیں۔'' اس نے خالہ کے ہاتھ سے بازو چھڑا کر بولا۔ ''میں کام ختم کر کے آتا ہوں۔''

''جھوٹے حکیم صاحب! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ مجھے اپنے علاج کے لیے آپ سے ایک دوا لینی ہے۔''

''آپ جانتی ہوں گی اب تو ہمارا مطب بھی نہیں رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

لیکن ایسی دوا تو تجویز کر سکتے ہیں کہ بازار سے خرید لوں۔ وہ پھر اس کا ہاتھ تھام کر کمرے میں لے آئی۔

''اگر شیدا آ گیا تو وہ مجھے شہید کر کے رکھ دے گا خدا کے لیے مجھے اب جانے دیں۔'' وہ گڑبڑایا۔

''اب وہ نہیں آ رہا ہے اور نہ ہی آئے گا؟ تم پریشان اور فکر مند نہ ہو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے..... وہ تو آپ کا شیدائی ہے۔ قدر دان ہے۔''

''اب اس کا ذوق شوق بدل گیا ہے۔ اب وہ نازک اندام نوجوان لڑکوں کی طرف مائل ہے۔'' خالہ نے بتایا وہ دس بارہ دن سے نہیں آیا۔ میں نے اس سے موبائل پر بات کی تو کہتا ہے کہ اب عورتوں لڑکیوں سے دل بھر گیا ہے۔'' حفاظت کو اس کی بات کا یقین آ گیا۔ اس نے شیدا کے اڈے پر خوب صورت نوجوان لڑکوں کو دیکھا تھا۔

اس نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا۔ ''اچھا جلدی سے بتائیں کہ آپ کا مرض کیا ہے؟ لیکن اس سے پہلے یہ بتائیں کہ اس روز اس نے میرے ساتھ غیر شریفانہ سلوک کیا۔ مجھے اندر آنے نہیں دیا۔ محلے والوں کو اکٹھا کر کے کیوں پٹوایا۔''

''تم نے جو جمیل کے بارے میں سوال کیا تو مجھے غصہ آ گیا تھا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تم نے صوفی نیٹ کیفے والے کے ساتھ مل کر اسے قتل کیا تھا۔ میں سمجھی کہ شاید تم مجھ سے بدلہ لینے آئے ہو کہ وہ میرا کرایہ دار تھا..... اندر کمرے میں میری بڑی بہن تھیں۔ اگر میں تمہیں اندر لے جاتی تو وہ مشکوک ہو جاتیں۔ اس لیے میں نے غصے کا اظہار کیا تھا۔''

خالہ جھوٹ بول رہی تھی۔ اس نے خود دیکھا تھا۔ کمرے میں ایک نوجوان کپڑے پہن رہا تھا۔ اس

نے بحث کرنا فضول سمجھا۔

''اچھا اب جلدی سے مرض کے بارے میں بتائیں؟ کیا شکایت اور تکلیف ہے؟''

خالہ نے کرتا نکال کر ایک طرف پھینکا۔ اس کے قریب ہو کر اپنا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور بغل دکھاتی ہوئی بولی۔

''میں اس میں گلٹی محسوس کر رہی ہوں۔ وہ اتنا درد دیتی ہے کہ میں رات بھر سو نہیں پاتی ہوں۔''

حفاظت بھونچکا سا ہو گیا۔ دوسرے لمحے اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ خالہ کی دونوں سڈول، گداز، مرمریں اور عریاں اس کے گلے میں کسی زہریلی ناگن کی طرح لپیٹ گئیں۔ وہ اس کے چہرے پر جھکتی چلی گئی۔

وہ رات آٹھ بجے تک خالہ کے مرض کے علاج کرتا رہا۔ دھول بھرے راستے پر ان جانی منزل پر پہنچنے کے لیے خالہ نے اس کی رہنمائی کی اسرار و رموز اور اسے ایسے راستوں سے آشنا کیا جس سے وہ بے خبر تھا۔ اسے ایک ایسا ماہر کھلاڑی بنا کر طاق کر دیا تھا کہ کوئی مرد عورت اسے کبھی بھول نہیں سکتی اور اس کی ایسی دیوانی ہو جاتی کہ فراق میں تڑپ جاتی۔

خالہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ صبح تک رک جائے۔ اس کی لڑکیاں ایک سہیلی کی مایوں مہندی کی تقریب میں گئی ہوئی ہیں۔ وہ کل سہ پہر آئیں گی۔ اس کا دل ابھی بھرا نہیں۔ وہ تشنہ ہو رہی ہے۔ وہ چلا آیا۔ وہ دسترخوان سے جی بھر کے سیر ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود رات رکنے کی دعوت کو قبول کرنے کو چاہا تھا۔ کیوں کہ خالہ نے اس پر ایسا جادو کر دیا تھا۔ لیکن اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں شیدا پہلوان نہ ٹپک پڑے..... کیوں کہ خالہ کسی جادوگرنی سے کم نہیں تھی۔ اس کے جادو میں جکڑنے کے بعد کوئی مرد اپنے سابقہ لمحات تازہ کرنے آ سکتا تھا۔

☆☆☆

حفاظت نے موقع پاتے ہی اس نے صوفیہ کو سرپرائز کیا۔

''میں نے تمہارے پاس امریکا آنے کا پروگرام فائنل کر لیا ہے سویٹ ہارٹ۔''

''کاش! تم میری خوشی اور حیرانی کی چیخ سن سکتے..... تم سامنے ہوتے تو تمہارے ہونٹ چوم لیتی۔''

''تصور میں تو چوم سکتی ہو..... شاید مجھے محسوس ہو جائے۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''میں تمہارے ہونٹوں کو رخساروں اور ہونٹوں پر محسوس کر رہی ہوں۔ تم میری بات کا یقین کرو گے؟''

''اگر میں تم سے اتنا قریب تھا تو پھر تم نے فون کیوں نہیں کیا۔ میں تمہاری کال کے انتظار میں ساری رات جاگتا ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا..... تمہاری تصویریں میرا دل بہلاتی رہیں۔ تم نے فون کیوں نہیں کیا؟'' یہ لائن اچانک کٹ گئی تھی۔''

اس میں میرا کیا قصور ہے ڈارلنگ! تمہارے ملک میں کون سا ایسا نظام ہے جس میں کوئی نقص اور خرابی نہ ہو۔ مواصلاتی نظام تو انتہائی بدترین اور ناقص بھی ہے۔ میں تو رات نجانے کتنی بار کوشش کرتی رہی تھی لیکن جواب یہ ملتا تھا کہ آپ کا مطلوبہ کسی اور لائن پر مصروف ہے۔ میں سمجھی کہ شاید کسی لڑکی سے ہم آغوش ہو اور فون بند کر دیا ہو۔''

''میرا فون ایک سیکنڈ کے لیے بھی بزی نہیں ہوا تھا۔ میں تمہاری کال کے انتظار میں رات بھر جاگتا رہا۔ اگر میرے پاس تمہارا نمبر ہوتا تو میں ہر رات تم سے باتیں کرتے گزار دیتا۔ نہ خود سوتا نہ تمہیں سونے دیتا۔ ہاں میں ایک لڑکی سے ہم آغوش تھا۔ اسے ایسا نڈھال کیا کہ وہ تھکن سے چور چور ہو گئی تھی وہ لڑکی تم تھیں۔''

''پھر تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ تمہارے پاس میرا نمبر نہیں ہے۔ رات بھر جاگ کر اگلے دن کام خاک ہوتا۔ میں خود سوتی رہتی۔''

''مجھے دراصل تمہیں ایک نہایت سنسنی خیز چونکا دینے والی اطلاع دینی تھی کہ میں آ رہا ہوں؟ مجھے

یقین نہیں آتا ہنی......'' پھر صوفیہ نے درمیان میں کہا۔

''خدا کے لیے جلدی بتاؤ کب آ رہے ہو۔ میرا سینہ خوشی سے دھڑک رہا ہے۔''

''بہت جلد...... بہت جلد وہ شاہکار آ رہا ہے جس کا انتظار ہے تم نے ٹھیک کہا تھا جہاں چاہ ہے۔ وہاں راہ ہے۔ دیکھو تقدیر مہربان ہوئی ...... ایک راستہ نکل آیا۔''

''اف میری بے چینی کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں اور نہ ہی کر سکتے ہو میری دلی کیفیت کیا ہو رہی ہے میں اسے الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کتنے دن لگیں گے؟ تین دن، چار دن، ایک ہفتہ؟''

''مجھے ہنسی آ رہی ہے لیکن میں بھی کم بے قرار نہیں ہوں اس وقت کے لیے جب میں تمہیں اپنی بانہوں میں لے سکوں گا۔''

''اور میں رومانی جذباتی انداز سے خوش کر دوں گی۔ ایک طویل بوسہ ہوگا...... اور ہم ساری رات آنکھوں میں گزاریں گے۔''

''ہم پہلی فرصت میں شادی کر لیں گے کہ ازدواجی رشتہ قائم ہو جائے۔''

''اور ہمارے جو بچے ہوں گے وہ خوب صورت، پیارے پیارے گول مٹول ہوں گے۔''

''اس خوش خبری کے انعام میں تمہیں اپنی ایک خصوصی فطری حالت کی تصویر دوں گی ...... جو صرف تمہارے لیے ہوگی۔''

''اسے میں اپنے بیڈ روم میں نظر کے سامنے رکھوں گا...... پورٹریٹ سائز پر انلارج اور فراہم کر کے۔''

''تم بڑے شریر ہو ...... یہ ایسی تصویر نہیں کہ انلارج اور روم کی جائے۔'' مجھے اس تصویر سے ہی شرم آتی رہے گی۔'' اچانک بجلی چلی گئی۔ مانیٹر تاریک ہو گیا۔ اس نے پھر صوفیہ کا نمبر نہیں لیا تھا۔ وہ باہر نکلا تو اس نے نیٹ کیفے کے مالک کو چند لوگوں سے جھگڑتے دیکھا۔ وہ برہم ہو کر کہہ رہے تھے۔ جب ہر مہینے تمہیں وقت پر پیسے مل جاتے ہیں تو لائن کیوں کاٹی؟''

''باؤ جی! سمجھا کرو...... کبھی کبھی افسروں کے حکم پر کارروائی ڈالنا پڑتی ہے۔ وہ بھی مجبور ہیں ...... یہ ماں کے خصم میڈیا والے تاک میں رہتے ہیں...... ٹی وی پر رپورٹ چلا دی ہے۔''

☆☆☆

گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی جیسے زلزلہ بھی تھم گیا۔

فرش پر بیٹھے ہوئے ایک درجن سے زائد انسانوں نے ...... جو ہیومن کارگو تھے ...... سکون کا سانس لیا۔ جھٹکوں سے ان کے بدن کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا...... گھپ اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھ سکتے تھے تو انہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ اب وہ کہاں پر موجود ہیں ...... باہر دن ہے یا رات ہے...... سامان لے جا۔ اس کنٹینر کے سامنے والے حصے میں مضبوطی سے بند بھاری کارٹن تھے جن کو ہلایا بھی نہیں جا سکتا تھا مگر چار قطاروں میں ایک قطار ایسی بھی تھی صرف باہر کی طرف والا کارٹن دوسروں کی طرح بھرا ہوا تھا اور ویسا ہی نظر بھی آتا تھا۔ تاہم اس کا وزن بہت کم تھا۔ بیچ میں پھنسا ہونے کی وجہ سے اسے دائیں بائیں ہلانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے پیچھے والے سارے کارٹن خالی تھے۔ وہ سب جو آخری حصے میں ٹیک لگا کر بیٹھے تھی کنٹینر کے رکتے ہی پچھلی طرف سے کارٹن میں داخل ہو جاتے تھے اور سرنگ میں چلنے والوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتے آخر تک چلے جاتے ...... سانس روکے خاموش اور خوف زدہ۔ خاموشی سے انہوں نے باہر کی سمت والے کارٹن کو ہلانے والوں کی آوازیں سنیں۔ پھر کارٹن کو اتارا گیا۔ لیکن ابھی وہ باہر نکلنے کے لیے آزاد نہیں تھے۔ جن خالی کارٹنوں کی سرنگ سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچے تھے، ابھی اس کا راستہ کھولا جانا باقی تھا...... کسی نے ہتھوڑی اور پلاس کی مدد سے تختے

کو ہٹایا تو انہوں نے باہر کی آزاد دنیا کو دیکھا۔ یہ سارا انتظام انہیں کسٹم حکام کی نظر سے بچائے رکھنے کے لیے تھا۔ یا پھر کم سے کم انہیں ایسا بتایا جاتا تھا ورنہ حکام ان کے باپ تھے اور جانتے تھے کہ سامنے والا اصل مال سے بھرا ہوا ہے۔ اسے ہٹانے سے جو کارٹن بند نظر آتا ہے وہ درحقیقت خالی ہے اور اس کے پیچھے کے سب کارٹن مل کر ایک سرنگ بناتے ہیں جس کے آخر میں دولت کمانے کے آرزومند دولت لٹا کر اس وقت کے انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہے ہیں۔ جب خوش قسمتی کا دروازہ وا ہوگا اور وہ اپنے خوابوں کی سرزمین لینڈ آف گولڈن، سنہرے موقع پر قدم رکھیں گے۔ سب جانتے ہوئے بھی انجان بنے رہنے والے بھی اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ یہ سفر مرحلہ وار طے ہوتا تھا۔

حفاظت نے اندھیری رات میں قدم رکھا۔ اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے دس افراد ریت پر کودے۔ وہاں ایک شخص لالٹین لیے مستعد کھڑا تھا۔ ٹرک ڈرائیور استاد نے کہا۔

''ہم ایران پہنچ گئے ہیں۔ اس شخص کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہیں آگے لے جائے گا۔ فی امان اللہ۔''

وہ ٹرک پر چڑھا، کارٹن دوبارہ چڑھانے کے بعد پیچھے والا حصہ پھر بند کر دیا گیا تھا۔ ٹرک روانہ ہو کر رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ وہ لالٹین والے شخص کے پیچھے چلتے گئے۔ اپنی صورت کے نقوش سے وہ بھی بلوچی مکرانی لگتا تھا۔ لیکن ان کی زبان نہیں سمجھتا تھا جو سندھی، پٹھان اور بنگالی سب تھے۔ اسے انگریزی کے صرف دو الفاظ آتے تھے۔

''شٹ اپ۔'' یہ ثابت کرنے کے لیے وہ صرف فارسی بول سکتا ہے۔

حفاظت کے لیے یہ سفر کسی عذر سے کم نہیں تھا ایک بھیانک عذاب اور عذاب کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ۔ اس نے نقد رقم کوئی ادا نہیں کی تھی ...... یہ حسن انتظام شیخ ستار کی فیاضی اور رحم دلی کا نتیجہ تھا۔ حفاظت جانتا تھا اس سفر کی قیمت باقی سب کے مقابلے میں اتنی زیادہ بنتی تھی کہ سکہ رائج الوقت بھی نہیں بتائی جا سکتی تھی۔ دیگر ہم سفروں میں سے کسی نے چھ لاکھ دیے تھے تو کسی نے سات لاکھ......ان میں ایک آٹھ لاکھ کا بھی مسافر تھا...... کسی نے ماں کا زیور بیچا تھا تو کسی نے باپ کی زمین ...... ایک اپنا گھر بیچ کر آیا تھا تو ایک ایسا بھی تھا جس نے اپنی بے حد نوجوان، حسین اور نئی نویلی ایک بوڑھے جاگیردار کے ہاتھ ہی اسے بلیک میل کر کے بیچ دی تھی۔ وہ بڑی بے غیرتی سے کہتا تھا کہ بیوی کا کیا ہے اور مل جائے گی۔ اس حسین بیوی سے میں چھ سات ماہ تک جی بھر کے کھیلا تھا جس نے مجھے بھجوایا ہے اسے ایک ہی عورت پسند تھی۔ میری بیوی تو میں نے کہا چل پھر سودا کر لے۔ تیری بھی دلی مراد پوری ہو جائے گی۔ میری بیوی اس بوڑھے سے شادی کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ایک رات میں نے اس کی چائے میں نشہ آور دوا گھول دی۔ پھر اس بوڑھے کے ساتھ اس کی باہم پیوست کی تصویر بنا کر بلیک میل کیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ اپنے جوان سوتیلے بیٹے سے آشنائی پیدا کر کے بوڑھے شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہے گی۔

حفاظت نے بتایا کہ اس نے تیس لاکھ مالیت کی خاندانی جائداد گنوائی، ماں باپ بھی گنوائے، بچپن سے اس کی محبت میں پاگل اپسرا گنوائی ...... وہ خاندانی حکیم تھا...... چھوٹے حکیم صاحب قبلہ بڑے حکیم صاحب کا وارث اور گدی نشین ...... تو سب ہنس ہنس کر دہرے ہو جاتے۔ یہ دیوانے جو اس اذیت اور ذلت میں......اس نے ان کی تفریح طبع اور وقت گزاری کے خیال سے بتا دیا تھا اس کی زندگی میں سب سے پہلی عورت آئی اور کس بہانے سے اس مہربان ہوئی دوسری رانی تھی واقعی وہ رانی تھی، رانیوں کی رانی پھر اس نے خالہ کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے کہا کہ یہ چالیس برس کی عورت کے بدن میں اس قدر گداز ہوتا ہے جو جوان لڑکیوں کے بدن میں بھی نہیں......ان کی فیاضی جادو کر دیتی ہے۔ ان

مسافروں نے جنہوں نے چالیس پچاس برس کی عورتوں سے تعلقات استوار کر رکھے تھے اس کی تائید کی..... ساتھی لوگ اسے دیوانہ کہتے کہ پاگل وے پتر چھوٹے حکیم صاحب! تو نے تو مجنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا جو صحرا صحرا بھٹکتا تھا اور لیلیٰ لیلیٰ پکارتا تھا۔ فرہاد کا ریکارڈ توڑ دیا جو پہاڑ سے دودھ کی نکالنے کا جنون رکھتا تھا۔ اوئے ایسی محبت کرنے والی تھی وہ تیری چھمک چھلو..... تو اس سے کہتا تھا نا کہ شادی کر کے تجھے بلا لے..... شادیاں فون پر بھی تو ہو جایا کرتی ہیں۔ جو ہر لحاظ سے جائز ہوتی ہیں..... ورنہ وہ دھرا لگوا دیتی..... ٹکٹ بھیج دیتی اور اگر میں تیری جگہ ہوتا خود کیوں جاتا..... اسے بلاتا..... تیرے پاس تو نکسال تھی۔ جعلی دوائیں ہربل میڈیسن..... قد بڑھاؤ..... بال اگاؤ، اولاد نرینہ پیدا کرو..... رنگ گورا کرو راتوں رات وزن گھٹاؤ، مس ورلڈ بن جاؤ سب کی دوائیں بنا کر بیچتا..... مقوی باہ کی اشتہار بازی کی اجازت ہے۔

حفاظت کے لیے اس عذاب کی نہ حد تھی نہ کوئی حساب تھا۔

وقت اور تاریخ یاد رکھنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ ان کو منزل تک پہنچانے کے دعوے دار جو جاتے کہتے تھے۔ اور کرتے بھی تھے۔ انہیں کھانے پینے کو کچھ ملے یا نہ ملے..... اپنے پنجرے سے نکلنا یقیناً ہونہ ہو..... رات سونے کے لیے ہے یاد رکھو۔ ایسے میں وہ لڑکیاں اور عورتیں بھی یاد آجاتی تھیں جن سے تعلقات استوار تھے۔ یا بیویاں تھیں..... ان کا لمس، قرب اور ہم بستری..... ان کی فیاضی..... سینے میں سرد آہوں کا غبار بھر جاتا تھا..... کوئی بیمار ہونا چاہے تو اس کی مرضی اور مر جائے تو خدا کی مرضی..... آگے کیا ہو گا کچھ نہیں ہو گا..... آگے والوں کی مرضی..... حفاظت ہر روز ایک ہی بات پر خدا کا شکر بجا لاتا تھا کہ ابھی وہ زندہ ہے اور ہوش میں بھی ہے۔ راہ میں ایک ہم سفر کو الٹیاں ہو کر دست لگ گئے۔ ناقابل برداشت بدبو سے سب کا دم گھٹنے لگا۔ جب وہ مر گیا اور اس کی پر عفوت لاش کو باہر پھینکا گیا تو باقی سب نے فوراً فوراً اپنی اپنی بنیان سے جگہ کو صاف کیا اور بنیان باہر پھینک دی۔ حفاظت جانتا تھا کہ یہ فوڈ پوائزنگ تھی۔ اس کا شکار دوسرے بھی ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ کھانا تو وہی سب کے پیٹ میں تھا۔ جب یہ مصیبت نہیں آئی تو اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ صحت بھی کتنی بڑی دولت ہوتی ہے۔

حفاظت کے ہم سفر اسے عجیب و غریب دل دہلا دینے والی کہانیاں سناتے تھے۔ جو سرزمین مراد کا سفر اختیار کرنے والوں کے عبرتناک انجام کی سنی ہوئی روایات پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان کو سن کر حفاظت کے سر سے صوفیہ کے عشق کا بھوت بھی اتر کر بھاگ جاتا تھا۔ سب کے ساتھ وہ بھی باجماعت پچھتانے لگتا تھا کہ اس نے خودکشی، یہ مشکل اور عبرتناک راستہ کیوں چنا..... اوروں کی بات اور جانیں..... وہ تو اچھا بھلا حکیم تھا..... پھر کہیں دکان ڈال لیتا تو بے وقوف اور شکار آجاتے..... ایسے پریشان نوجوانوں کی کمی نہیں تھی جو شادی سے قبل علاج کے لیے آتے تھے کہ خود لذتی نے ایسا کم زور اور ناکارہ بنا دیا تھا کہ سہاگ رات انہیں خفت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دوسرے ادھیڑ عمر کے مرد دوسری، تیسری بیوی کو ادویات کے سہارے خوش کرنا چاہتے تھے۔ ان میں بعض کنیزوں سے تعلقات کو استوار رکھنا چاہتے تھے۔ یہ شادی شدہ کنیزیں چوں کہ ضرورت مند ہوتی تھیں تھکی گرم ہونے پر ہر طرح خوش کر دیا کرتی تھی۔ ان سے اندھی آمدنی ہوتی تھی۔ کیوں کہ اسے بے وقوف بنانے کا ہنر آ ہی گیا تھا۔ لعنت ہے اس عشق پر اور عاشقی اس کی جگہ مجنوں یا فرہاد ہوتے تو وہ بھی کہتے کہ بھاڑ میں گئی لیلیٰ اور جہنم میں شیریں..... دشت خوردی سیر سپاٹا تھا، اب کسی پہاڑ پر ملک پلانٹ لگانا بزنس۔

جب کبھی اسے عورت کی طلب محسوس ہوتی تو وہ خالہ کے ہاں جا سکتا تھا۔ خالہ کی رس گلے، رس ملائی اور ریڑی کھیر بیٹیاں تھیں۔ خالہ جو قلاقند تھی، یہ مکس مٹھائی اسے کھانے کو مل جاتی..... اس روز اس ریڑی

کھر نے اسے دعوت دی تھی لیکن وہ کفران نعمت کر کے چلا آیا تھا۔ اس کو پتا نہیں تھا کہ اس کا پچھتاوا اسے ساری زندگی رسے گا..... کہ اس کے ہاتھوں ایک کلی پھول بنتی رہ گئی۔ لیکن کیا پتا کہ وہ جانے کب کی دوشیزہ سے عورت بن چکی تھی۔

ایک مہینہ..... ان کے لیے ایک برس یا ایک صدی کے عذاب پر محیط تھا۔

انہوں نے ایک تیل لے جانے والے جہاز میں ڈانگریاں پہن کر دن رات مشقت بھی کی..... وہ انجن روم میں سوتے تھے۔ انہیں عرشہ پر بھی سونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ انجن کا شور اتنا ہوتا تھا کہ کان کے پردے پھٹ جیسے جاتے تھے۔ وہ بہرے ہو گئے تھے۔ انہیں کھانے کو جو دیا جاتا تھا اس میں تیل کی بو محسوس ہوتی تھی۔ مزید دو اس سفر اور مشقت میں بیمار ہوئے اور ان کی جان اس عذاب سے چھوٹ گئی۔ ان کے لواحقین فی الحال ان کی طرف سے کسی خبر یا ڈالروں کے موصول ہونے کا انتظار کرتے رہیں۔ بالآخر ایک دن وہ مایوس ہو جائیں گے یا خود عالم بالا میں ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ سب کے لیے ایک ہی دعائے مغفرت..... وہ بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

جس نے اپنی حسین، نوجوان اور جنسی کشش سے بھرپور بیوی کو اب اپنی اس کوتاہی، خودغرضی اور ہوس پرستی کا بڑا دکھ اور پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے کیسی عاقبت نا اندیشی کی جو ایک بوڑھے کے ہاتھ ایک کھلونے کے طرح بیچ دیا تھا۔ وہ ایک جنتی حسین تھی اتنی ہی پرکشش اور فیاض بھی..... اس نے اپنے والہانہ پن، خود سپردگی اور وارفتگی سے ہر رات کو سہاگ کی پہلی رات بنا رکھا تھا۔ کبھی بھی اس نے اس کی کسی حرکت اور فعل اور خواہش کو پورا کرنے سے انکار نہیں کیا تھا اس نے اس خیال سے بھی بیوی کو فروخت کیا تھا کہ یورپ اور امریکہ میں ایک سے ایک سفید فام لڑکیاں اور عورتیں مل جاتی ہیں۔ نائٹ کلبوں، شراب اور شباب کی افراط ہے..... اسے اس کی ذہنیت اور ذلالت کی سزا مل رہی تھی۔ اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت اب تو اس بوڑھے کے مزے آگئے تھے۔ وہ اس کھلونے سے جی بھر کے ہر طرح کھیل رہا ہو گا۔ کاش! اس نے پیروں پر کلہاڑی نہ ماری ہوتی؟

وہ سفر کا آخری مرحلہ تھا جب انہیں بحری جہاز سے اتار کر ایک کشتی میں سوار کرا دیا گیا۔ وہ چپو سے چلائی جانے والی کشتی میں اپنے سامنے کسی ساحل کو دیکھ رہے تھے۔ بحری جہاز آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ کشتی کو آگے بڑھانے والا ایک نحیف و نزار ملاح تھا جس کے لیے آٹھ افراد کے وزن سمیت کشتی کو ایک چپو سے ساحل تک پہنچانا بظاہر ناممکن لگتا تھا لیکن وہ پھر بھی محنت اور مشقت پر مجبور تھا اور مسکرا مسکرا کر کسی اجنبی زبان میں سب سے کچھ کہتا جا رہا تھا۔ اچانک چپو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اگر وہ صرف لکڑی کا بنا ہوا چپو ہوتا تو تیری ہوا پھر پکڑ لیا جاتا مگر اس کے ڈنڈے پر لوہے کی چادر تھی اور نچلا حصہ بھی بیلچے کی طرح دھات کا بنا ہوا تھا۔ وہ فوراً ڈوب گیا۔ ملاح نے کھڑے ہو کر قمیص اتاری۔ پھر پتلون اور ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہتا ہوا ننگ دھڑنگ چپو ڈھونڈنے کے لیے پانی میں کود گیا۔ ہنسنے والوں نے اسے غوطہ مار کر بجلی کی طرح غائب ہوتے دیکھا۔ پھر وہ غائب ہی رہا..... مسافروں کے ہونٹوں سے ہستی غائب ہو گئی۔ ان کی تشویش بھی بالآخر مایوسی اور غصے میں ڈھل گئی۔ اسے وہ سب اسے فحش گالیاں دینے لگے۔ جو پانی کے نیچے ہی چلتا ہوا نہ جانے کس سمت نکل گیا تھا۔ ممکن ہے سانس لینے کے لیے وہ چند سیکنڈ سر نکال کر سطح آب پر بھی آیا ہو۔ مگر شاید کسی کی نظر اس سمت نہ گئی ہو۔

اب کشتی ساحل سے چند کلو میٹر تھی مگر پھر بھی ساحل اتنا ہی دور لگتا تھا جتنا اپنے پاکستان..... چپو کے بغیر آگے بڑھنے کی وہی سوچ سکتے تھے جن کو تیرنا آتا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ کوئی کسی اور کے بارے میں نہ سوچے۔ حفاظت نے چار افراد کو پانی میں چھلانگ لگا کر ساحل کی طرف تیرتے دیکھا۔ چار

افراد ان کی اندھی تقلید کرتے ہوئے پانی میں کود گئے تھے۔ ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر خطرے کا احساس غالب آ گیا تھا۔ یہاں ساحلی محافظ کسی بھی وقت انہیں شوٹ کر سکتے تھے۔ موت نے انہیں پناہ دے دی تھی۔ حفاظت کی عقل نے اس کا ساتھ دیا۔ باقی رہ جانے والے دو افراد نہ جانے کس ملک کے تھے۔ پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز اب صرف چھوٹے حکیم صاحب کو تھا۔ اتفاق سے اس کی نظر نے کشتی کے کنارے کو دیکھا جس کے اوپر والا تختہ ایک جگہ سے الگ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے کھینچا تو چھ فٹ لمبا اور چھ انچ چوڑا فائبر گلاس کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے اپنے باقی ماندہ دو ساتھیوں کو اشارے کی زبان میں سمجھایا کہ اسے چپو بنا کر ساحل تک پہنچنے کی جدوجہد کر سکتے ہیں۔ یہ ایسی بات نہ تھی جو کسی کی سمجھ میں نہ آ سکتی ہو..... وہ بھوک پیاس اور تھکن کے باوجود باری باری چپو چلاتے رہے۔ کشتی ایک ایک انچ آگے بڑھتی ہوئی رات کو نہ جانے کس وقت کم گہرے پانی میں پھنس کر رک گئی۔ وہ کود کر پانی میں اترے اور دوڑتے ہوئے خشکی پر جا گرے۔ بالآخر وہ منزل پر پہنچ گئے تھے۔ حفاظت کو صحیح معلوم ہوا کہ اس منزل تک پہنچنے والا وہ واحد شخص تھا۔ اس کے ساتھ کنارے پر اترنے والے دونوں افراد کو رات کے وقت کسی سانپ نے یا زہریلے جانور نے ڈس لیا تھا۔ ان کے نیلے پڑ جانے والے بدن دھوپ میں اکڑے پڑے ہوئے تھے۔

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے میری بے بسی کی لاج

حفاظت نے اٹھ کر چاروں سمتوں میں نگاہ ڈالی۔ کسی بھی سمت آبادی کے آثار دکھائی نہ دیے۔ اس کی تھکن تو کسی حد تک دور ہو گئی تھی لیکن اب اس پر بھوک سے نقاہت غالب آ رہی تھی۔ اس نے اپنے آخری ہم سفروں پر نظر ڈالی۔ وہ پاکستان، بھارت یا کسی ہمسائے ملک کے نہیں لگتے تھے۔ ان کے جسم پر رنگین ٹی شرٹس اور جینز تھی اور پاؤں میں جوگرز..... اپنے لباس پر نگاہ ڈال کر حفاظت نے مرنے والوں کی روح اس غیر اخلاقی حرکت پر معافی مانگی اور پھر ان میں سے ایک کے کپڑے اتار کر پہن لیے۔ اس ٹی شرٹ کے پیچھے انگریزی حروف میں کوئی غیر ملکی زبان لکھی ہوئی تھی اور ایک خاصا قابل اعتراض ڈانسر عورت کا پوز چھپا ہوا تھا۔ حفاظت کے خیال میں وہ دونوں کیوبا کے اپینی تھے۔ کسی وجہ کے بغیر حفاظت نے دوسرے شخص کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ اس سفر نے حفاظت کے اندر جو شرافت تھی وہ ساری شرافت چھین لی تھی اور اسے انسان سے اپنی بقا کی جنگ لڑنے والا حیوان بنا دیا تھا۔ اسے دوسرے شخص کی جینز ایک جگہ سے کچھ ابھری ہوئی اور سخت لگی۔ اس نے ایک جیبی چاقو کی مدد سے سلائی ادھیڑی تو اندر سے باریک پلاسٹک میں محفوظ امریکی ڈالرز برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے اس نے چھپا کر کسی ایمرجنسی کے لیے رکھے تھے۔ مرنے والے سے زیادہ حفاظت کو ان کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ وہ زندہ تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس خفیہ خزانے کی دریافت نے حفاظت کو دوسری پتلون کا جائزہ لینے پر مجبور کیا جو وہ خود پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ہپ پاکٹ میں بھی ڈالرز بھی اسی طرح رکھے تھے۔ شاید وہی ایک ناتجربہ کار یا بے عقل مسافر تھا جس نے اجنبی دیس کی مسافرت میں اپنے لیے کوئی زاد راہ نہیں لیا ہوا تھا۔ گنے بغیر اس نے سارے خزانے کو محفوظ کیا اور اپنے سامنے غیر آباد نظر آنے والے ساحلی جنگل میں گھس گیا۔ اس سفر کے تجربے نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا..... غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہونے سے پہلے ان کو یہاں لانے والوں نے سب خطرات اور نقصانات سے باخبر کر دیا تھا۔ حفاظت کو کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ راستے میں دوسروں کی باتیں سن سن کر وہ جان گیا تھا کہ یہاں اس کی آزادی اور زندگی کو کس قسم کے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ اس کی خوش نصیبی تھی کہ وہ سرحدی محافظوں کی نظروں سے محفوظ رہا تھا جو بعض اوقات دیکھتے سوال جواب کے بغیر گولی مار دیتے

تھے۔ آبادیوں سے بچتا ہوا وہ رات کے وقت سفر کرتا رہا اور دوسرے دن وہ ایک ایسے قصبے میں پہنچ گیا جہاں اسے سکھ نظر آئے۔ وہ اپنے حلیے اور لب و لہجے اور زبان سے نمایاں تھے۔ ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی مشرقی ایشیاء کے باشندے ایک جیسے لگتے تھے۔ ان میں سانولے اور گندمی جیسے میکسیکو، اسپین اور کیوبا کے لوگ بھی تھے۔ افریقی بھی اور دیگر ایشیائی۔ حفاظت نے ایک سکھ ٹیکسی کو روک اپنا مسئلہ بیان کیا۔

اگر وہ دردمند دل رکھنے اور پاکستانیوں سے ہمدردی رکھنے والا نہ ہوتا تو اسی وقت اسے پولیس کے حوالے کر دیتا۔ اس نے نہ صرف حفاظت کی مدد اور اس کی حفاظت بھی کہ اسے قانون کی نظر سے محفوظ رہنے کے کارآمد گر، طریقے اور راستے بھی بتائے۔ وہ اس کے لیے کسی مسیحا سے کم ثابت نہ ہوا تھا۔

☆☆☆

دروازہ ایک سیاہ فام عورت نے کھولا جو چھتیس برس کی عمر کی ہو گی۔ وہ چھریرے، تناسب اور روغنی بدن کی تھی۔ اس کی سیاہ جلد بڑی چمکیلی تھی۔ وہ صرف زیر جامے میں تھی۔ اس کے حسن و شباب کی رعنائیاں اور شادابیاں واضح تھیں۔ وہ صرف زیر جامے میں تھی۔ اس کے بکھرے بالوں اور زیر جامے کی بے ترتیبی سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی مرد سے ہم آغوش تھی یا سونے کے لیے بستر پر جا رہی تھی۔ اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر اسے اوپر سے نیچے ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یس..... کیا چاہیے تمہیں؟ کیا تم کسی سے ملنے آئے ہو؟''

میرا نام حفاظت حسین ہے۔ اور میں پاکستان سے آیا ہوں۔ صوفیہ کو اطلاع کر دو۔''

سیاہ فام عورت دعوت دیتے انداز سے مسکرائی تو اس کے موتیوں جیسے سفید دانت چمکنے لگے۔ وہ اس کے اس قدر قریب آ گئی تھی کہ اس کا جوان جسم آنچ دینے لگا تھا۔ اگر وہ صوفیہ سے ملنے نہ آیا ہوتا تو اس کے کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کے چہرے پر جھک جاتا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ بڑے رسیلے تھے۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ سیاہ فام لڑکیاں عورتیں بھی اس قدر پرکشش ہوتی ہیں۔ اس نے صوفیہ کی جسمانی کشش ماند کر دی تھی۔

''اندر آ جاؤ پاکستانی دوست! وہ تمہارے انتظار میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے اور تمہیں چومنے کے لیے بے قرار ہے کہ تم نے اس کی خاطر ایسا دشوار گزار سفر کیا۔''

پھر اس سیاہ فام عورت نے حفاظت کا ہاتھ تھام کر اور اسے لے کر راہ داری کے آخری زینے کی طرف بڑھی۔ اچانک رک کر اس کے گلے میں اپنی مرمریں، گداز اور عریاں بانہیں حمائل کر دیں۔ پھر بے تابانہ اس کے چہرے پر جھکتی چلی گئی۔ اس کا بوسہ طویل اور گرم جوش تھا۔ وہ صوفیہ کی محبت میں بددیانتی کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے جذبات مشتعل ہو رہے تھے۔ اس نے خود پر بہ دقت قابو پایا تھا۔

''میں تمہیں خوش آمدید کہتی ہوں ..... یہ استقبالیہ بوسہ تھا کہ تم صوفیہ کے پرستار ہو۔''

پھر اس نے حفاظت کا ہاتھ اپنی کمر پر رکھ لیا۔ اس کے بھرے بھرے کولہے اسے سہارا دے کر زینے پر لے گئے، جس کا اختتام دوسرے دروازے پر ہوا۔ پھر اس نے حفاظت کا ہاتھ کولہے پر سے ہٹا کر دروازے پر دستک دی۔

''صوفیہ..... گڈ لک ڈارلنگ..... تمہارا پاکستانی پرستار آ گیا ہے۔ مبارک ہو۔''

اگلے لمحے دروازہ کھلا۔ حفاظت کے اندر گھستے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے اپنے شانے ایک سرو قامت سنہری رنگ کے بالوں والی سفید فام عورت کو دیکھا جو کمر پر ہاتھ رکھے اسے پرخیال نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چالیس برس کی پرشباب گداز بدن کی دل کش عورت تھی۔ وہ جاذبیت سے بھری تھی۔ انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی تھی۔ اس میں ایسی جنسی کشش تھی جس کی تمنا ہر مرد کرتا ہے۔ وہ فطری حالت میں

کھڑی بے شرمی سے مسکرا رہی تھی۔ حفاظت اسے اسی حالت میں دیکھ کر تحیر زدہ رہ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ ایک عورت اسی حالت میں ایک اجنبی مرد کے سامنے آ بھی سکتی ہے؟ اس نے سوچا کہ کہیں وہ کسی قحبہ خانہ میں تو نہیں آ گیا۔ وہ دو ایک بار ہیرا منڈی گیا تھا۔ کوئی طوائف اسی حالت میں سامنے نہیں آئی تھی۔

''صوفیہ کہاں ہے؟ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔'' حفاظت نے سنبھل کر کہا۔

''ڈاکٹر حفاظت! میں ہی صوفیہ ہوں۔'' اس نے زہر خند کہا۔ ''کیا تمہیں مجھے دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے مایوسی ہو رہی ہے۔ میں کسی بھی مرد کو ہر طرح سے خوش کرنے کے لیے بیس ڈالر لیتی ہوں۔ چلو بیڈ روم میں۔''

''نہیں..... تم صوفیہ نہیں ہو..... میں نے اس کی تصویریں دیکھی ہیں۔'' حفاظت نے تکرار کی۔

''کیا میں صوفیہ سے کہیں حسین اور سیکسی نہیں ہوں؟ میرا نام مارلن منرو ہے۔ تم میرے ساتھ وقت گزاری کرو گے تو پھر صوفیہ کیا کسی اور عورت کے پاس جانا پسند نہیں کرو گے۔''

''ہاں..... تم صوفیہ سے کہیں حسین اور پرکشش ہو مجھے اس بات سے انکار نہیں چوں کہ میں صوفیہ سے محبت کرتا ہوں۔ اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی محبت یہاں کھینچ لائی ہے۔''

''تم نے جس کی تصویریں دیکھیں اس کا نام سوسن ہے۔ تمہاری جلد ہی اس ملاقات ہو جائے گی۔''

کمرے کا عقبی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ دو دیو پیکر سیاہ فام نمودار ہوئے۔

''آؤ چلو..... ہم تمہیں تمہاری محبوبہ سے ملوائیں..... کم آن بوائے۔'' انہوں نے ہکا بکا کھڑے ہوئے حفاظت کو گھسیٹا۔

اگلے روز سے ایک بند ٹرک میں بہت دور کسی فارم پر شفٹ کر دیا گیا جہاں اس جیسے بہت سے غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہونے والوں کو ایک بیگار کیمپ جیسی جگہ پر رکھا گیا تھا۔ اس بیگار کے بدلے جوان سے لی جاتی تھی انہیں اچھا رہنے اور کھانے کی سہولت حاصل تھی۔ فارم ہاؤس کی مالک عورت جو چالیس برس کی امریکی تھی وہ چھریرے اور متناسب بدن اور سرو قامت ہونے کے باعث بے پناہ جنسی کشش کی مالک تھی۔ یہ مالک عورت ان سب کو معمولی اجرت بھی دیتی تھی جو ان سب کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا وعدہ تھا کہ جس دن ان کے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ وہ لوٹ کر گھر جانے اور قبلی ویزا پاسپورٹ کا خرچ برداشت کر سکیں وہ اس دن انہیں واپس بھیج دے گی اور تب تک انہیں جیل سے دور رکھے گی۔ ان کی ہر طرح سے حفاظت کرے گی۔ اور ہر قسم کی وہ سہولت فراہم کرے گی جو وہ چاہتے ہیں۔

وہ فارغ وقت میں ٹی وی دیکھیں۔ گیم کھیلیں..... اس نے ایک بار بھی بنا رکھا تھا۔ جمع پونجی میں سے خرچ کر کے جو شراب چاہے خرید کر پی لیں۔ اس کے علاوہ وہ سات لڑکیاں جن کی عمر بیس برس سے چوبیس برس کی تھیں..... ان میں وہ صوفیہ بھی جس کا اصل نام سوسن تھا۔ اس کی تصویریں اسے صوفیہ کے نام سے ٹریپ کرنے کے لیے فراہم کی گئی تھیں۔ یہ سات لڑکیاں بھی غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہو کر فارم کی مالک عورت مس جین کے ہتھے چڑھ گئیں تھیں۔ مردوں کو لڑکیوں سے وقت گزاری کے لیے بیس ڈالر ادا کرنے پڑتے تھے جو ان کے اکاؤنٹ میں سے لڑکیوں کو دے دیے جاتے تھے۔ اگر کوئی مالک عورت کے ساتھ شب بسری کرنا چاہے تو وہ تیس ڈالر لیتی تھی۔ اس کے اور سات لڑکیوں کے علاوہ کوئی لڑکی عورت باہر کی نہیں لائی جا سکتی تھی۔

حفاظت بھی ایک مکھی کی طرح مکڑی کے جالے میں پھنس چکا تھا۔

☆☆

دُرگزیدہ

جاوید راہی

اہل دانش فرماتے ہیں کہ رشتے خون کے نہیں احساس کے ہوتے ہیں۔ احساس ہو تو پرائے بھی اپنے اور احساس نہ ہو تو اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔ ایک بدنصیب کی لڑکی کی کتھا جس کے سگے رشتوں کا خون سفید ہو گیا تھا۔ قتل کی ایک ایسی واردات جس میں قاتل نے خود اپنا پانوں کلہاڑی پر دے مارا۔

خود اپنے دام میں صیاد آگیا۔ انسپکٹر شاہ میر کی ذہانت کا شاخسانہ

تقدیر بڑی دلچسپ چیز ہے، آج تک فیصلہ نہیں ہوسکا کہ تقدیر اور تدبیر میں سے کون سی چیز بڑی حیثیت رکھتی ہے، بلال احمد نے کبھی ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کیا تھا، بس اچھا کمانے کے لیے جائز طریقوں سے سوچتا اور عمل کرتا تھا، کچھ وقت تو جدوجہد میں گذرا، ناکامیاں اور کامیابیاں ساتھ ساتھ چلتی رہیں، لیکن پھر تقدیر نے اس کا ساتھ دیا، ایکسپورٹ کا کام شروع کیا اور دولت کی دیوی اس کی طرف چل پڑی۔ وارے نیارے ہو گئے، کچھ اور سوچا اور بلڈنگ کنسٹرکشن کا کام شروع کیا، تقدیر شانہ بشانہ تھی، کروڑ پتی بن گیا، دولت ہر کونے سے اندر داخل ہو رہی تھی اور خوشیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ دو بچوں کا باپ بن گیا، بیٹے کا نام نسیم احمد اور بیٹی کا نام عالیہ کوثر تھا۔ عالیہ نسیم سے تین سال چھوٹی تھی، چار افراد کا یہ کنبہ عیش و عشرت کی آغوش میں جھول رہا تھا۔

محل نما گھر میں خوشیوں کا بسیرا تھا، بیوی جہاں آراء ہر دور کی ساتھی تھی اور اپنے بچوں کی تربیت کر رہی تھی، جنہیں اعلا اسکول میں تعلیم دلائی جا رہی تھی۔ وقت کو کون لگام دے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچے جوان ہو گئے، نسیم احمد نے سول انجینئرنگ کی ڈگری لے لی چونکہ شروع ہی سے باپ کے کام میں دلچسپی لیتا تھا، اس لیے بلال احمد نے اس کے لیے سول انجینئرنگ کا شعبہ منتخب کیا تھا اور گزرتی عمر کے ساتھ نسیم پوری طرح باپ کے کاروبار میں ملوث ہوگیا تھا اور بلال احمد کا دست راست بن گیا۔

بیٹی عالیہ کوثر نے بی اے کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے سوشل سائنس میں ایم اے کرلیا۔ اسے سوشل ورک سے دلچسپی تھی، دولت کی کمی نہیں تھی چنانچہ ایک این جی او نے اسے بڑا عہدہ دے دیا تھا اور وہ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ یوں یہ پرسکون گھرانہ زندگی کا خوب صورت سفر کر رہا تھا۔ پھر بلال احمد نے اپنے ایک ہم پلہ گھرانے میں نسیم احمد کے لیے رشتہ دے دیا اور نویرا دلہن بن کر آ گئی، اس طرح اس محل میں ایک اور کردار کا اضافہ ہو گیا۔ بیٹے کی شادی کے بعد بلال احمد کو بیٹی کی شادی کی فکر ہوئی، ان دونوں کے علاوہ ان کی زندگی میں تھا ہی کیا۔ عالیہ خوب صورت تھی، اعلا تعلیم یافتہ تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کروڑ پتی باپ کی بیٹی تھی۔ خود اس کے اپنے حصے میں کافی جائداد اور بینک بیلنس تھا، یہ بات سبھی جانتے تھے چنانچہ اس کے لیے بھلا رشتوں کی کیا کمی ہوتی، لیکن جب باپ نے اس کی شادی کی بات کی تو اس نے کھانے کی میز پر بڑے اعتماد سے کہا۔

”ابو آپ میرے مثالی باپ ہیں، جس طرح آپ نے مجھے اعتماد دیا ہے اسی طرح میں نے بھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی، میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”وجہ بیٹی؟“ بلال احمد نے پوچھا۔

”بس ابو، میں ابھی آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔“

”آزاد تو تم شادی کے بعد بھی رہو گی، اتنی دولت ہے تمہارے پاس کہ تم ہمیشہ حاکم رہو گی، البتہ میں تمہیں ایک اور اجازت دیتا ہوں کہ خود اگر تمہاری پسند ہو تو ہمیں اس کے بارے میں بتادو، اگر تمہاری پسند کوئی عام آدمی بھی ہو تو ہم اسے قبول کرلیں گے۔“

بلال احمد کی اس بات پر عالیہ ہنس پڑی۔

”آپ کے ذہن میں وہ تمام فلمیں ہوں گی جن کی کہانیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں، شکر ہے ایسی کوئی کہانی مجھ سے منسلک نہیں ہے۔“

یہ شاید حقیقت تھی یا پھر عالیہ کوثر اندر سے گہری تھی اور اس نے کسی مصلحت کے تحت باپ کو اصل بات نہیں بتائی تھی ورنہ کالج اور یونیورسٹی کے ماحول میں لڑکیوں کے علاوہ بہت سے لڑکوں سے بھی اس کی دوستی تھی، ان میں اعلا اور دولت مند گھرانوں کے نوجوان بھی تھے، رشتے داروں میں بھی بہت سے نوجوان اس کی قربت اور اس کے شادی کے خواہش مند تھے، لیکن عالیہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ کسی قیمت پر شادی کے لیے تیار نہیں ہے، اپنی این جی او کے ذریعے وہ بہت

کام کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔

پھر اس محل کے کرداروں میں سے ایک کردار کم ہو گیا۔ یہ بلال احمد تھے، معمولی سے بیمار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہو گئے، ان کی یہ موت بالکل اچانک تھی، اچھے خاصے تندرست تھے، آفس میں بیٹھے بیٹھے اچانک سینے میں شدید درد ہوا، وہیں سے ہسپتال لے جایا گیا، لیکن جب ہسپتال پہنچے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی یہ اچانک موت بہت سی مشکلات کی حامل تھی۔ نسیم احمد ہر چند کہ باپ کے کاروبار میں پوری طرح داخل تھا، لیکن بہت سے ایسے مالی امور تھے جن سے ناواقف تھا، بلال احمد نے کچھ ایسے منصوبوں میں پاؤں پھنسایا ہوا تھا، جن میں کروڑوں روپیہ بلاک تھا۔ اب یہ سب اس کے شانوں پر آ پڑا تھا، پہلے تو وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا لیکن بلال احمد نے اعلا تنخواہوں پر ایسے تجربے کار لوگوں کو رکھا ہوا تھا جنہوں نے نسیم احمد کی بہت مدد کی اور رفتہ رفتہ اس نے بہت سے معاملات سنبھال لیے۔ البتہ بلال احمد کی اس اچانک موت سے سب سے زیادہ متاثر اس کی بیوی جہاں آراء تھی، تیس برس کا ساتھ تھا معمولی بات نہیں تھی، اس نے اپنے شوہر کے ساتھ مشکل وقت گزارا تھا اور اس کے بعد دولت کی فراوانی دیکھی تھی، باقی لوگ تو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ شوہر کی جدائی سے وہ ٹوٹ گئی، سب کچھ ہیچ ہو گیا، بچے جوان تھے، خود مختار تھے، اس نے تمام ذمے داریوں سے ہاتھ اٹھا لیے اور ہر طرح کا نظم و نسق بچوں کو سونپ دیا۔

عالیہ کی دنیا الگ ہی تھی، باپ نے اس کی ساری زندگی دولت سے محفوظ کردی تھی، خود اس کے پاس اتنا کچھ تھا کہ وہ اپنی نسلوں تک کو عیش کرا سکتی تھی، این جی او کے تحت اس نے بہت سے بکھیڑے پال لیے تھے اور ان میں مصروف رہتی تھی چنانچہ جب جہاں آراء نے اپنی ذمے داری اس کو سونپنا چاہی تو عالیہ نے صاف کہہ دیا۔

”ان تمام ذمے داریوں کو اٹھانے کا حق صرف بھابھی کو ہے، وہی اس گھر کی مالک ہیں جس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ اعتراض کسی کو نہیں تھا اس لیے گھر کا نظم و نسق نویرا نے سنبھال لیا، شوہر نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اس لیے بے چاری جہاں آراء کا دل دنیا میں نہیں لگ رہا تھا۔ چنانچہ وہ بستر سے جا لگی۔

ابتداء میں تو نسیم احمد اور عالیہ نے صرف یہی کہا کہ ماں شوہر کے نہ ہونے سے دل برداشتہ ہو گئی ہے، لیکن جب جہاں آراء ہڈیوں کا پنجر بننے لگی تو بچوں کو بہت تشویش ہوئی، نسیم احمد تو کاروباری مشکلات میں الجھا رہتا تھا، لیکن عالیہ کی کائنات تو ماں تھی۔ پھر جب قابل ترین ڈاکٹروں نے جہاں آراء کو کینسر ڈکلیئر کیا تو سب کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

شوہر کی موت کے صرف پانچ ماہ کے بعد جہاں آراء نے بھی دم توڑ دیا اور بچے صدمے سے گنگ ہو گئے، خاص طور سے عالیہ تو سکتے میں رہ گئی تھی، اپنے اس طرح بھی بچھڑ جاتے ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں تلاش کرتی تھی۔ البتہ نسیم احمد اور نویرا اس کا بہت خیال رکھتے تھے اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے تھے، والدین کی موت کے بعد سارے کاروبار اور جائداد کی مالک یہی دونوں بہن بھائی تھے۔ نسیم احمد کے حصے میں اس کی بیوی نویرا بھی شریک تھی، لیکن عالیہ بلا شرکت غیرے اپنے حصے کی مالک تھی۔ بہت سے نوجوانوں کو معلوم تھا کہ ایک خوب صورت اور نوجوان لڑکی کی شکل میں وہ سونے کی کان ہے چنانچہ بہت سے نوجوان اس سے شادی کے خواہش مند تھے، وہ اس سے بھی رجوع کر کے اسے رجھانے کی کوشش کرتے اور اس کے بھائی نسیم احمد سے ربط بڑھا کر اسے عالیہ کے ساتھ شادی کی پیشکش کرتے، لیکن عالیہ نے دوٹوک بھائی سے کہہ دیا کہ ابھی وہ شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔

”تمہاری صحت متاثر ہو رہی ہے عالیہ۔ شادی کرلو تو مصروف ہو جاؤ گی، دل بہل جائے گا اور پھر یہ تو ایک ضروری عمل اور زندگی کا حصہ ہے۔“ نسیم احمد نے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی، امی کے جانے کے بعد میرا دل گھر میں بالکل نہیں لگتا ہے، ہر جگہ سے ان کی آوازیں آتی ہیں، ہر طرف وہ چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔"

"تو پھر میں کسی سے بات کروں؟"

"کس بارے میں؟"

"تمہاری شادی کے بارے میں، یا پھر اگر تمہیں کوئی پسند ہو تو، بے دھڑک مجھے اس کے بارے میں بتاؤ، وہ کوئی بھی ہو۔"

"وہ کوئی بھی نہیں ہے اور میں شادی کے لیے کہہ بھی نہیں رہی۔"

"پھر۔"

"میں بلو ایونیو والے فلیٹ میں منتقل ہو رہی ہوں، میں نے اسے ڈیکوریٹ کرنے کے لیے ایک انٹیریئر ڈیکوریٹر فرم کو آرڈر دے دیا ہے۔"

"ارے کیوں تم ہمیں چھوڑ دو گی۔" نویرا نے حیرت سے کہا۔

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا، بس میں وجہ بتا چکی ہوں، یہاں رہ کر امی بہت یاد آتی ہیں، اس لیے صحت بھی گر رہی ہے، اس کے علاوہ بلو ایونیو کے سامنے جو میرا پلاٹ ہے، میں وہاں ایک پلازہ بنانا چاہتی ہوں، اس کے لیے میرے ساتھ ہاشم احمد بھی کام کرے گا، وہی سب کچھ کر رہا ہے۔"

"کیوں..... یہ کام تم مجھ سے بھی کہہ سکتی تھیں۔"

"بس بھائی، یہ سب میں نے اپنے لیے کیا ہے اور میرا خیال ہے میں یہ سب کر کے اپنی صحت بہتر کر سکتی ہوں۔" ہاشم احمد ان کا دور کار رشتے دار بھی تھا اور اس نے بھی سوشل سائنس میں ایم اے کیا تھا، یونیورسٹی میں بھی وہ عالیہ کے ساتھ پڑھتا تھا لیکن دوران تعلیم وہ اجنبی سے ہی رہتے تھے، ہاشم احمد کا گھرانہ بالکل معمولی سا تھا شاید اسی وجہ سے ان کے گھرانے میں زیادہ قربت نہیں تھی۔ البتہ ہاشم احمد کبھی کبھار ان لوگوں کے گھر آتا رہتا تھا، لیکن نسیم احمد اسے پسند نہیں کرتا تھا، اسی وجہ سے عالیہ کی زبانی ہاشم کا نام سن کر اس کے دل میں تکدر سا پیدا ہوا تھا، البتہ عالیہ نے جو کچھ کہا تھا حتمی لہجے میں کہا تھا، نسیم احمد بہن کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ جو ارادہ کر لیتی ہے، وہ فیصلہ کن ہوتا ہے، مزید یہ کہ بلو ایونیو کا وہ لگژری فلیٹ عالیہ کی ملکیت تھا۔

فلیٹ تیار ہو گیا تو عالیہ گھر کی قدیم ملازمہ حسینہ کے ساتھ اس میں منتقل ہو گئی، یہ خوب صورت بلڈنگ بھی بلال احمد نے بنائی تھی جس میں فلیٹ اور دکانیں تھیں۔ پتا نہیں ہاشم نے کس طرح عالیہ تک رسائی حاصل کی تھی جبکہ یونیورسٹی میں عالیہ نے کبھی ہاشم کو کوئی حیثیت نہیں دی تھی، الغرض یہاں آنے کے بعد ہاشم اکثر عالیہ کے پاس نظر آنے لگا، بظاہر وہ صرف سامنے والے پلازے کی تعمیر کے سلسلے میں آتا تھا، لیکن اس کے دل میں شاید کچھ اور ہی تھا، اس نے عالیہ کی ہر ضرورت سنبھال لی تھی اور تن من سے اس کے ہر کام کے لیے تیار رہتا تھا۔

اس رات نسیم احمد اور اس کی بیوی نویرا عالیہ کے پاس آئے تو ہاشم وہاں موجود تھا، جسے دیکھ کر نسیم احمد کا منہ بگڑ گیا۔

"کیسی ہو عالیہ.....؟" نویرا نے عالیہ کے گلے لگ کر کہا۔

"ٹھیک ہوں بھابھی، مصروف ہو گئی ہوں، اچھا لگ رہا ہے۔" عالیہ نے مسکرا کر کہا۔

"میں چلتا ہوں عالیہ، کل صبح موٹی بجری کے ٹرک آ جائیں گے۔" ہاشم نے اپنی طرف کسی کی توجہ نہ پا کر کہا۔

"ٹھیک ہے ہاشم، تم صبح کس وقت آ جاؤ گے؟" عالیہ نے کہا۔

"علی الصباح، ٹرک والے تو صبح پانچ بجے اپنا کام شروع کر دیں گے، الیاس خاں رات سائٹ پر رکے گا۔" ہاشم نے جواب دیا۔

"اوکے..... تم ناشتا میرے پاس ہی کرنا۔" عالیہ نے کہا اور ہاشم بغیر کسی سلام دعا کے چلا گیا، اس کے جانے کے بعد نسیم احمد نے کہا۔

"ہاشم احمد کس حیثیت سے تمہارے پاس کام کر رہا ہے؟"

"بس بھائی، اپنا رشتے دار بھی ہے اور صحیح طریقے سے میری معاونت بھی کر رہا ہے، ایک طرح سے میں نے اسے ٹھیکے دار کی حیثیت سے دی ہے، سب کچھ وہی دیکھتا ہے۔"

"کنسٹرکشن اس کا شعبہ تو نہیں ہے، وہ تمہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹے گا، میں تمہیں ایک بہت اچھا اور تجربے کار ٹھیکے دار دے سکتا ہوں، تمہیں پتا ہے کہ ہمارے ماں باپ ہاشم احمد اور اس کے خاندان کو پسند نہیں کرتے تھے، یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

"مجھے خود پر بھروسا کرنے دیجیے بھائی، ہاشم میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کر سکتا، آپ اس کی فکر نہ کریں۔"

"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں عالیہ، میں تمہارا بڑا بھائی ہوں، ماں باپ کی موت کے بعد ایک طرح سے تمہارا سرپرست میں ہی ہوں اور میرا فرض ہے کہ میں تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچوں۔ تم بہت خود اعتماد ہو، لیکن ہمارا معاشرہ ایک مخصوص سوچ کا حامل ہے، وہ مجھ پر انگلیاں اٹھا رہا ہے، مجھے معاف کرنا لوگوں کا خیال ہے کہ تم ہمارے ساتھ غیر مطمئن تھیں اسی لیے تم نے گھر چھوڑ دیا، بات نویرا تک آ رہی ہے کہ شاید نویرا کا رویہ تمہارے ساتھ اچھا نہیں تھا۔"

"لوگوں کا خیال ہے بھائی، ہمارا اپنا تو نہیں ہے۔"

"تمہارے بھائی تمہارے لیے بہت پریشان رہتے ہیں، کہتے ہیں عالیہ اکیلی ہو گی اور پھر عالیہ اس وقت تمہارے لیے بہت سے اچھے رشتے موجود ہیں، تم ہمیں اجازت دو کہ ہم اس پر کام کریں، عمر بڑھ جاتی ہے عالیہ تو اچھے رشتے نہیں آتے۔" نویرا نے کہا۔

عالیہ خاموشی سے سر جھکائے سنتی رہی، پھر آہستہ سے بولی۔ "مجھے غور کرنے کے لیے کچھ وقت دیں بھابھی۔"

"ہاں ہاں خوشی سے۔ تم ضرور غور کر لو اور پھر یہاں اکیلے رہنے کی ضرورت نہیں ہے، ٹھیک ہے تم نے اگر ہاشم کو اس سلسلے میں ذمے داریاں سونپ دی ہیں تو میں اس پر اعتراض نہیں کروں گا، لیکن تمہاری اجازت سے اپنا ایک تجربے کار آدمی یہاں لگا دوں گا جو ہاشم کی نگرانی رکھے اور اسے کوئی بے ایمانی نہ کرنے دے۔"

"ابھی ایسا نہ کریں بھائی، بعد میں دیکھ لیں گے۔" عالیہ نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے، لیکن تم ہماری باتوں پر اچھی طرح غور کرنا، دو ایسے رشتے میرے پاس آ چکے ہیں جو کافی اچھے ہیں، لیکن اس کے باوجود جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔"

نویرا اور نسیم احمد کافی دیر عالیہ کے ساتھ رہے اور پھر خوش خوش وہاں سے واپس آ گئے، لیکن دوسری صبح نسیم احمد کو اس وقت ایک فون کال موصول ہوئی جب وہ ٹھیک طرح سے جاگا بھی نہیں تھا، اس نے ناگواری کے انداز میں اپنا موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا پھر بٹن آن کر کے بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کون ہے؟"

"حسینہ بول رہی ہوں سر جی؟" دوسری طرف سے روتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کیا بات ہے کیا ہو گیا؟"

"جلدی آ جائیے سر جی، خدا کے لیے جلدی آ جائیے۔"

"بات کیا ہے؟"

"سر جی عالیہ بی بی، سر جی جلدی آ جائیے۔ سر جی۔" حسینہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور نسیم احمد نے فون بند کر دیا، اس نے پھرتی سے تیاری کی اور نویرا کے ساتھ کار دوڑاتا ہوا بلو ایونیو پہنچ گیا، حسینہ دروازے کے پاس کھڑی ہوئی رو رہی تھی۔

"کیا ہو گیا، عالیہ کہاں ہے؟" نسیم احمد نے پوچھا اور حسینہ نے عالیہ کے بیڈ روم کی طرف اشارہ کر دیا، بیڈ روم میں عالیہ اپنے بستر پر مردہ پڑی ہوئی تھی، رات کو وہ اچھی خاصی سوئی تھی لیکن صبح جب حسینہ چائے لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ مردہ پڑی تھی، نسیم احمد کی تو حالت خراب ہو گئی تھی، نویرا نے ڈاکٹر کو بلایا جس نے عالیہ کی موت کی تصدیق کر دی۔

حسینہ نے بتایا تھا کہ رات کو ان دونوں کے جانے کے بعد ہاشم آیا تھا، وہ بہت دیر تک عالیہ کے ساتھ رہا تھا، عالیہ نے حسینہ سے اس کے لیے چائے بنوائی تھی اور پھر ہاشم چائے پی کر چلا گیا تھا۔

نسیم احمد پر بہن کی موت کا شدید اثر ہوا تھا وہ تو گم صم سا ہو گیا تھا، عالیہ کی موت کے کوئی ایک ہفتے کے بعد ہاشم، نسیم احمد کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے نسیم احمد سے کہا۔

''اب تو آپ پرسکون ہوں گے، آپ کی بہن میرے چنگل سے آزاد ہو گئی۔''

''کیوں آئے ہو؟'' نسیم احمد نے تلخ لہجے میں کہا۔

''آپ کو کچھ حقیقتیں بتانے آیا ہوں، یہ بات شاید آپ کے علم میں نہ آئی ہو کہ میں عالیہ کا شوہر اور آپ کا بہنوئی ہوں۔''

نسیم احمد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، کچھ دیر تو وہ بول ہی نہ سکا، پھر اس نے بمشکل تمام کہا ''کیا تمہاری موت میرے ہاتھوں سے لکھی ہے، جو بکواس تم کر رہے ہو اس کا نتیجہ جانتے ہو؟''

''وہ میری بیوی تھی، میرا پیار تھی وہ، اس کی موت کے بعد میں تنہا رہ گیا ہوں، ہم دونوں کا باقاعدہ نکاح ہوا تھا، بہت تھوڑے عرصے کے بعد ہم اس کا اعلان کرنے والے تھے، لیکن موت نے اسے مہلت نہیں دی، میری چہیتی بیوی تھی وہ۔''

''بکواس کر رہا ہے تو، جھوٹ بول رہا ہے، میری بہن تجھ جیسے گھٹیا شخص سے شادی کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔'' نسیم احمد نے سخت غصے کے عالم میں کہا۔

''زبان میری بھی خراب ہو سکتی ہے نسیم احمد اس لیے اپنے حواس قابو میں رکھو اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو، منہ چھپانے سے بلی نہیں بھاگ جاتی، عالیہ میری بیوی تھی میرا اس سے باقاعدہ نکاح ہوا تھا، یہ ہمارے نکاح نامے کی فوٹو کاپی ہے۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک فوٹو اسٹیٹ نکال کر نسیم احمد کے سامنے پھینک دی۔

''تم، تم جعل ساز ہو، جرائم پیشہ ہو، میں تمہیں، میں تمہیں.....'' غصے کی وجہ سے نسیم احمد کے منہ سے بات نہیں نکل پا رہی تھی۔

''میں جو کچھ بھی ہوں، عالیہ مرحومہ کا شوہر ہوں، میرا تو خیال تھا کہ تم مجھے اپنا بہنوئی تسلیم کر کے مجھ سے ہمدردی کرو گے کہ میری بیوی اور تمہاری بہن ہم سے جدا ہو گئی۔ لیکن تمہارے رویے نے ثابت کر دیا کہ تم ایک سنگدل اور بے رحم بھائی ہو، خیر میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس نکاح نامے کی رو سے میں مرحومہ کی دولت اور جائداد کے وارثوں میں سے ہوں، چنانچہ اس کے اثاثوں کی پوری تفصیل مجھے درکار ہے اور میرا حصہ مجھے دے دیا جائے۔''

''مجھے پتا چل گیا تھا کہ تمہاری نیت کیا ہے، میری بہن کسی قیمت پر تم جیسے گھٹیا آدمی سے شادی نہیں کر سکتی، اس طرح کے جعلی نکاح نامے بنا لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، اس نکاح نامے کو جعلی ثابت کرنے کے لیے آپ کو عدالت آنا ہوگا، اگر عدالت میں یہ جعلی ثابت ہو گیا تو ٹھیک ہے میں آپ سے کچھ نہیں مانگوں گا، لیکن اگر ٹھیک ثابت ہوا تو مجھے میرا حصہ دینے سے آپ انکار نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے، تم عدالت جاؤ، جہنم جاؤ، میں اس جعلسازی کے جرم میں تمہیں سزا دلائے بغیر نہیں رہوں گا، اور اور تم نے میری مرحوم بہن پر الزام لگایا ہے، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔''

''نسیم احمد! ہم دور کے صحیح لیکن رشتے دار تو ہیں..... میں نے سوچا تھا کہ میری بیوی تو دنیا سے چلی گئی، ہم اس نئے رشتے سے ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں گے، میں تمہارے ساتھ مل کر کام کروں گا، وہ پلازہ جس پر عالیہ نے کام شروع کیا ہے، میں اپنی نگرانی میں تعمیر کراؤں گا اور اس کا نام کوثر پلازہ رکھوں گا، وہ میری عالیہ کی نشانی ہوگی، اب بھی کہتا ہوں کہ ہوش سے کام لو، عدالتوں کے چکر لگانے پڑیں گے رسوائی ہوگی، اخبارات میں خبریں چھپیں

گی، اس سے بچنا چاہتے ہو تو افہام و تفہیم سے کام لو، مجھے میرا حق دے دو اور دوستوں کی طرح رہو، میں تمہارے لیے بہت کام کا بندہ ثابت ہوں گا، دوسری صورت میں ہمارا فیصلہ عدالت میں ہوگا۔''

''میں تمہیں اس فراڈ کی سزا دلوا کر رہوں گا، تم جیسے لوگوں کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں، اور اب میں تمہیں اس فراڈ کی سزا دلوائے بغیر نہیں رہوں گا، تمہیں جیل جانا ہوگا، اس طرح کے جعلی نکاح نامے بنوا کر کسی کو بلیک میل کرنے کی سزا بھگتنی ہوگی تمہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا، اور آپ کو مشورہ دوں گا کہ کسی سیانے سے مشورہ بھی کر لیں، ممکن ہے آپ کو عقل آ جائے۔ چلتا ہوں۔'' ہاشم نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد نسیم احمد پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھا رہا، اس کے چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی، ہاشم کے تیور بہت خراب تھے، ویسے بھی یہ شخص اسے شروع سے ناپسند تھا اور اسے عالیہ کی بات پسند نہیں آئی تھی کہ اس نے ہاشم جیسے اوباش شخص کو اپنے معاون کے طور پر کیوں منتخب کیا تھا جبکہ وہ جانتی تھی کہ ہاشم کی ریپوٹیشن اچھی نہیں ہے، کالج اور یونیورسٹی میں بھی وہ ناپسندیدہ شخصیت شمار ہوتا تھا۔

نکاح نامے کی فوٹو کاپی وہ چھوڑ گیا تھا، نسیم احمد نے خود کو سنبھال کر وہ کاپی اٹھائی اور اس کے اندراجات دیکھنے لگا، سب کچھ ٹھیک تھا، بظاہر اس میں کوئی خامی نہیں نظر آئی تھی، لیکن اس دور میں سب کچھ ممکن ہے۔ ہر شناختی دستاویز جعلی بنائی جا سکتی ہے، یہ نکاح نامہ جعلی ہے، ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ نسیم احمد کے سب سے بڑی راز دار اس کی بیوی تھی اس نے نویرا کو پوری تفصیل بتائی تو وہ بھی دنگ رہ گئی۔ اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے تو وہ صورت ہی سے جرائم پیشہ لگتا ہے، مجھے بھی حیرت ہے کہ عالیہ نے اس جیسے گندی فطرت کے انسان کو اتنی لفٹ کیوں دی، ویسے اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ اس نے عالیہ کو بھی بلیک میل کر کے اپنے جال میں پھانسا ہو، لیکن تم اس کی یہ بدمعاشی چلنے مت دینا۔''

''میں اس کی ایسی تیسی کر دوں گا، اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔'' نسیم احمد نے طیش کے عالم میں کہا۔

کوئی ایک ہفتے کے بعد ہاشم نے نسیم کو فون کیا۔

''میں ہاشم بول رہا ہوں۔''

''ہاں بولو۔''

''تمہاری طرف سے ہونے والی کارروائی کا انتظار کر رہا تھا، میرا خیال ہے تم نے کوئی عقل مندی کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''ہاں، کر لیا ہے۔''

''گڈ تو پھر معاملات طے کر لو، میرے حصے کی جائداد اور اثاثے میرے حوالے کر دو، ہم اچھے رشتے داروں کی طرح زندگی گزاریں گے۔''

''تم بے وقوف ہو ہاشم، تم جیسے سڑک چھاپ لفنگے اگر کسی کو بلیک میل کر سکیں تو پھر دنیا فلاش ہو جائے، میں یہ سوچ کر ابھی تک خاموش ہوں کہ شاید تمہیں عقل آ جائے لیکن لگتا ہے تمہاری شامت ہی آ گئی ہے۔''

جواب میں ہاشم کی ہنسی سنائی دی تھی پھر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب ایکشن شروع۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اس گفتگو کے کوئی پندرہ دن کے بعد نسیم احمد کو ایک وکیل کی جانب سے نوٹس موصول ہوا جس میں نسیم احمد سے کہا گیا تھا کہ یا تو وہ اپنے بہنوئی ہاشم کو اس کی بیوی کی جائداد میں سے اس کا حق دے دے ورنہ اس کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے گی۔

نسیم احمد پریشان ہو گیا، اس شام نویرا نے شوہر کو پریشان دیکھ کر پوچھا تو نسیم احمد نے وہ نوٹس اس کے سامنے رکھ دیا۔ نویرا بھی پریشان نظر آنے لگی پھر بولی ''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اب یہ کیس لڑنا ہوگا، لیکن کیا یہ ایک باقاعدہ مجرمانہ عمل نہیں ہے۔''

''سو فیصدی ہے، ہمارے قانونی مشیر شفیع الدین صاحب تو بس اب نام کے وکیل رہ گئے ہیں، بے چارے کافی ضعیف ہو گئے ہیں، بس ابو کے

دور سے ہمارے ساتھ رہے ہیں اور مجھے بھی کوئی ایسی قانونی مشکل نہیں پیش آئی جی انہیں بھاگ دوڑ کرنی پڑتی۔ اس کیس کے لیے کوئی اور وکیل کرنا پڑے گا۔"

"ایک بات ذہن میں آئی ہے، یونیورسٹی کے زمانے کی ایک دوست ہے صفورا شرنجیل، تھوڑے دن پہلے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ملی تھی، پولیس کی وردی میں اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ کیا بتاؤں، بڑے پیار سے مجھ سے ملی، اپنا کارڈ مجھے دے گئی ہے، اس سے بات کریں۔"

نسیم احمد سوچتا رہا پھر بولا۔ "کارڈ محفوظ ہے۔"

"ہاں۔" نویرا نے کہا۔

☆☆☆

صفورا نے مختصراً نویرا اور اس کے شوہر کے بارے میں شاہ میر کو بتا دیا تھا۔ دونوں نے آنے والوں کا خیر مقدم کیا۔ صفورا نے شاہ میر سے ان کا تعارف کرایا اور انہیں بیٹھنے کی پیشکش کی۔ دونوں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئے۔ رسمی گفتگو کے بعد نسیم احمد نے شاہ میر کو یہ پوری کہانی تفصیل سے بتائی تھی، پوری کہانی سننے کے بعد شاہ میر نے کہا۔

"آپ نے اس نکاح نامے کی تصدیق کی؟"

"نہیں، میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔"

"نکاح نامہ آپ کے پاس ہے۔"

"جی میں لایا ہوں۔" نسیم احمد نے جیب سے نکاح نامے کی نقل نکال کر شاہ میر کے سامنے رکھ دی، شاہ میر نے سرسری نگاہوں سے اسے دیکھا، پھر صفورا سے بولا۔

"کیس یہ ہے کہ ایک مدعی نے دعوا کیا ہے کہ اس کی مرحوم بیوی کی جائداد میں سے اس کا حصہ اسے دے دلایا جائے اور مرحومہ کے بھائی صاحب کا کہنا ہے مدعی نے جھوٹا نکاح نامہ پیش کیا ہے اور مرحومہ جوان کی سگی بہن ہے اس کی بیوی نہیں تھی اور نکاح نامہ جعلی ہے۔"

"جی سر۔" صفورا نے کہا۔

"ٹھیک ہے صفورا، کیس عدالت میں جانے دو، نسیم احمد صاحب، آپ سے ایک تعلق نکل آیا ہے، آپ چونکہ کاروباری آدمی ہیں، اس لیے ان الجھنوں کو وقت نہیں دے سکتے، ایس آئی صفورا چونکہ نویرا بھابھی کی دوست ہیں، اس لیے وہ اس کیس میں پوری دلچسپی لیں گی، ہاشم وہ کیس عدالت میں پیش کرتا ہے تو اسے کرنے دیں، آپ خاموش رہیں، عدالت سے آپ کو سمن آئے تو ہمیں بتائیں، آپ کے لیے وکیل کا بندوبست ہم خود کریں گے آپ پریشان نہ ہوں۔"

"میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں، ذاتی بات ہے، لیکن آپ سے کہنے میں مجھے حرج نہیں ہے، والد صاحب نے بہت سے پروجیکٹ شروع کر دیے تھے، ان کی موت اچانک ہوئی، اس لیے مجھے انہیں سمجھنے کا موقع نہیں ملا اور میرے کروڑوں روپے پھنس گئے ان کی پریشانی الگ ہے۔"

"خیر وہ آپ کا کاروباری مسئلہ ہے، البتہ آپ ہاشم والی پریشانی ذہن سے نکال دیں۔"

"یہ بہت بڑا سہارا دیا ہے آپ نے، میں اس کے لیے صفورا بہن کا شکر گزار ہوں۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد شاہ میر نے مسکراتی نگاہوں سے صفورا کو دیکھا اور بولا "جی مس صفورا! کیا کہتی ہیں آپ اس کیس کے بارے میں؟"

"واقعات دلچسپ ہیں، اور میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس میں دلچسپی لی ہے۔"

"دلچسپی تو لینی تھی، کیونکہ خون ناحق رنگ لایا ہے۔"

"نہیں سمجھی۔" صفورا نے شاہ میر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سیدھا سیدھا قتل کا کیس ہے۔" شاہ میر نے پرسکون لہجے میں کہا اور صفورا اچھل پڑی۔

"قتل۔" اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"ہاں، بے چاری عالیہ موت کے گھاٹ اتار دی گئی اور اس کی موت کو کسی نے کوئی اہمیت نہیں دی، کیسی عجیب بات ہے، وہ کیوں مرگئی، موت کی وجہ کیا تھی، اگر وہ ہاشم کی بیوی تھی تو ہاشم کو پتا لگانا چاہیے تھا کہ ایک تندرست عورت آخر اچانک کیسے مرگئی،

اس کے چہیتے بھائی اور بھابھی نے بھی اس تصدیق کی کوشش نہیں کی کہ آخر اس کی بہن کی موت کی وجہ کیا تھی۔ نہ ہی اس کے شوہر نے ایسی کوئی کوشش کی، بس دولت میں حصہ ملنے یا نہ ملنے کا معاملہ دونوں کو درپیش ہے۔" شاہ میر نے کہا اور صفورا پر خیال نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی، پھر چونک کر بولی۔

"اوہ مائی گاڈ اس کو کہتے ہیں تل کی اوٹ پہاڑ..... کتنی سادہ سی بات ہے تو کیا آپ کے خیال میں؟"

"یہ سو فیصدی قتل ہے۔" شاہ میر حتمی لہجے میں بولا، صفورا سوچ میں ڈوب گئی، پھر اس نے کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو اس کا مطلب ہے کہ عالیہ کو شر ہاشم نے قتل کیا ہے، اس نے کسی طرح ایک جعلی نکاح نامے کا بندوبست کیا، ایک ایسے نکاح نامے کا جسے جعلی ثابت نہ کیا جا سکے اور اس کے بعد اس نے عالیہ کو شر کو قتل کر دیا اور اب وہ اس کی جائداد میں سے حصہ چاہتا ہے۔"

"کہہ سکتی ہو، لیکن عالیہ کے اکلوتے بھائی نے جسے عالیہ کی ملازمہ نے عالیہ کی موت کی خبر دی تھی اپنی بہن کے بارے میں کیوں نہیں سوچا کہ آخر اس کی موت کیسے واقع ہوئی، اسے اس کی چھان بین تو کرنی چاہیے تھی۔"

"ارے ارے کیا مقصد؟" صفورا نے چکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی مقصد نہیں مس صفورا، آپ کے لیے ایک دلچسپ ورزش، بے شک اس کیس کی کوئی ایف آئی آر نہیں ہے، لیکن ایک انسانی زندگی چلی گئی ہے اور اس کی موت مشکوک ہے، آپ قانون کے محافظ کی حیثیت سے اس کی موت کی تفتیش کر سکتی ہیں۔"

"چیلنج۔" صفورا نے مسکرا کر کہا۔

"سو فیصدی۔"

"ٹھیک ہے استاد معظم۔" صفورا نے شوخ مسکراہٹ سے کہا۔ "میں زمان شاہ کو ساتھ لے سکتی ہوں۔"

"زمان شاہ آپ کو بخشا گیا۔"

☆☆☆

صفورا نے زمان شاہ کے ساتھ میٹنگ کی اور اسے اس معاملے کی پوری تفصیل بتائی پھر مسکرا کر بولی۔

"ہمیں اس کیس کی پوری تفصیل تلاش کرنی ہو گی زمان شاہ صاحب، شاہ میر صاحب نے کہا ہے کہ اس کیس کی پوری چھان بین کریں گویا یہ ہمارا امتحان ہے۔"

"کیس واقعی دلچسپ ہے، ہم کام کریں گے، اگر نسیم احمد اپنی بہن کی موت کا شبہ ہاشم پر ظاہر کر کے اس کی ایف آئی آر درج کرا دے تو زیادہ اچھا رہے۔"

"میں اس سے بات کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے آپ اس سے ملیں، میں ہاشم کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوں۔" زمان شاہ نے کہا، دونوں کو یہ کیس بہت دلچسپ لگ رہا تھا، زیادہ لطف کی بات یہ تھی کہ شاہ میر نے ان دونوں کو امتحان میں ڈالا تھا اور وہ اس میں اپنے جوہر دکھانا چاہتے تھے۔

صفورا نے فون پر نویرا سے رابطہ کیا اور اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا "خوشی سے آجاؤ، نسیم تو تم لوگوں کی بڑی تعریف کر رہے تھے اور ایک اور بات بھی کہہ رہے تھے۔"

"کیا؟"

"بتا دوں۔" نویرا کی آواز میں شوخی تھی۔

"بتاؤ کیا؟"

"کہہ رہے تھے کہ بڑی خوب صورت جوڑی ہے، انہوں نے دعوا کیا ہے کہ تم دونوں ضرور شادی کر لو گے۔"

"ویری گڈ، نسیم احمد صاحب نجومی بھی ہیں، اچھا میں شام کو چھ بجے آ رہی ہوں۔"

"او کے، ہم دونوں تمہارا انتظار کریں گے، شاہ میر بھی آئیں گے نا؟"

"نہیں صرف میں آؤں گی وہ مصروف ہیں۔"

شام کو ٹھیک چھ بجے صفورا ایک خوب صورت لباس میں نسیم احمد کی خوب صورت رہائش گاہ پہنچ گئی،

دونوں نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا" کیسی لگ رہی ہے میری دوست۔" نوریا نے نسیم سے پوچھا۔
" لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ پولیس جیسے خوف ناک ادارے میں ہوں گی۔"
" پر اہتمام چائے کے دوران صفورا نے اپنی آمد کی وجہ بیان کی۔
" میں خاص طور سے یہ بتانا چاہتی ہوں نسیم احمد صاحب کہ آپ کو اپنی بہن کی موت پر شبہ کیوں نہیں ہوا جبکہ وہ ایک صحت مند لڑکی تھی اور آپ چند گھنٹوں قبل اس سے ملے تھے، پھر اچانک ان کا انتقال کیسے ہو گیا، کیا اس بات کے بارے میں آپ نے نہیں سوچا۔"
نسیم احمد کے چہرے پر رنج کے آثار پھیل گئے، اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "نہیں اس کے لیے یہ پیش گوئی کر دی گئی تھی، اس وقت وہ سولہ سال کی تھی جب اسے ڈبل نمونیہ ہوا اور اس کی حالت کافی خراب ہو گئی، نمونیے کے شدید حملے سے اس کا داہنا پھیپھڑہ سکڑ گیا جو ٹھیک نہ ہو سکا۔ پھیپھڑے کی خرابی سے اسے سانس کی تکلیف ہو گئی، اسے کئی بار شدید تکلیف ہوئی اور وہ مرتے مرتے بچی، ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کوئی بھی شدید حملہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے جس کیفیت میں میں نے اسے دیکھا تھا وہ بالکل ایسی تھی جیسی دو تین بار ہو چکی تھی۔"
" گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی بہن کی موت قدرتی ہے، اسے قتل نہیں کیا گیا۔"
" نہیں صفورا صاحبہ، میری بہن طبعی موت مری ہے، مجھے خدا کو منہ دکھانا ہے، میں کسی کی جان لینے کی کوشش نہیں کر سکتا، ہاں میں، ہاشم کی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتا، اس نے یہ ڈھونگ صرف اس لیے رچایا ہے کہ عالیہ کی دولت کو ہڑپ کر سکے، دوسری بات یہ کہ بے شک عالیہ فلیٹ میں چلی گئی تھی، لیکن ہم بہن بھائی کا پیار کم نہیں ہوا تھا، اس کا موقف تھا کہ اسے یہاں رہ کر ماں باپ بہت یاد آتے ہیں اور وہ غم و اندوہ کا شکار ہو جاتی ہے، اس لیے وہ گھر سے دور ہونا چاہتی ہے، میں نے اور نوریا نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ ضدی تھی۔"
" اگر آپ سے کہا جائے کہ ہاشم کی اس سازش کے جواب میں آپ اس پر اپنی بہن کے قتل کا شبہ ظاہر کریں اور اس کے خلاف ایف آئی آر کرائیں تو کیا آپ تیار ہو جائیں گے؟"
" یہ جھوٹ ہو گا انسپکٹر صاحبہ...... میں ایک شریف ماں باپ کا بیٹا ہوں، مجھ سے یہ جھوٹ نہیں بولا جائے گا۔ میری بہن طبعی موت مری ہے، یہ بات میں جانتا ہوں۔"
صفورا کچھ دیر وہاں بیٹھ کر چلی آئی، اس نے بہت کوشش کی کہ نسیم احمد ہاشم کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرا دے، لیکن نسیم احمد اس کے لیے تیار نہیں ہوا، دوسرے دن زمان شاہ نے ہاشم کے بارے میں پوری تفصیل بتائی۔
" ہاشم کی والدہ بچپن میں مر چکی تھی، باپ ایک دکاندار تھا، ہاشم اس کا اکلوتا بیٹا تھا، اس نے تعلیم حاصل کی لیکن کالج اور پھر یونیورسٹی میں بھی وہ ایک ناپسندیدہ شخصیت رہا، باپ کی موت کے بعد اس نے باپ کے سارے اثاثے فروخت کیے اور سنگاپور چلا گیا، وہاں سے چار سال کے بعد واپس آیا اور ایک فلیٹ کرائے پر لے کر اس میں رہنے لگا، لیکن وہ اپنے اخراجات کہاں سے پورے کرتا تھا یہ بات صیغہ راز میں ہے۔"
" اب وہ کہاں رہتا ہے؟" صفورا نے پوچھا۔
" مائنز اسکوائر کے فلیٹ نمبر اٹھارہ میں، یہ فلیٹ اس نے سنگاپور سے آنے کے بعد کرائے پر لیا تھا۔"
صفورا سوچ میں ڈوب گئی، پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شاہ میر صاحب نے ٹوک کر کہہ دیا ہے کہ یہ کیس ہمیں ہی نمٹانا ہے اس لیے زمان شاہ صاحب ان سے مدد لیے بغیر ہمیں سب کچھ کرنا ہے، ویسے آپ شاہ میر صاحب کی جادوگری کے بارے میں جانتے ہیں، جب ہم اپنی ساری جدوجہد ختم کر کے کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر پائیں گے تو وہ انگلی سے اشارہ کریں گے کہ جاؤ فلاں شخص کو گرفتار کر لو، انہوں نے بڑے وثوق سے کہہ دیا کہ عالیہ کو قتل کیا گیا ہے اور

ل کا شبہ فوراً ہاشم کی طرف جاتا ہے لیکن خود عالیہ کا بھائی اس کی موت کو قتل ماننے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ وہ اسے قدرتی موت قرار دیتا ہے۔"
" آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میڈم...... ایسا لگتا ہے نسیم احمد کو زیادہ دلچسپی اس بات سے ہے کہ وہ دولت اور جائداد کو بچائیں، بہن دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی، جائداد ہاتھ سے نہیں جانی چاہیے۔ اگر ہاشم خود کو عالیہ کا شوہر ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تو کروڑوں روپے کے اثاثے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔"
" لیکن استاد محترم کو آپ جانتے ہیں زمان شاہ صاحب، انہوں نے دوٹوک کہہ دیا ہے کہ عالیہ کوثر کو قتل کیا گیا ہے، وہ نہ نسیم احمد کے حق میں ہیں نہ ہاشم کے...... اب بھلا کس کی مجال ہے کہ عالیہ کے قاتل کو روشنی میں نہ لائے۔" زمان شاہ کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ صفورا بھی گہرائی سے اپنے اگلے اقدامات پر غور کرنے لگی، پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔
" دل تو چاہتا ہے کہ شاہ میر صاحب سے اپنے اگلے قدم کے بارے میں مشورہ کیا جائے لیکن ہم نہیں کرتے، جب بات کسی طرح آگے نہیں بڑھے گی تب دیکھیں گے، میں نے ایک فیصلہ کیا ہے شاہ جی۔"
" کیا؟"
" ہم اس کیس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں پہلے ہم اس نکاح والے حصے کو دیکھیں اور یہ پتا چلائیں کہ واقعی عالیہ کا نکاح ہاشم سے ہوا تھا یا نہیں۔ پھر قتل والے معاملے کو دیکھیں گے۔"

☆☆☆

حالانکہ نسیم احمد نے صفورا کے کہنے کے باوجود ہاشم کے خلاف ایف آئی آر درج نہیں کرائی تھی، لیکن صرف نوریا کی صفورا سے دوستی کی بنیاد پر شاہ میر نے صفورا کو اپنی دوست کی قانونی مدد کی اجازت دے دی تھی اور اس لحاظ سے اس نے طارق مفتی نامی ایک نوجوان وکیل سے نسیم احمد کا تعارف کرایا تھا اور طارق کو تھوڑا سا بریف بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ ہائی کورٹ میں ہاشم کی طرف سے دائر کیے گئے دعوے کی سماعت کا آغاز ہو گیا۔ زمان شاہ اور صفورا نے بھی سادہ لباس میں اس سماعت میں شرکت کی تھی۔ طارق مفتی نے ان دونوں سے بھی اس سماعت کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ طارق مفتی نے جج کو مخاطب کر کے کہا۔
" موجودہ دور میں جعلی دستاویزات بنانا ایک فن بن چکا ہے جناب والا، یہ دستاویزات نہایت مہارت سے بنائی جاتی ہیں اور انہیں جعلی ثابت کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے، میں اس نکاح کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا کیونکہ مدعی جس خاتون سے نکاح کا دعوا کر رہا ہے وہ زندہ نہیں ہے جو اس دعوے کی تصدیق یا تردید کر سکے، لیکن میں مدعی سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"
" اجازت ہے۔" جج صاحب نے کہا۔
" ہاشم صاحب، آپ کا دعوا ہے کہ عالیہ کوثر صاحبہ کی موت سے چار مہینے قبل آپ کا ان سے نکاح ہوا تھا۔"
" جی ہاں۔" ہاشم نے جواب دیا۔
" اس کا مطلب ہے کہ آپ دونوں نے کم از کم چار ماہ کی مدت تک ازدواجی زندگی گزاری ہے۔"
" جی ہاں۔" ہاشم نے کہا۔
" گویا ازدواجی زندگی میں آپ دونوں ایک دوسرے سے ہر طرح مطمئن تھے۔"
پہلی بار ہاشم کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے، وہ ان سوالات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا، اس نے گھبرا کر اپنے وکیل نثار علی کی طرف دیکھا تو نثار علی نے فوراً صورت حال کو سنبھالا۔
" مجھے اعتراض ہے جناب والا۔ یہ بالکل غیر ضروری نوعیت کے سوالات ہیں۔"
" میرا کوئی سوال غیر ضروری نہیں ہے جناب والا، میں عدالت کو ابھی بتاؤں گا کہ یہ سوالات کتنے ضروری ہیں۔"
" اعتراض مسترد کیا جاتا ہے۔" جج نے کہا۔
" شکریہ جناب والا، تو ہاشم صاحب آپ کا یہ کہنا ہے کہ آپ دونوں ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔"

"جج ..... جی ہاں بالکل۔" ہاشم کی گھبراہٹ بدستور تھی۔

"آپ دونوں کی شادی محبت اور پسند کی شادی تھی۔"

"جی بالکل۔"

"آٹھ ماہ پیشتر، مرحومہ کے پیٹ کا آپریشن ہوا تھا، یہ آپریشن ایک پرائیویٹ ہسپتال۔" طارق مفتی کے سامنے رکھا ایک فائل اٹھا کر اس کے کچھ اوراق الٹے اور انہیں دیکھتا ہوا بولا۔ "میری کوئن ہسپتال میں ہوا تھا اور مرحومہ کے پیٹ سے رسولی نکالی گئی تھی، یہ آپریشن مشہور سرجن طاہرہ بیگم نے کیا تھا، ان کاغذات کے مطابق یہ آپریشن سترہ مارچ کو ہوا تھا اور مرحومہ کی کیفیت کافی خراب ہوگئی تھی۔

"جی بالکل۔" ہاشم نے کہا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپریشن کا یہ نشان جو ان کاغذات کے مطابق ساڑھے چار انچ لمبا تھا ان کے پیٹ پر بائیں سمت تھا یا داہنی سمت۔"

ہاشم ایک دم سٹپٹا گیا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، ابھی تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"مم، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔" اس نے قدرے توقف سے اٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے وہ عورت آپ کی بیوی تھی اور چار ماہ تک آپ اس کے ساتھ ایک نارمل ازدواجی زندگی گزارتے رہے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ اس نشان کی سمت بھول گئے ہیں یا اس نشان سے واقف نہ ہوں۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں آپریشن کے نشان سے واقف نہیں ہوں۔" ہاشم احمد نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن اس کے لہجے کی کمزوری اس کے موقف کا پتا دے رہی تھی جسے صاف محسوس کیا جا رہا تھا۔

"آپ نے یہ نشان اچھی طرح دیکھا ہوگا، آپ اس کی موجودگی کی گواہی تو دے سکتے ہیں۔"

"ظاہر ہے وہ میری بیوی تھی، میں نے اس نشان کو صاف کرنے کے لیے اسے کئی کریمیں لا کر دی تھیں۔"

"اور ان کریموں کے استعمال کا مشورہ آپ کو ڈاکٹر طاہرہ بیگم نے ہی دیا تھا۔"

"نن ..... نہیں میں نے دوسرے ڈاکٹروں سے مشورے سے یہ کریمیں لا کر دی تھیں۔"

"جن دنوں یہ آپریشن ہوا تھا آپ انہیں دیکھنے کئی بار اسپتال گئے ہوں گے۔"

"ظاہر ہے ..... ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔"

"وہ کتنے دن اسپتال میں رہی تھیں؟"

"مجھے یاد نہیں۔" ہاشم نے جواب دیا۔

"اور یہ بھی یاد نہیں کہ آپریشن کے زخم کا نشان دائیں سمت تھا یا بائیں سمت۔"

"وہ نشان تقریباً پیٹ کے درمیان میں تھا، مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔"

"لیکن یہ تو یاد ہے کہ ان کے پیٹ پر یہ نشان تھے۔"

"جی یاد ہے۔"

"شکریہ جناب والا، مجھے ہاشم سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ مدعی نے مکمل طور سے اس بات کا اقرار کیا ہے مرحومہ عالیہ کوثر کا یہ آپریشن پوری طرح ان کے علم میں ہے، یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آٹھ ماہ قبل مرحومہ عالیہ کوثر کے پیٹ کا بڑا آپریشن ہوا تھا اور ان کے پیٹ سے رسولی نکالی گئی تھی، لیکن انہیں یہ یاد نہیں کہ آپریشن کا ساڑھے چار انچ لمبا نشان بائیں سمت تھا یا دائیں سمت۔"

"آپ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں طارق مفتی صاحب۔" جج صاحب نے کہا۔

"یہی کہ مدعی بالکل جھوٹا ہے جناب والا۔" طارق مفتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مرحومہ عالیہ کوثر ایک تندرست و توانا لڑکی تھی، وہ زندگی میں کبھی کسی ہسپتال میں داخل نہیں ہوئی، اس کا کبھی کوئی آپریشن نہیں ہوا، میری کوئن ہسپتال کا اس شہر میں کوئی وجود نہیں ہے، نہ کوئی ڈاکٹر سرجن طاہرہ بیگم موجود ہیں، سب سے دلچسپ بات

یہ ہے کہ سترہ مارچ مرحومہ کی سالگرہ کا دن ہوتا ہے اور اس دن وہ ایک عمدہ تقریب کرتی تھیں جس میں ان کی دوست لڑکیاں شریک ہوتی تھیں۔ پچھلے سال بھی انہوں نے اس دن اپنی آخری سالگرہ منائی تھی جس کی گواہی وہ سب لڑکیاں دے سکتی ہیں، مرحومہ کا کبھی کوئی آپریشن نہیں ہوا نہ ہی ان کے جسم پر کوئی نشان تھا، مدعی نے بھی ان کے بدن کی جھلک نہیں دیکھی، یہ مسلسل جھوٹ بول رہے ہیں۔"

عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا، ہاشم کا چہرہ تاریک ہوگیا اور اس پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے اپنے وکیل کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن جناب والا یہ نکاح نامہ....." ہاشم کے وکیل نے پھسپھسی آواز میں کہا۔

"جعلی اور جھوٹا ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، شخص ایک دن بھی مرحومہ عالیہ کوثر کا شوہر نہیں رہا۔"

"مدعی کے اس دعوے کو خارج کیا جاتا ہے اور مدعالیہ کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو مدعی کے خلاف جعلسازی اور فراڈ کے مقدمات دائر کرسکتا ہے۔"

عدالت برخاست ہوگئی، ہاشم اپنے وکیل کے ساتھ باہر نکل گیا، طارق مفتی نے زمان شاہ اور صفورا کو مبارک باد دی، اسی وقت نوید اصفورا کے قریب آ کر اس سے لپٹ گئی۔ "تم نے شاید ہماری مشکل کو حل کرنے کے لیے ہی پولیس کی نوکری کی تھی۔" اس نے فرطِ مسرت سے کہا۔

"واقعی طارق مفتی صاحب، آپ نے کمال کر دیا، پہلی ہی پیشی میں آپ نے ہاشم احمد کو اڑا دیا، ایسا کمال کسی نے کم ہی کیا ہوگا۔" نسیم احمد نے طارق مفتی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس جعلساز کو اس نکاح نامے پر بڑا ناز تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ کوئی اسے جھوٹا ثابت نہیں کر سکے گا، لیکن آپ کی اداکاری بھی لاجواب تھی، آپ اپنے فائل کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے اس میں سے ساری باتیں نکل رہی ہیں۔"

"وہ نکاح نامہ صحیح ثابت کرسکتا تھا، وہ قاضی بھی گواہی دے سکتا تھا جس نے نکاح پڑھایا تھا، گواہ بھی مہیا کیے جا سکتے تھے اور نکاح کی پوری کارروائی صحیح ثابت کی جا سکتی تھی کیونکہ مرحومہ خود تو موجود نہیں تھیں۔"

"لیکن اتنا عمدہ پلان آپ کے ذہن میں آیا کیسے؟" نسیم احمد نے کہا اور طارق مفتی مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

ہاشم دوبارہ نہیں نظر آیا تھا، نہ ہی اس کے وکیل کی صورت نظر آئی تھی۔ اسی شام ایک عمدہ سے ہوٹل میں شاہ میر نے صفورا اور زمان شاہ کو ڈنر دیا۔ پولیس کی زندگی میں ایسے فرصت کے لمحات کم ہی ہوتے ہیں جو ان کی نجی تفریحات کے لیے ہوں۔ اس وقت صفورا اور شاہ زمان بہت خوش تھے۔ پھر انہیں ایک خوشگوار حیرت اس وقت ہوئی جب وکیل طارق مفتی بھی وہاں پہنچ گیا۔ صفورا وغیرہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔

"آپ اس نشست میں شامل ہونے کے مستحق تھے مفتی صاحب، بلاشبہ آپ نے جادوگری کی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ نے ہمیں بھی نہیں بتایا کہ آپ نے ہاشم پر کون سا داؤ مار رہے ہیں، آپ یقین کریں ہم خود بھی دنگ رہ گئے تھے۔" صفورا نے کہا۔

"کاش یہ کارنامہ میرا ہوتا۔" طارق مفتی نے کہا۔

"کیا مطلب؟" زمان شاہ چونک کر بولا اور طارق مفتی شاہ میر کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"کھانے کا انتخاب کرو۔" شاہ میر نے مینیو صفورا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہلے بتائیے۔" صفورا نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ ساری کاری گری شاہ میر صاحب کی تھی، انہوں نے ہی مجھے یہ ترکیب بتائی تھی۔" طارق مفتی نے کہا۔

"گویا ہم بلاوجہ خود کو تیس مار خان سمجھ رہے تھے، دیکھا زمان شاہ صاحب، اصل کام سر نے کیا ہے طارق مفتی صاحب شاہ میر صاحب کی زبان بولے تھے۔"

"استاد کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے، لیکن واقعی یہ بہت بڑا کارنامہ تھا، ایسے ٹیکنیک فیصلے کم ہی ہوتے ہیں

ک ہی جملے سے سارا کھیل ختم ہوگیا مجھے تو خوشی ہے ہم اتنے بڑے دماغ کی سرپرستی میں کام کررہے ہیں اور بہت کچھ سیکھ رہے ہیں۔''

''میں بھی شاہ میر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے بھی اپنے سائے میں رکھیں۔'' طارق مفتی نے کہا۔

''تم لوگ مجھے کوئی بوڑھا درخت بنانے پر تلے ہوئے ہو تو ٹھیک ہے، لیکن بہتر ہے کہ اب ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے دیا جائے کیونکہ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔'' شاہ میر نے کہا۔

''کھانے سے فراغت کے بعد کافی پیتے ہوئے شاہ میر نے کہا اب اہم مرحلہ باقی رہ گیا ہے، یعنی عالیہ کوثر کی پراسرار موت کا۔ آخر وہ تندرست لڑکی اچانک کیسے مرگئی۔''

''آپ یقین کریں یہ کیس اسٹڈی کرتے ہوئے کئی بار یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا، چونکہ آپ نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی، اس لیے میں بھی خاموش رہا۔'' طارق مفتی نے کہا۔

''ہم نے اس کیس کے دو پورشن بنائے تھے، پہلے مرحلے میں ہمیں ہاشم کے اس دعوے کو رد کرنا تھا، یعنی یہ کہ وہ عالیہ کا شوہر ہے۔ دوسرے مرحلے میں عالیہ کے قاتل کو منظر عام پر لانا تھا۔''

''آپ کے خیال میں عالیہ کو قتل کیا گیا ہے۔'' طارق مفتی نے پوچھا۔

''سو فیصدی۔''

''تب پھر اس کا قاتل ہاشم کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا، اس بدبخت نے دہرا کھیل کھیلا، صرف دولت کے حصول کے لیے اس نے پہلے عالیہ کو قتل کیا پھر جعلی نکاح نامہ بنوا کر اس کی جائداد پر قبضہ جمانے کی کوشش کی، لیکن شاہ میر صاحب کہیں اب وہ غائب نہ ہوجائے، ہمیں اس دوسرے مرحلے پر کام کرکے سب سے پہلے اسے گرفتار کرنا ضروری ہے۔'' طارق مفتی نے کہا۔

''نہیں...... وہ عالیہ کا قاتل نہیں ہے۔'' شاہ میر نے کہا۔

☆☆☆

شاہ میر کے الفاظ بم دھماکے جیسے تھے، سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے تھے۔ شاہ میر نے مینو کارڈ الٹتے ہوئے کہا۔

''ہاشم احمد اس پائے کا آدمی نہیں تھا کہ کوئی گہری چال چل سکے، اس بے وقوف نے یہ بھی نہیں سوچا کہ عالیہ جیسی تندرست لڑکی اچانک کس طرح مرگئی۔ وہ بے شک عالیہ سے قریب ہونے کی کوشش کرتا رہا اور کسی طرح اس نے عالیہ سے اتنی قربت حاصل کرلی کہ عالیہ نے اپنے پلازہ کی تعمیر کی ذمے داری اسے سونپ دی اور اسے اتنی مہلت مل گئی کہ وہ عالیہ سے مزید پینگیں بڑھائے۔ اسے آہستہ آہستہ یہ کامیابی حاصل ہوتی جارہی تھی، ایسی شکل میں اسے عالیہ کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی، اس کے لیے تو عالیہ کی زندگی زیادہ ضروری تھی۔ اگر وہ عالیہ کو ہوش و حواس کے ساتھ اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو پھر عالیہ کی دولت تک جانے کے لیے راستے صاف ہوجاتے اور وہ قانونی طور پر اس کا حق دار بن جاتا پھر اسے کیا ضرورت تھی کہ عالیہ کو قتل کرتا، پھر عالیہ قتل ہوگئی۔ اس بے وقوف نے یہ نہیں سوچا کہ ایک تندرست لڑکی اچانک کیسے مرگئی۔ بس اسے یہ خوف ہوگیا کہ اب اسے عالیہ کی دولت میں سے کچھ نہیں ملے گا اور اس نے حد سے زیادہ ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے یہ گھٹیا سی حرکت کرڈالی یعنی عالیہ کے ساتھ نکاح کا نکاح نامہ بنوا کر خود کو اس کا شوہر ظاہر کردیا۔ اس احمق کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس قسم کے جھوٹ عدالت میں آسانی سے پکڑے جاتے ہیں اور حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ دوسرا جرم عالیہ کے قاتل نے کیا، وہ ہاشم احمد سے زیادہ چالاک تھا، ہاشم احمد تو ایک ہی پیشی میں ہوا ہوگیا، لیکن عالیہ کا قاتل خوش ہے کہ......''

''آپ کے خیال میں......'' طارق مفتی نے شاہ میر کی شکل دیکھتے ہوئے کہا تو شاہ میر مسکرادیا۔

''یہ بھی آپ کو پتا چل جائے گا مفتی صاحب! ذرا میرے ان ساتھیوں کو بھاگ دوڑ کرلینے دیجیے۔''

مفتی خجل ہوگیا پھر اس نے کہا۔ ''لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے بھی اپنے قریبی ساتھیوں میں شمار کریں۔''

''میں جانتی ہوں کہ بھیڑیوں کے شکاری کو بھیڑ کے شکار سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے لیکن ہم جیسے عام لوگوں پر نظر عنایت رہنی چاہیے۔'' صفورا نے کہا اور شاہ میر مسکرادیا۔

''ارے ارے...... کوئی قصور ہوگیا ہے کیا؟'' اس نے پیار بھری نظروں سے صفورا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج چھ دن ہوگئے ہاشم کے کیس کو ختم ہوئے، دوبارہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی حالانکہ......''

''نہیں صفورا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں کو تھوڑا سا وقت دینا ضروری تھا۔ چھوٹے چھوٹے کام کرتا رہا ہوں۔ ظاہر ہے صفورا کو میں چھوٹے چھوٹے کاموں میں نہیں لگانا چاہتا، کچھ ذاتی معاملات بھی ہوتے ہیں۔''

''ذاتی معاملات۔'' صفورا نے تیکھے انداز میں کہا۔

''ظاہر ہے بھائی! پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ اپنے مستقبل کی حفاظت بھی ضروری ہوتی ہے۔ صفورا میرا مستقبل ہے۔'' شاہ میر نے کہا اور صفورا کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی پھر اس نے کہا۔

''نہیں، میں سنجیدہ ہوں۔ آپ نے خود کہا تھا کہ عالیہ کوثر کو قتل کیا گیا ہے لیکن اس کے قاتل کی حیثیت سے کوئی سامنے نہیں آیا۔ اس دن آپ نے طارق مفتی کے سامنے حتمی طور پر کہا تھا کہ ہاشم احمد ایک بے وقوف آدمی ہے، اس نے عالیہ کی دولت ہتھیانے کے لیے ایک احمقانہ کوشش کی تھی اور اس میں ناکام ہوگیا۔''

''ہاں وہ واقعی بے وقوف ہے، اس نے یہ نہیں سوچا کہ عالیہ کی موت اچانک ہوئی ہے۔ اس کی موت پر قتل کا شبہ اس پر بھی جاسکتا ہے۔ دولت کے حصول کے لیے عالیہ کی موت سے جسے فائدہ حاصل ہوتا ہے وہی عالیہ کا قاتل ہے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن کیا بات ختم ہوگئی؟'' صفورا نے کہا۔

''اس سے پہلے میں کبھی کسی قاتل کو معاف کیا ہے سوائے آپ کے؟'' شاہ میر شرارت سے بولا۔

''میرے......'' صفورا نے کہا۔

''ہاں شاہ میر کی حسین قاتلہ۔'' شاہ میر نے کہا اور صفورا جھینپ گئی پھر اس نے کہا۔

''جی نہیں مس صفورا! آپ بھول گئیں۔ میں نے کہا تھا کہ ہم نے اس کیس کے دو حصے کردیئے ہیں، پہلا حصہ ہاشم کے دعوے کا تھا اور دوسرا عالیہ کے قتل کا۔ پہلا مرحلہ مکمل ہوگیا، دوسرا باقی ہے۔''

''لیکن آپ بالکل خاموش ہوگئے۔''

''قطعی نہیں، یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟''

''آپ کا موقف ہے کہ عالیہ کا قتل ہاشم نہیں ہے۔''

''ہاں میں اپنے موقف پر قائم ہوں۔''

''تو پھر وہ کون ہوسکتا ہے، کیا آپ کے ذہن میں ہے جبکہ میرا خیال ہے کہ وہ ہاشم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا کیونکہ ہاشم کی نگاہ عالیہ کی دولت پر تھی۔ وہ اس دولت کے حصول میں ناکام ہوگیا اگر وہ واقعی بالکل ہی پاگل نہیں ہے تو اسے پہلی فرصت میں فرار ہونا چاہیے، اس امکان کے تحت کہ کہیں عالیہ کے بارے میں تحقیقات نہ شروع ہوجائے کہ اسے قتل کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ کچھ وقت اور گزار لیا جائے اس کے بعد ہم اس کیس کا دوبارہ آغاز کریں لیکن مس صفورا نے مجھے جذباتی کردیا چنانچہ میری رپورٹ پیش ہے۔ میں ان لوگوں کو اطمینان دلانا چاہتا تھا جو عالیہ کے قتل میں ملوث ہیں کہ بات ختم ہوگئی اور پولیس کو یہ شبہ باقی نہیں رہا کہ عالیہ کو قتل کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ مطمئن ہیں اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے اور کوئی کارروائی نہیں کررہے۔''

''او مائی گاڈ...... اس کا مطلب ہے کہ قاتل آپ کی نگاہ میں ہیں۔'' صفورا نے پرتجسس لہجے میں کہا۔

''ہاں کافی حد تک، ایک منٹ......'' شاہ میر نے کہا اور موبائل فون اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ نمبر مل جانے پر اس نے فون کا اسپیکر آن کردیا۔ دوسری

طرف سے آواز آنے پر اس نے کہا۔ ”ہاں کیا پوزیشن ہے؟“

”وہ اس وقت ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے خریداری کررہا ہے۔ شکل سے مطمئن نظر آتا ہے، کوئی ایک گھنٹے قبل اپنے فلیٹ سے نکل کر موٹر بائیک پر یہاں آیا ہے۔“

”دولت سارے رشتے ہڑپ کرچکی ہے، اب صرف اس سے رشتہ سب سے مضبوط اور کچھ باقی نہیں رہا۔“

”لیکن.....“

”پہلی بات.....“ شاہ میر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”نسیم احمد کا کہنا ہے جیسا کہ اسے ملازمہ حسینہ نے بتایا کہ اس رات اس کے اور اس کی بیوی نوریا کے وہاں سے آنے کے بعد ہاشم اس کے فلیٹ پر آیا تھا اور عالیہ نے حسینہ سے کہہ کر اس کے لیے چائے بنوائی تھی، گویا عالیہ کے پاس آنے والا آخری آدمی ہاشم ہی تھا۔“

”بالکل۔“

”اور اس کے بعد صبح کو عالیہ اپنے بستر پر مردہ پائی جاتی ہے۔ رات کو اسے نہ تو کوئی تکلیف تھی نہ اس کی طبیعت خراب تھی۔ اس حالت میں نسیم احمد کا کیا ردعمل ہونا چاہیے تھا۔ اسے سو فیصد ہی ہاشم پر شبہ ہونا چاہیے تھا اور خاص طور سے اس وقت جب ہاشم نے یہ دعوا کیا کہ وہ عالیہ کا شوہر ہے اور اس کی دولت میں اسے اپنے حصے کا حق دار.....“

”ہاں یقیناً۔“ صفورا کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ واقعی جب ہاشم احمد نے یہ دعوا کیا کہ وہ عالیہ کا شوہر ہے تو اسے یہ شبہ ہونا چاہیے تھا کہ کہیں اس کے حصے کی دولت کو حاصل کرنے کے لیے ہاشم نے عالیہ کو قتل کیا ہے۔“

”نہ صرف یہ بلکہ جب اس سے شبے کا اظہار کیا گیا تو اس نے آرام سے اس کی تردید کردی۔ ایسے صرف جعلی نکاح نامے والے معاملے سے دلچسپی تھی اپنی بہن کی موت سے نہیں۔“

”کمال ہے واقعی؟“

”کمال سوال پیدا ہوتا ہے اس نکتے سے؟“

”یہ کہ اپنی بہن کی موت کے سلسلے میں نسیم احمد کا رویہ قطعی غیر سنجیدہ ہے۔“

”صرف غیر سنجیدہ نہیں سوچا سمجھا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے نکتے ہیں جو اس کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔“

دفعتاً صفورا مسکرادی اور شاہ میر اسے غور سے دیکھنے لگا۔

”مس صفورا!“ اس نے سرد لہجے میں کہا اور صفورا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”جی سر!“

”آپ کی مسکراہٹ ایک قانونی جرم ہے۔“

”کیوں سر؟“

”یہ میرے ذہن سے سب کچھ بھلا دیتی ہے اور میں اس میں کھو کر رہ جاتا ہوں۔ قانون اس کے لیے آپ کو سزا دے سکتا ہے۔“

”کیا سزا دے سکتا ہے سر؟“

”مس صفورا سے کہا جائے گا کہ بغیر کسی حیل حجت کے فوراً شاہ میر سے شادی کرلیں کیونکہ ان کی مسکراہٹ قانونی عمل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔“

صفورا کی ہنسی نہ رک سکی، پھر بولی۔

”میں معافی چاہتی ہوں۔“

”کیوں مسکرائی تھیں آپ؟“

”یہ سوچ کر کہ آپ اتنے ذہین کیوں ہیں۔“

”تو میرے لیے سزائے شادی تجویز فرمادیجیے۔“

”عدالت سے درخواست کی جائے گی، فی الحال نسیم احمد کا معاملہ درپیش ہے ویسے شاید آپ نے یہ کیس مجھ سے اور زمان شاہ سے واپس لے لیا ہے۔“

”ہرگز نہیں..... آپ نے بڑے اعتماد سے ہاشم کو کنواں سے اڑا دیا ہے۔ وہ بے چارہ اپنے دولت مند بننے کی تمام آرزوؤں کو دفن کرکے مایوس ہوکر بیٹھ گیا ہے لیکن اس کے باوجود اگر یہ عالیہ کو قتل میں اس کا ہاتھ نکل آیا تو وہ ہماری گرفت سے دور نہیں جاسکے گا۔“

”تمام نکات اسی امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عالیہ کے قتل کا تعلق اس کے بھائی سے ہے اور اب ہمیں اسی لائن پر کام کرنا ہے۔“ صفورا نے کہا۔

”لیکن کام اتنا آسان نہیں ہوگا مس صفورا! آپ ان معاملات کی روشنی میں کام شروع کریں، ویسے آپ کو دس منٹ دیے جاتے ہیں۔ آپ غور کرکے بتائیے کہ اگر آپ نسیم احمد کو اپنی بہن عالیہ کے قاتل کا درجہ دینا چاہیں تو کن نکات پر غور کریں گی۔“

صفورا نے مسکرا کر گردن ہلائی اور سوچ میں ڈوب گئی۔

”آنکھیں بند کرکے سوچیں اس میں آپ کو بھی آسانی ہوگی اور مجھے بھی۔“ شاہ میر نے کہا۔

”وہ کیسے؟“

”آپ کو آسانی یہ ہوگی کہ آنکھیں بند کرکے سوچنے سے ٹیکنیکی کا احساس ہوتا ہے اور ذہن ٹھیک کام کرتا ہے۔ مجھے یہ آسانی ہوگی کہ میں جن نظروں سے بھی آپ کو دیکھنا چاہوں، دیکھتا رہوں گا۔ مجھے شرم نہیں آئے گی۔“ شاہ میر نے کہا اور صفورا نے ہنس کر آنکھیں بند کرلیں۔ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر صفورا نے کہا۔

”دس منٹ پورے ہوگئے۔“

”ارے نہیں، ابھی دو منٹ ہوئے ہیں۔“ شاہ میر نے کہا اور صفورا نے ہنس کر آنکھیں کھول دیں۔

”مجھے پتا ہے دس منٹ سے زیادہ ہوگئے۔ خیر اب آپ میری رہنمائی کریں گے استاد محترم کہ میں نے ٹھیک سوچا ہے یا غلط، نمبر ایک بتاؤں۔“

”جی ارشاد۔“

”نمبر ایک۔ وہ ملازمہ جو بلال احمد کی خاندانی ملازمہ ہے اور عالیہ خاص طور سے اپنے ساتھ لے آئی تھی، ہم اس کے ذریعے گھر کے اندرونی حالات بھی معلوم کرسکتے ہیں۔ اس سے بہت سی باتوں کا انکشاف ہوگا۔ دوسرا وہ ڈاکٹر جسے لے کر نسیم احمد عالیہ کے فلیٹ پر گیا تھا اور ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کردی تھی۔ ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آئی ہے۔“

”کیا؟“

”نسیم احمد نے عالیہ کی موت کی وجوہات کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ نمونیا بگڑ جانے سے اس کا ایک طرف کا پھیپھڑا سکڑ گیا تھا جس کی وجہ سے اسے سانس کی تکلیف ہوگئی تھی اور اس بات کا خدشہ تھا کہ یہ کیفیت کسی بھی وقت جان لیوا ہوسکتی ہے۔“

”ویری گڈ، قابل تعریف۔“ شاہ میر نے کہا۔

”تو پھر کیا حکم ہے استاد محترم!“ صفورا بولی۔

”حسینہ عالیہ کی موت کے بعد ظاہر ہے واپس نسیم احمد کے پاس آگئی ہوگی۔ اس سے وہیں ملاقات کی جاسکتی ہے۔“

”نسیم احمد اگر اپنی بہن کا قاتل ہے تو حسینہ کی طلبی پر ہوشیار ہوجائے گا، اسے شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم عالیہ کے قتل کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔ اس کے لیے نسیم احمد سے کہا جائے کہ پولیس کو علم ہوا ہے کہ ہاشم احمد نے کچھ بڑے لوگوں سے سفارش کروا کر اپنے کیس کو دوبارہ شروع کرنے کی تیاریاں کی ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ کارروائیوں کے لیے حسینہ سے معلومات درکار ہیں۔ حسینہ سے بھی اس بارے میں جو سوالات کیے جائیں وہ ایسے ہوں کہ نسیم احمد کو ایسا کوئی شبہ نہ ہونے پائے۔“

”بہت شکریہ! اور ڈاکٹر کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟“ صفورا نے پوچھا۔

”اسے ابھی نہ چھیڑا جائے۔“ شاہ میر نے کہا۔

نسیم احمد نے فون پر یہ بات سن کر بڑی نیاز مندی سے کہا۔ ”آپ نے میری جس طرح مدد کرکے اس ملعون کی سازش کو ناکام کردیا ہے۔ اس کا احسان میں زندگی بھر نہیں اتار سکوں گا۔ آپ حکم دیں حسینہ کو تھانے لے آؤں۔“

”آپ کسی ملازم کے ذریعے اسے تھانے بھجوادیں، خود تکلیف نہ کریں۔“

نسیم احمد نے خود حسینہ کو تھانے پہنچادیا۔ حسینہ بڑی طرح گھبرائی ہوئی تھی لیکن صفورا اس سے بہت نرمی سے پیش آئی۔

”تم بالکل پریشان نہ ہو حسینہ! تمہیں معلوم نہیں

عالیہ کوثر میری دوست بھی تھی۔ ایک عرصے تک ہم دونوں ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ تم کتنے عرصے سے عالیہ کے گھر پر کام کرتی رہی ہو۔"

"بیس سال جہاں آراء بی بی کی خدمت کی ہے، ان کے ساتھ اچھے برے وقت دیکھے ہیں۔ بلال احمد جی کہتے تھے کہ حسینہ تو اس گھر کی نوکرانی نہیں میری بہن ہے۔ بڑا خیال رکھا انہوں نے ہمارا جی۔"

"ہاں یہی سنا ہے، بہت اچھے آدمی تھے۔ عالیہ کی موت کا مجھے بھی بڑا دکھ ہے۔ بہت اچھی تھی۔ کیا وہ زیادہ بیمار رہنے لگی تھی؟"

"پوری تندرست تھی۔ کبھی بخار تک نہیں آتا تھا انہیں۔ ایسے چٹ پٹ ہو گئیں کہ ہائے ہائے۔" حسینہ نے دکھ سے کہا۔

"سنا ہے ایک بار نمونیہ ہو گیا تھا انہیں، اس کے بعد سانس کی تکلیف ہو گئی۔"

"ایں...... یہ تم سے کس نے کیا کہہ دیا پولیس بی بی! ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ تو تندرست تھیں، ہر سال بڑی دھوم دھام سے اپنی سالگرہ کرتی تھیں۔ دوستوں کو بلاتی تھیں۔ بڑا اہتمام ہوتا تھا گھر میں۔"

"مگر نسیم احمد کی شادی کے بعد گھر کے وہ حالات نہیں رہے، یہ بات مجھے معلوم ہے۔" صفورا نے کہا۔

"ہا...... خراب تو میاں جی کی موت کے بعد سب کچھ ہو گیا تھا اور جہاں آراء بی بی کی موت نے کھیل پورا کر دیا۔ بس پھر عالیہ بی بی کی اس گھر میں کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

"مجھے اندازہ تھا کہ اس بات کا حسینہ کہ عالیہ نے اپنی خوشی سے اپنے ماں باپ کا گھر نہیں چھوڑا۔ ایسی ہی کچھ باتیں تھیں کہ وہ وہاں سے فلیٹ میں گئی۔"

"بس ہم کیا منہ کھولیں، کون خوشی سے ماں باپ کا گھر چھوڑتا ہے۔" حسینہ نے کہا۔

"کچھ مجھے بتاؤ، ہوا کیا تھا؟" صفورا نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

"نہیں جی! نوکر نوکر ہی رہتے ہیں۔ ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ عالیہ بی بی وہاں خوش نہیں تھیں۔ بھائی ہی بیوی کا ساتھ دینے لگے تو پھر بہن کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" صفورا نے کہا لیکن اس کے بعد حسینہ نے ان کے خلاف منہ نہیں کھولا، البتہ اس سے کچھ ایسی باتیں ضرور معلوم ہوئیں جو بے حد کارآمد تھیں۔ خاص طور سے عالیہ کی ایک جگری دوست صفیہ کے بارے میں معلوم ہوا جو عالیہ کی سب سے قریبی دوست تھی۔ حسینہ سے اس کا پتا بھی معلوم ہو گیا۔ وہ کسی اسکول میں ٹیچر تھی اور گورنمنٹ کوارٹر میں رہتی تھی۔ صفورا نے یہ پتا خاص طور سے نوٹ کیا تھا۔ صفورا نے شاہ میر کو رپورٹ پیش کی تو اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

"ویری گڈ۔ اس کا مطلب ہے کہ حسینہ سے ملاقات بہت کامیاب رہی اور مس صفورا مظلوم عالیہ کے قاتل کی گردن پھانسی کے پھندے تک بڑی تیز رفتاری سے لا رہی ہیں۔"

"لیکن بہت دکھی ہوں۔" صفورا نے کہا۔

"ہاں صفورا! رشتے بہت تیزی سے فنا ہوتے جا رہے ہیں۔ خود غرضی کا عفریت ہر طرف پنجے گاڑھ چکا ہے اور اب ہر رشتہ مشکوک ہو گیا ہے۔ کون کیا کر بیٹھے کچھ پتا نہیں چلتا۔"

"اب ہمارے سامنے صفیہ ہے، جو اسکول ٹیچر ہے۔"

"عالیہ کی موت کے بارے میں اسے پتا تو چل گیا ہوگا لیکن وہ سامنے نہیں آئی۔"

"ظاہر ہے کون اپنی گردن پھنساتا ہے۔" شاہ میر نے کہا۔

حسینہ سے ملاقات کے دوسرے دن ہی نسیم احمد تھانے آ کر شاہ میر سے ملا۔

"میں اس مردود کی کارروائیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی شرمناک شکست کے بعد بھی وہ ایسی کوششیں کر رہا ہے۔"

"جی نسیم صاحب! اسی لیے میں نے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو ہاشم کے خلاف جعل سازی اور فریب کاری کا مقدمہ قائم کر سکتے ہیں۔ طارق مفتی جیسا قابل وکیل آپ کی بھرپور معاونت کرے گا۔"

"میں ایک مصروف کاروباری آدمی ہوں انسپکٹر صاحب! ایسے مقدمات کے لیے میرے پاس وقت کہاں ہے، آپ بے حد نیک نفس انسان ہیں، اگر وہ دوبارہ ایسی کوئی مذموم کوشش کرے تو پھر پولیس میری مدد کرے۔"

"ٹھیک ہے، آپ فکر نہ کریں۔ میں جائزہ لے رہا ہوں۔" شاہ میر نے کہا لیکن اس وقت بھی اس نے بخوبی اندازہ لگایا تھا کہ نسیم احمد اپنی اکلوتی بہن کی موت کے تذکرے کو بھی درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔

☆☆☆

گورنمنٹ کوارٹر کے ایک بڑے پلاٹ پر صفورا نے اپنی چھوٹی سی خوب صورت کار روکی اور نیچے اتر کر اسے لاک کر دیا۔ تھوڑے فاصلے پر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ صفورا آگے بڑھ گئی۔ خوب صورت لباس میں وہ بے حد پیاری اور اسمارٹ لگ رہی تھی، چند قدم آگے بڑھ کر اس نے ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے کو اشارہ کر کے بلایا تو وہ جھجکتا ہوا پاس آ گیا۔

"بیٹے مجھے کوارٹر نمبر ایک سو بیس میں جانا ہے، ایس ایک سو بیس میں۔"

"وہاں کس سے ملنا ہے؟" لڑکے نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

"وہ اسکول ٹیچر مس صفیہ ہیں۔"

"آیئے...... میں آپ کو لے چلو، آیئے......" آگے بڑھتے ہوئے لڑکے نے کہا۔ "وہ میری باجی ہیں۔ میں وہیں رہتا ہوں۔"

"ارے واہ، یہ تو بڑی خوشی ہوئی مجھے...... دیکھ لو میں نے تمہیں ہی بلایا کیونکہ تم مجھے سب سے اچھے بچے لگے تھے۔"

کوارٹر زیادہ دور نہیں تھا۔ دروازہ بھی بند نہیں تھا۔ لڑکے نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"آیئے۔"

"نہیں...... تم اندر جا کر مس صفیہ کو بتاؤ کہ کوئی ان سے ملنے آیا ہے؟"

"کیا نام بتاؤں؟"

"صفورا۔"

لڑکا اندر چلا گیا۔ دو منٹ کے بعد ہی دروازے سے ایک قبول صورت اور بردبار سی لڑکی نظر آئی جس نے آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ صفورا کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔

"میرا نام صفیہ ہے۔" اس نے کہا۔

"مجھے آپ ہی سے کام ہے مس صفیہ۔" صفورا نے مسکراتے ہوئے کہا اور صفیہ نے اسے اندر آنے کا اشارہ کر دیا۔ دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر ڈرائنگ روم بنا ہوا تھا جس میں صاف ستھرے صوفے اور چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، صفورا اس کے اشارے پر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بغیر اطلاع آنے کی معافی چاہتی ہوں۔ آپ سے ملنا بہت ضروری تھا یقیناً آپ مصروف ہوں گی۔"

"ہماری ملاقات پہلے نہیں ہوئی، آپ کا نام بھی میں نے اپنے بھائی کے منہ سے پہلی بار سنا ہے۔"

"یہ میرا کارڈ ہے۔" صفورا نے اپنا سروس کارڈ نکال کر صفیہ کی طرف بڑھا دیا جس میں وہ پولیس کی وردی میں تھی، البتہ کارڈ دیکھ کر چونکی پھر سرسراتی آواز میں بولی۔

"پولیس۔"

"ہاں مس صفیہ! لیکن آپ کوئی غلط بات نہ سوچیں۔ مجھے آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔"

"کس بارے میں۔"

"آپ کی دوست عالیہ کوثر کے بارے میں۔"

"اوہ......" صفیہ نے ایک لمبی سانس لی، اس کی کیفیت کچھ بحال ہو گئی تھی۔ "آپ کے لیے چائے یا کوئی......"

"نہیں پلیز...... میں ڈیوٹی پر ہوں۔ اسی وقت کچھ نہیں...... ہاں اگر آپ نے دوبارہ مجھ سے ملنا پسند تو کیا دوبارہ بھی۔"

"کیوں نہیں...... آپ یقین کریں یہ جان کر

کہ آپ ایک پولیس آفیسر ہیں، ایک خوش گوار حیرت ہوئی ہے۔ پولیس میں کوئی مرد ہو یا خاتون ایک سخت اور کرخت چہرہ تصور میں آتا ہے۔ تیز چمک دار آنکھیں اور دھواں اگلتے ہوئے ہونٹ، لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ اس لباس میں بے مثال اور تو اور پولیس کی وردی میں بھی خوب صورت.....''

''بہت شکریہ۔ آپ مجھے دوستوں کی طرح میرے سوالات کے جواب دیں گی۔''

''ضرور..... میں نے اخبارات میں کچھ تفصیلات پڑھی ہیں۔ عدالت نے بالکل صحیح فیصلہ کیا، اس بدکار شخص نے صرف عالیہ کی دولت ہتھیانے کے لیے یہ ڈرامہ کیا تھا۔ عالیہ نے کبھی اسے اس قابل نہیں سمجھا کہ وہ اس سے شادی کرلے، اگر وہ ایسا سوچتی بھی تو میرے علم میں ہوتا۔''

''خیر..... وہ قصہ تو ختم ہوگیا لیکن عالیہ کی موت اچانک کیسے ہوگئی؟''

''یہی پتا چلا تھا کہ اچانک اس کی حرکت قلب بند ہوگئی۔''

''ہر کیفیت کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں، عالیہ کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ ایک تندرست لڑکی تھی۔'' صفورا نے کہا۔

''سو فیصدی..... وہ کبھی بیمار نہیں ہوتی تھی، ہشاش بشاش رہتی تھی۔ اسے کبھی ایسی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔''

''میں آپ سے کھل کر کہوں مس صفیہ! پولیس کو یقین ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔'' صفورا نے کہا اور صفیہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا، وہ کسی قدر خوف زدہ نظر آنے لگی پھر سرسراتی آواز میں بولی۔

''قتل.....''

''ہاں حالات اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ تندرست تھی، اسے کوئی پرانی بیماری نہیں تھی۔ اس کی موت کی رات اس کے بھائی اور بھابھی اس سے مل کر آئے اور دوسری صبح وہ مردہ پائی گئی۔''

''اوہ ہاں..... تو کیا.....''

''جی کہیں، کیا کہہ رہی تھیں آپ؟''

''کیا اس بدبخت نے، میرا مطلب ہے ہاشم نے دولت کے حصول کے لیے اسے قتل کردیا۔ اوہ..... ممکن ہے اس نے عالیہ کو شادی کے لیے مجبور کیا ہو اور جب عالیہ نے شادی سے انکار کردیا تو اس نے جھلا کر عالیہ کو قتل کردیا اور پھر جعلی نکاح نامے کا ڈھونگ رچا کر اس کی دولت حاصل کرنا چاہی، اف میرے خدا.....''

''لیکن صفیہ! عالیہ کے بھائی اور بھابھی اس سلسلے میں تعاون نہیں کررہے۔ قانون کسی قاتل کو کبھی معاف نہیں کرتا لیکن اس کے خلاف ثبوت ضروری ہوتے ہیں۔ مجھے قاتل کو منظر عام پر لانے کے لیے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''آپ کے خیال میں ہاشم نے ہی عالیہ کو قتل کیا ہے نا؟'' صفیہ نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

''میں نے کہا نا پولیس ثبوت کے بغیر کسی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی۔''

''گویا اس کا قاتل کوئی اور بھی ہوسکتا ہے۔'' صفیہ نے پھر خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ عالیہ کی موت کس طرح ہوئی۔ کیا وہ واقعی دل کے دورے سے مری، جیسا کہ ان لوگوں کی فیملی ڈاکٹر نے کہا یا اس کی موت کی وجہ کچھ اور تھی۔ پولیس اس بارے میں کچھ اور اقدامات پر غور کررہی ہے۔''

''کیا؟'' صفیہ نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

''عالیہ کی لاش کو قبر سے نکال کر پوسٹ مارٹم کرنا پڑے گا۔ اگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس کی موت کا سبب کچھ اور ہے تو پھر ان معاملات کو ہم آگے بڑھائیں گے۔ ظاہر ہے کہ عالیہ کو قتل کرنے والا یا قتل کروانے والا کوئی ایسا ہی شخص ہوسکتا ہے جسے عالیہ کی موت سے کوئی فائدہ پہنچنے والا ہو۔''

''اوہ ہاں میں سمجھ گئی۔ آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں، واقعی بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ یقین کریں وہ مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز تھی، اگر اسے واقعی قتل کیا

گیا ہے تو اس کے قاتلوں کو پھانسی لٹکتا دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔ انہیں بھی مرنا چاہیے۔''

''اس کے لیے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔ ممکن ہے تمہیں اس سے خوف محسوس ہو لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ پولیس تمہاری بھرپور حفاظت کرے گی اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''میں تیار ہوں۔'' صفیہ نے کہا۔ اس کے بعد صفورا ایک گھنٹے تک صفیہ سے باتیں کرتی رہی تھی اور صفیہ نے اسے جو کہانی سنائی تھی، وہ اس کہانی سے بالکل مختلف تھی جو.....

☆☆☆

نسیم احمد دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے شدید غصے کے عالم میں اپنی بیوی نوریا سے کہا۔

''یہ صفیہ غیاث احمد وہی ہے نا جو اسکول ٹیچر تھی۔''

''کون صفیہ؟'' نوریا نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ارے وہی جو اکثر عالیہ کے پاس آتی رہتی تھی۔''

''ہاں کچھ یاد تو ہے، کیوں کیا ہوا؟'' نوریا نے پوچھا۔

''اس نے حکام کو درخواست دی ہے جس میں اس شبے کا اظہار کرتے ہوئے کہ اس کی گہری دوست عالیہ کو شر کو قتل کیا گیا ہے۔ متعلقہ حکام سے درخواست کی گئی ہے کہ عالیہ کوثر کی قبر کھود کر اس کی لاش نکالی جائے اور اس کا پوسٹ مارٹم کیا جائے، اس نے ہاشم پر عالیہ کے قتل کا شبہ ظاہر کیا ہے۔''

نوریا کے ہونٹ سکڑ گئے پھر اس نے کہا۔

''اب؟''

''دیکھتا ہوں۔'' نسیم احمد نے غصے سے کہا۔

اس نے صفیہ کے گھر کا پتا معلوم کیا اور دونوں میاں بیوی صفیہ کے گھر پہنچ گئے۔

''یہ آپ نے کیا کیا ہے؟'' نسیم احمد نے طیش کے عالم میں کہا۔

''عالیہ کے بھائی کی حیثیت سے میں آپ کا بے حد احترام کرتی ہوں۔ میں نے وہ کیا ہے جو آپ نے نہیں کیا۔'' صفیہ نے بے خوفی سے کہا۔ صفورا نے اسے دوبارہ ملاقات کر کے پوری طرح بریف کردیا تھا اور در پردہ ساری سپورٹ اسی کی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' نسیم احمد نے کہا۔

''یہی کہ اس کی موت قدرتی نہیں تھی۔ ہاشم نے پوری سازش کر کے اسے قتل کیا ہے۔ اسے باسانی آزادی دے گئی جبکہ وہ عالیہ کا قاتل ہے۔ میں اس کے قاتل کو پھانسی کے پھندے تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑوں گی۔''

''تم ہوتی کون ہو اس کی ہمدرد۔'' نوریا نے شدید غصے سے کہا لیکن نسیم احمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کردیا اور بولا۔

''آپ سے کس نے کہا تھا ایسی درخواست دینے کے لیے، ایسا کیوں کیا آپ نے؟''

''کسی نے بھی نہیں، وہ میرے لیے بہنوں جیسی تھی میری دوست کو قتل کیا گیا۔''

''یہ سراسر بے ہودہ خیال ہے، وہ میری بہن تھی۔ مجھ سے زیادہ اس کا ہمدرد اور چاہنے والا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جب میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ اس کی موت قدرتی تھی تو آپ کیوں اس قسم کی باتیں کررہی ہیں۔''

''یہ آپ کا خیال ہے اور وہ میرا خیال ہے۔'' صفیہ نے بے خوفی سے کہا۔

بعد کی ملاقاتوں میں صفورا نے اسے آگاہ کردیا تھا کہ نسیم احمد کی طرف سے یہ ری ایکشن ہوگا وہ فکر نہ کرے اور اس وقت ایسا ہی ہورہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ ہاشم نے ہی اسے قتل کرنے کے بعد نکاح وغیرہ کا ڈرامہ رچایا تھا۔''

''نہیں..... ایسا کچھ نہیں ہوا میں اور نوریا اس کی موت کی اطلاع ملنے پر وہاں اکیلے نہیں گئے تھے۔ ہمارے ساتھ ہمارے فیملی ڈاکٹر اشتیاق احمد بھی گئے تھے۔ انہوں نے عالیہ کی لاش کا اچھی طرح جائزہ لیا

تھا اور تصدیق کی تھی کہ اس کا انتقال اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہوا ہو، لیکن میرے دل کو تسلی نہیں ہے، پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی اصلیت ظاہر کرے گی۔"

"تم ہم سے زیادہ ہمدرد ہو اس کی، ہمارے دل کو تسلی ہے تمہارے دل کو نہیں۔" نویرا سے پھر نہ رہا گیا۔

"اپنے اپنے دل کی بات ہے، آخر آپ لوگ اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔ اگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ٹھیک نکلتی ہے بات ختم ہو جاتی ہے، ورنہ ہاشم احمد کو سزا ملے گی۔"

"ہم یہ نہیں چاہتے۔" نسیم احمد نے کہا۔

"کیوں؟" صفیہ نے پوچھا۔

"اس سے میری بہن کی لاش کی بے حرمتی ہوگی، میں اس کی لاش کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہونے دینا چاہتا۔"

"لاش تو لاش ہوتی ہے نسیم بھائی! لیکن قاتل کا مکروہ چہرہ سامنے آنا چاہیے۔" صفیہ کے لہجے میں خود بخود نفرت پیدا ہو گئی۔

"میں چاہتا ہوں صفیہ کہ تم وہ درخواست واپس لے لو۔ عالیہ کے موت کے بعد تم بھی میرے لیے بہن جیسی ہو، میں تمہارے اس جذبے سے بہت متاثر ہوا ہوں، لیکن اب گڑے مردے نہ اکھاڑو۔"

"نہیں نسیم بھائی! میں عالیہ کے قاتل کو پھانسی کا پھندا پہنائے بغیر سکون سے نہیں بیٹھوں گی۔ آپ کو تو میرے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ وہ میری دوست کو قتل کر کے سکون سے بیٹھ گیا ہے اور آپ میرے اس عمل کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اسے بچانا چاہتے ہیں۔"

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو، میں اسے کیوں بچانا چاہوں گا۔ میں بس اپنی بہن کی لاش کی بے حرمتی نہیں چاہتا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں اور اب میرے دل میں تمہارے لیے اور جگہ پیدا ہو گئی ہے۔ اپنی درخواست واپس لے لو میری بہن! میرے پاس آجایا کرو، اپنی عالیہ کے حوالے سے میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گا، کبھی کوئی تکلف نہ اٹھانا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ، لیکن عالیہ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانا میرا فرض ہے۔"

"گویا تم درخواست واپس لینے کے لیے تیار نہیں ہو۔"

"نہیں نسیم بھائی!"

نسیم احمد اسے گھورتا رہا پھر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے نویرا کی طرف رخ کر کے کہا۔

"چلو۔" اور نویرا بھی کھڑی ہو گئی۔ دونوں بغیر کسی سلام دعا کے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

صفیہ کے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ نسیم احمد کا انداز اسے بے حد خطرناک لگا تھا۔ صفورا نے جو خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے خود نسیم احمد اپنی بہن کا قاتل ہو، اگر ایسا ہے تو وہ کسی اور کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ وہ ایک دولت مند آدمی ہے، اپنی زندگی بچانے کے لیے وہ کسی کرائے کے قاتل سے صفیہ کو بھی قتل کرا سکتا ہے، اب کیا کروں۔

ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی۔ نسیم احمد اور نویرا نکل کر گئے ہی تھے کہ اس کے موبائل پر اشارہ موصول ہوا، اس نے یہ نمبر دیکھا تو یہ نمبر صفورا اسے دے کر گئی تھی۔

"ہیلو۔" فون آن کر کے اس نے کہا۔

"صفورا بول رہی ہوں۔"

"جی میں صفیہ ہوں۔"

"ہاں صفیہ معلوم ہے مجھے، لیکن کیا بات ہے۔ تمہاری آواز لرز رہی ہے۔" صفورا نے کہا۔

"میں خوف زدہ ہوں۔" صفیہ نے کہا۔

"کیوں؟" صفورا نے پوچھا تو صفیہ نے نسیم احمد سے ہونے والی تمام باتیں اور آخر میں اس کے جانے کے انداز اور اپنے خدشے کے بارے میں بتایا تو صفورا نے کہا۔

"تم نے دیکھا کہ ان لوگوں کے جاتے ہی میں نے تمہیں فون کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہاری پوری پوری نگرانی اور حفاظت کی جا رہی ہے۔ اپنے بائیں سمت کی کھڑکی سے باہر دیکھو، وہاں دو رائفل بردار شوٹر نیلے رنگ کی کار میں بیٹھے ہیں۔ تمہارے لیے گھر سے لے کر اسکول اور ہر اس جگہ تک کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا ہے جہاں تم جاؤ گی۔ اس کے علاوہ فکر مت کرو، وہ لوگ اس حد تک نہیں جائیں گے کیونکہ تم عالیہ کی موت کے سلسلے میں فریق بن چکی ہو۔ تمہیں ذرا بھی نقصان پہنچا تو نسیم احمد کی گردن پھنسے گی، وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ ایسی حرکت کرے۔"

"بس ایسے ہی مجھے ڈر لگا تھا۔" صفیہ نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

پھر دوسرے دن نسیم احمد اور نویرا دوبارہ صفیہ کے پاس گئے۔ دونوں کے انداز بدلے ہوئے تھے۔ نسیم احمد نے کہا۔

"میں اور نویرا تم سے بہت متاثر ہیں صفیہ! کل نویرا تم سے کچھ تلخ ہو گئی تھی جس پر وہ شرمندہ ہے۔ اب وہ کہتی ہے کہ کاش اسے بھی صفیہ جیسی مخلص دوست مل جائے۔ میں نے کہا کہ صفیہ میری بہن جیسی ہے۔ اسے عالیہ کی جگہ دے دو، چنانچہ میں تمہیں بتانے آیا ہوں۔ کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت، کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتانا۔ اب تم میری عالیہ کی جگہ ہو۔"

"میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے نسیم بھائی شکریہ۔" صفیہ نے کہا۔

"یہ ایک چھوٹا سا تحفہ رکھو۔" نسیم احمد نے براؤن رنگ کا ایک لفافہ نکال کر صفیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" صفیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"کھول کر دیکھ لو۔" نسیم احمد نے کہا۔ لفافے میں پچاس ہزار کے نوٹ تھے، صفیہ نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر بولی۔

"لیکن مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پیسہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے صفیہ! حماقت مت کرو۔ آئندہ بھی تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہا کرو۔ میرے پاس آیا جایا کرو اور ہاں، نسیم کو پریشان مت کرو۔ یہ ساری رات اپنی بہن کو یاد کر کے روتے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عالیہ ان کے خواب میں آئی تھی اور رو رو کر کہہ رہی تھی کہ خدارا میری لاش کی بے حرمتی نہ کرو۔" نویرا نے لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔

"خواب صرف خواب ہوتے ہیں اور مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر مجھے کبھی کوئی ضرورت ہوئی تو میں آپ سے ضرور کہوں گی، شکریہ۔"

صفیہ نے کسی قیمت پر ان کی بات نہیں مانی اور وہ اس کوشش میں بھی ناکام ہو گئے۔ اس کے بعد عالیہ کی قبر کھودی گئی۔ لاش نکال کر اس کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا اور پتا چل گیا کہ عالیہ کی موت ایک انتہائی مہلک زہر سے ہوئی ہے۔

☆☆☆

"جائے استاد خالی است، یہاں آ کر ہم پر ٹھس ہو گئے ہیں، نہ میری اور نہ زمان شاہ کی سمجھ میں آ رہا ہے کہ اب کیا کریں۔" صفورا نے شاہ میر سے کہا۔

"بات صرف استاد کی استادی کی نہیں ہے، معاملہ نصف بہتر کا بھی ہے۔ ہماری مجال ہے کہ ہم آپ سے انحراف کریں۔" شاہ میر نے کہا۔

"بتائیں نا اب کیا کروں؟" صفورا نے لاڈ سے کہا۔

"گیدڑ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب اس کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ اس محاورے کو یوں استعمال کریں کہ جب محترمہ نویرا کے برے دن آئے تو وہ صفورا شرجیل کی طرف دوڑ پڑیں اور انہیں اپنی تعلیمی دور کی دوست یاد آ گئی جو پولیس افسر بن چکی تھی۔ وہ ہاشم کے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے جو جعلی کہانی بنا کر لائی تھیں اس کی پول کھل گئی اور اب وہ اصل کہانی سنائیں گی۔" شاہ

میر نے کہا۔

''یعنی۔'' صفورا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''نسیم احمد اور نویرا کو عالیہ کوثر کے قاتلوں کی حیثیت سے گرفتار کرلو۔'' شاہ میر نے کہا۔

زمان شاہ ان لوگوں کی گرفتاری کے سلسلے میں چنگیز خان تھا جو خود کو کوئی بڑی چیز سمجھتے تھے۔ نسیم احمد نے بھی بڑی اکڑفوں دکھائی تھی۔ اپنی حیثیت کا حوالہ دیا تھا لیکن اپنا ہی نقصان کرایا۔ زمان شاہ اسے ہتھکڑیاں ڈال کر گھسیٹتا ہوا لایا تھا۔ ان دونوں پر الزام تھا کہ انہوں نے اپنے باپ بلال احمد کی ساری دولت اور جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے عالیہ کوثر کو قتل کیا ہے۔ ان دونوں کے خلاف استغاثہ مرحومہ کی جگری دوست صفیہ نے دائر کیا تھا اور وکیل طارق مفتی استغاثے کی پیروی کررہا تھا۔

ان دونوں کی گرفتاری کے بعد پولیس کی تفتیشی ٹیم نے تھانے میں دونوں سے الگ الگ تفتیش کی۔ پہلے نویرا کو ڈرائنگ روم سے کچھ آوازیں سنوائی گئیں جو بے حد اذیت ناک تھیں۔ پھر عادلہ اور شمشادی نام کی دو اسپیشل کی خواتین نے پوچھ گچھ شروع کی جو صورتیں ہی سے پھانسی دینے والی لگتی تھیں۔ ان کی سورتیں دیکھ کر ہی نویرا کا دم نکل گیا تھا، عادلہ نے کہا۔

''دیکھ بی بی! تجھ پر ہاتھ اسی وقت ڈالا گیا ہے جب یہ پتا چل گیا ہے کہ تو نے اور تیرے میاں نے بے چاری بن ماں باپ کی بچی کو زہر دے کر مارا ہے۔ بس اب تجھے ساری باتوں کو سچ سچ بتانا ہے اگر تو نے ایک بات بھی چھپانے کی کوشش کی تو یہ پلاس دیکھ رہی ہے، اس سے تیری انگلیوں کے ناخن اکھاڑیں گے پھر وہ انگیٹھی دیکھ رہی ہے اور اس پر رکھی ہوئی سلاخیں بھی۔ یہ کباب تکے بنانے کے لیے نہیں ہیں، ان سلاخوں کو گرم کرکے تیرے ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگائی جائے گی۔ سمجھ گئی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر اہم اپنا کام شروع کریں۔''

اور نویرا اچھی طرح سمجھ گئی۔ اسے یونیورسٹی کی دوست صفورا کہیں نظر نہیں آئی اور خوف ناک عورت نے جو کچھ کہا تھا وہ دل کی حرکت بند کرنے کے لیے کافی تھا چنانچہ سوالات شروع کردیے گئے اور ان کے جو جوابات ملے وہ بڑے کارآمد تھے۔

پھر نسیم احمد سے پوچھا گیا وہ ان جوابات کی روشنی میں تھا جو نویرا سے حاصل ہوئے۔ شاہ میر جیسے ذہین آفیسر کے چنگل میں پھنسے تھے جس کے بارے میں بہت سے جرم کرنے والوں کی پہلی دعا ہوتی تھی کہ تقدیر انہیں شاہ میر سے بچائے چنانچہ دونوں میاں بیوی بھی اس کے چنگل سے نہیں بچ سکے اور انہوں نے قتل کا اعتراف کرلیا، انہیں اس طرح گھیرا گیا تھا کہ ان کے پاس اعتراف جرم کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا حالانکہ نویرا کی نسبت نسیم احمد نے بڑی مشکل سے زبان کھولی تھی۔ اس نے بڑی چالاکی سے کوشش کی تھی کہ اس قتل کا الزام ہاشم کے سر منڈھ دے لیکن وہی بدلھیبی آڑے آئی کہ معاملہ شاہ میر جیسے زیرک آفیسر کے پاس تھا۔

بس یہ قدرت کے کھیل ہوتے ہیں وہ جو کہا جاتا ہے کہ خون ناحق رنگ لاتا ہے تو ایسا ضرور ہوتا ہے۔ نسیم احمد اور اس کی بیوی نے جو کھیل کھیلا تھا وہ بہت مکمل تھا۔ نسیم احمد نے اپنی بہن کی جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے عالیہ کو زہر دے کر مار ڈالا تھا اور خاموشی سے اس کی تدفین کردی تھی۔ اس نے موقف اختیار کیا تھا کہ نمونیے جیسی خطرناک بیماری نے عالیہ کو ایک ایسی تکلیف میں مبتلا کردیا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اس نے وہ عالیہ کی موت پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگیا تھا کہ قدرت کا ردعمل ہوا اور ہاشم درمیان سے نکل آیا اور اس نے سارا کھیل بدل دیا۔ نسیم احمد ہاشم کے اس دعوے سے پریشان ہوگیا۔ ایسے میں اس کی بیوی نویرا کو اپنی دوست صفورا یاد آئی جو اس کی کالج فیلو رہ چکی تھی اور اسے طویل عرصے کے بعد ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ملی تھی۔ اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ پولیس آفیسر بن چکی ہے چنانچہ نک سک سے درست ایک جھوٹی کہانی لے کر وہ بھڑوں کے چھتے میں جا گھسے

اور یہ کہانی شاہ میر اور صفورا کو سنا کر ہاشم کو اس کی سازش میں ناکام کردیا لیکن اسی درمیان شاہ میر کو شبہ ہوگیا کہ مظلوم عالیہ کوثر اپنی موت نہیں مری بلکہ اسے قتل کیا گیا اور بس..... پھر دوسری اور اصل کہانی منظر عام پر آگئی اور اس کہانی کو دو کردار صحیح طور پر منظر عام پر لائے، ایک حسینہ اور دوسری صفیہ، اصل کہانی یوں تھی۔

بلال احمد کی موت تک یہ خاندان پرسکون اور متحد تھا اور سب ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے۔ یہ خاندان بلال احمد، بیوی جہاں آراء، بیٹا نسیم احمد، بیٹی عالیہ کوثر پر مشتمل تھا پھر اس میں نویرا کی آمد ہوئی اور اسے خاندان میں بھرپور مقام دیا گیا۔ بلال احمد کی موت کے بعد گھر کے حالات میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی جس میں بلال احمد کے کچھ ایسے پروجیکٹ کا معاملہ تھا جس میں کروڑوں روپے ہلاک ہوگئے تھے اور کچھ مالی مشکلات پیش آگئی تھیں، ان مشکلات کا سامنا نسیم احمد کو ہی کرنا تھا کیونکہ اب وہی سیاہ سفید کا مالک تھا۔ ہاں نویرا ایک بے حد چالاک اور کارآمد مشیر تھی جو نسیم احمد کے ہر سیاہ سفید میں شریک ہوگئی پھر جہاں آراء کا انتقال ہوگیا۔ عالیہ ماں کی موت سے بہت متاثر تھی، نویرا پورے گھر پر حکمراں ہوگئی۔ انہوں نے عالیہ کی شادی کا فیصلہ کیا۔ دولت مند گھرانہ تھا بہت سے رشتے تھے لیکن عالیہ کو راحیل نقش سے محبت تھی۔ یہ اس کا یونیورسٹی کا ساتھی تھا، ایک غریب گھرانے کا پرعزم نوجوان۔

راحیل یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے معیار کی نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اپنی بوہ ماں کے ساتھ ایک کوارٹر میں رہتا تھا اور ٹیوشن وغیرہ پڑھا کر گزارا کررہا تھا۔

''ہماری کیفیت کچھ روایتی فلموں اور کہانیوں جیسی ہوگئی ہے راحیل! میرے ماں باپ نے میرے لیے کروڑوں کی جائداد اور بینک بیلنس چھوڑا ہے۔ میں اپنی مرضی سے شادی کا حق رکھتی ہوں، ہم شادی کے بعد اپنا کاروبار کریں گے، تم فکر کیوں کرتے ہو۔''

''یار ان فلموں میں جو کہانیاں ہوتی ہیں وہ حقیقت سے دور نہیں ہوتیں۔ میں ایک پروقار ہیرو کی حیثیت سے تمہیں اپنے بازوؤں کی کمائی کھلانا چاہتا ہوں اور یہ نہیں کہلوانا چاہتا کہ وہ دیکھو، وہ ہیں عالیہ راحیل نقش کے شوہر۔''

نسیم احمد اور نویرا نے جب عالیہ پر شادی کے لیے دباؤ بڑھایا تو مجبور ہوکر عالیہ نے انہیں راحیل نقش کے بارے میں بتادیا۔ نسیم احمد کو جب راحیل کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ سخت برہم ہوا۔ راحیل سے ملا اور اس نے وہی سب کچھ راحیل سے کہا جو ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ راحیل نے بھی ہنس کر کہا کہ اس نے عالیہ کو پہلے ہی بتادیا تھا کہ کہانی یہ رخ اختیار کرلے گی۔ اس نے کہا وہ عالیہ سے اس وقت تک شادی نہیں کرے گا جب تک وہ ایک اچھی حیثیت اختیار نہیں کرلے گا۔ یہ بات اس نے عالیہ کو بھی ہنس کر بتائی تھی کہ ظالم سماج نے اپنا کام شروع کردیا ہے، البتہ راحیل کی ساتھ کچھ ہی دن میں ایک حادثہ ہوگیا۔ اس کی ماں صرف چند دن بیمار رہ کر چل بسی، اس حادثے نے راحیل کو بجھادیا۔ عالیہ نے اس کی بہت دل جوئی اور اسے پیش کش کی کہ وہ اپنے بھائی بھابھی سے بغاوت کرکے اس سے شادی کرنے کو تیار ہے لیکن راحیل نے یہ قبول نہیں کیا، ان دنوں اس کے ایک دوست نے قطر میں اس کے لیے نوکری کا بندوبست کیا اور وہ ایک خوش گوار مستقبل کے لیے قطر چلا گیا۔

نویرا نے ایک اور کھیل کھیلا۔ نویرا نے اپنے ایک خالہ زاد بھائی کے لیے عالیہ سے شادی کی کوشش شروع کی اور نسیم احمد کو اس بارے میں راضی کرلیا۔ عالیہ جو نسیم احمد سے برگشتہ ہوگئی تھی ان کوششوں پر بپھر گئی اور اس کی نسیم احمد سے پہلی بار جھڑپ ہوئی۔

''پانی سر سے اونچا ہوگیا ہے بھائی صاحب! آپ نے شاید مجھے روایتی قسم کی بے وقوف اور بے زبان لڑکی سمجھ لیا ہے۔ میری اپنی ایک حیثیت ہے، میرے باپ نے میرے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے۔

میں مجبوراً یہ گھر چھوڑ رہی ہوں اور اپنے ایک فلیٹ میں منتقل ہو رہی ہوں۔ میں راحیل کا انتظار کروں گی اور صرف اس سے شادی کروں گی۔''

عالیہ گھر کی قدیم ملازمہ حسینہ کو لے کر فلیٹ میں منتقل ہوگئی۔ یہاں سے ہاشم کا کردار سامنے آیا۔ ہاشم دور کا رشتہ دار تھا۔ عالیہ کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ وہاں بھی اس نے عالیہ سے پینگیں بڑھانے کی کوششیں کی تھیں لیکن عالیہ نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی، اسے جب یہ معلوم ہوا کہ عالیہ بھائی سے الگ ہوگئی ہے تو وہ عالیہ کے پاس پہنچا اور اسے اپنے خلوص کا یقین دلایا اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی، جس سے عالیہ کو کوئی الجھن ہو، لیکن در پردہ وہ اس کوشش میں تھا کہ آخر کار وہ عالیہ کو شیشے میں اتار لے گا۔

ادھر عالیہ کے گھر سے چلے جانے کے بعد نوریا نے نسیم احمد کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ بلال احمد نے اپنی زندگی میں عالیہ کا حصہ اس کے نام کر دیا تھا اور اس پر نسیم احمد کا کوئی حق نہیں رہا تھا۔ ادھر جو پروجیکٹ ادھورے رہ گئے تھے، ان کی رقم ڈوب رہی تھی اور نسیم احمد پریشان تھا، نوریا نے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ عالیہ اپنا حصہ لے کر علیحدہ ہوگئی اور ہم سولی پر لٹک گئے۔ اگر عالیہ کے حصے کی رقمیں ہم اپنے کاروبار میں لگا دیں تو ڈوبنے سے بچ سکتے ہیں لیکن اب وہ سب کچھ دوسروں کے کام آئے گا۔ صاف کہہ رہی ہوں میں، غربت میں زندگی گزاروں گی۔ اگر تم دیوالیہ ہوگئے تو تمہیں مجھے طلاق دینی پڑے گی۔''

نسیم احمد بہک گیا، بہن کی محبت لالچ میں بدل گئی اور ذہن میں سازشیں ابھرنے لگیں۔ انہوں نے منصوبہ بنایا عالیہ کی موت ہو جائے تو اس کی دولت صرف نسیم احمد کے حصے میں آئے گی۔ اس منصوبے میں نوریا لحہ لحہ ساتھ تھی۔ سارے انتظامات کیے گئے، بھاری رقم کے عوض ایک خطرناک زہر کی گولی خریدی گئی اور دونوں عالیہ کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔

بھائی اور بھابھی پہلی بار عالیہ کے فلیٹ پر آئے تھے اور انہوں نے اپنا موڈ بہت خوش گوار رکھا تھا۔ مزید خوشی عالیہ کو اس وقت ہوئی جب نوریا نے کہا۔

''تمہارے چلے آنے کے بعد سے نسیم کی جو کیفیت ہوئی، وہ مجھ سے نہیں دیکھی جاتی آخر ہم دونوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں دلہن بنا دیں۔ ہم راحیل کے ساتھ تمہاری شادی کے لیے تیار ہیں۔''

عالیہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ راحیل کو منانا اس کے لیے ایک امتحان تھا لیکن جب بھائی بھابھی تیار ہو گئے ہیں تو کسی نہ کسی طرح راحیل کو بھی تیار کر لے گی۔ یہ اس کے لیے عید جیسی خوشی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اس کی آخری عید ہے۔ چائے کے دوران نوریا نے ہوشیاری سے زہر کی وہ گولی عالیہ کی پیالی میں ڈال دی اور عالیہ نے وہ چائے پی لی، پھر وہ وہاں سے چلے گئے۔

بعد میں ہاشم وہاں پہنچا۔ عالیہ کی حالت بگڑنے لگی تھی، اس نے صرف ہاشم کے لیے چائے بنوائی اور ہاشم کچھ دیر کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

دوسری صبح حسینہ نے نسیم کو عالیہ کی موت کی اطلاع دی۔ نسیم احمد اس اطلاع کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنی فیملی ڈاکٹر کے ساتھ فلیٹ پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے موت کی تصدیق کر دی۔ اس نے کہا کہ لاش کی کیفیت عجیب ہے، اگر پوسٹ مارٹم ہو جائے تو بہتر ہے لیکن نسیم نے آنسو بہاتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی بہن کی لاش کی بے حرمتی نہیں چاہتا اور پھر لاش کی تدفین کر دی گئی۔ ان پورے حقائق اور اقبالی بیان کے ساتھ صفورا اور زمان شاہ نے چالان پیش کر دیا۔ گواہان میں حسینہ، صفیہ اور غم زدہ راحیل کے نام درج کرائے گئے جسے قطر سے طلب کر لیا گیا تھا۔ طارق مفتی نے کہا تھا کہ ان دونوں میاں بیوی کو سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

☆☆

دوران گردوں

عاصمہ زیدی

دولت کے پجاریوں کا نہ کوئی وطن ہوتا ہے اور نہ ان کے دل میں وطن کی محبت ہوتی ہے۔ یہ ہر جگہ صرف اپنے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کالی بھیڑوں کو کوئی بھی باآسانی خرید سکتا ہے۔ یہ لوگ ملک دشمن قوتوں کے ایما پر اپنے ہی ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی سائنس داں کی وطن پرستی جس نے اپنے ملک کے لیے ایک شاندار فارمولا دریافت کیا تھا مگر.....

ملک کی ان ناسوروں کے خلاف پر عزم وطن پرستوں کا کلیدی کردار

وہ عمارت مشہور سائنس داں حماد گردیزی کی نگرانی میں تھی اور یہ ایک جزیرے میں تھی۔ حماد ایک خاص اور حساس نوعیت کے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس جزیرے کی طرف کسی کی آمد ورفت نہیں تھی، سوائے ان لوگوں کے جو خصوصی اجازت سے وہاں آیا کرتے۔ بغیر اجازت والوں کے لیے قدم قدم پر گھات لگائے ہوئے کمانڈوز تھے۔ جو درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان چھپے رہتے اور ایک آن میں موت کی بارش کر دیا کرتے تھے۔

پروفیسر کی ایک ہی بیٹی تھی زنوبیہ، ویسے تو اس کا قیام شہر میں تھا لیکن وہ چھٹیوں میں اسی جزیرے پر آجایا کرتی تھی۔ زنوبیہ کے لیے اس جزیرے پر آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ پورے جزیرے پر کسی بے چین اور اداس روح کی طرح منڈلاتی رہتی اور محافظوں میں سے کوئی بھی اس کے قریب آنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ باپ بیٹی کی ملاقات رات کے کھانے پر ہوا کرتی۔ اس وقت پروفیسر ایک عام سا انسان بن جاتا جو اپنی بیٹی سے دنیا بھر کی باتیں کیا کرتا، اسے اپنے حالات بتایا کرتا اور زنوبیہ بھی اسے اپنے تجربات سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔

زنوبیہ کی زندگی بہت لگے بندھے اصولوں کے تحت گزر رہی تھی، اس کی زندگی میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنا دوست کہہ سکتی، انتہائی محتاط انداز سے زندگی گزاری تھی اس نے۔ ایک دن پروفیسر نے اس سے کہا تھا۔

''بیٹا میں جانتا ہوں کہ تم کس انداز سے زندگی گزار رہی ہو۔ تم اپنی شخصیت میں تنہا ہو کر رہ گئی ہو اور یہ سب میری وجہ سے ہے کہ میں تم پر دھیان نہیں دے پا رہا۔''

''نہیں بابا ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ تو میری نیچر سے واقف ہیں کہ میں کسی سے زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتی۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ میں آپ جیسے بڑے آدمی کی بیٹی ہوں۔''

''نہیں بیٹا، عمر اور جذبوں کے تقاضے کچھ اور بھی ہوتے ہیں۔ تمہاری ماں تو تمہارے بچپن میں ہی اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ زندگی گزارنے کے لیے ایک بہترین ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے میری طرف سے اجازت ہے، تم خود سمجھ دار اور باشعور لڑکی ہو، میرا خیال ہے کہ تمہارا انتخاب غلط نہیں ہوگا۔''

پروفیسر نے اسے اشارہ دے دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا ساتھی خود چن سکتی ہے۔ اس کے باوجود ابھی تک کوئی بھی زنوبیہ کے قریب نہیں آ سکا تھا، یا اس نے کسی کی ہمت افزائی نہیں کی تھی۔ وہ شہر سے جزیرے کی طرف آ کر بھٹکتی رہتی تھی، عام طور پر ساحل کی طرف نکل جاتی اور ایک مخصوص پتھر پر بیٹھ کر گہرے سمندر کی طرف دیکھتی رہتی۔ رات کی تاریکی میں سمندر بہت ہولناک اور پراسرار دکھائی دیا کرتا تھا، وہ جس طرف آ کر بیٹھا کرتی وہ سمت جزیرے کی جنوبی سمت تھی، اس طرف مسلح محافظ بھی نہیں ہوا کرتے تھے اور نہ ہی کسی قسم کا خطرہ تھا۔

اس شام بھی زنوبیہ اس طرف چلی گئی تھی، سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی، دور دور تک پھیلا ہوا نیلگوں سمندر اسے بہت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا، وہی چمکتا ہوا دن، اڑتے ہوئے پرندے، سفید بادلوں کی ٹولیاں اور جزیرے پر پھیلی ہوئی اداس کر دینے والی خاموشی۔ پھر اچانک ایک ہلچل سی برپا ہوگئی۔ یہ ہلچل سطح آب پر ہوئی تھی، دور ایک لانچ بہت تیزی سے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی جس کی رفتار ایسی تھی جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔ زنوبیہ کو اس لانچ کا تعاقب کرتی ہوئی ایک اور لانچ بھی دکھائی دی جس کی مخصوص ساخت اور رنگ کی وجہ سے زنوبیہ کو یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ وہ تعاقب کرنے والی لانچ کوسٹ گارڈز والوں کی تھی، اس چھوٹی سی لانچ میں صرف ایک آدمی دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں لانچوں کا رخ جزیرے ہی کی طرف تھا۔ یقیناً جزیرے والوں نے بھی ان لانچوں کو دیکھ لیا ہوگا پھر اچانک بڑی لانچ کی طرف سے فائرنگ کھول دی گئی۔ ایک برسٹ مارا گیا اور چھوٹی لانچ میں موجود شخص اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا، وہ الٹ کر سمندر میں جا گرا تھا جبکہ اس کی لانچ سطح آب پر تیرتی رہ گئی تھی۔

یہ ایک حیرت انگیز اور خوف زدہ کرنے والا نظارہ تھا۔ زنوبیہ خالی الذہن ہو کر یہ سب دیکھتی رہ گئی تھی، پھر اس نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی، کوئی اس کے قریب آ رہا تھا، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس جزیرے کا سیکورٹی انچارج علی زیب تھا۔ وہ اس کے قریب آ کر ادب سے بولا۔

''زنوبیہ بی بی، آپ یہاں سے ہٹ جائیں پلیز۔''

''علی زیب تم نے کچھ دیکھا، یہ کون لوگ ہیں، کیوں مار رہے ہیں اسے؟'' زنوبیہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے، وہ ایک اسمگلر تھا جسے کوسٹ گارڈ والوں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔'' علی زیب نے بتایا۔

یہ بات تو خود زنوبیہ نے بھی سمجھ لی تھی، لیکن اب علی زیب سے اس کی تصدیق ہوگئی تھی۔

''آپ ہٹ جائیں یہاں سے پلیز۔ پروفیسر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' علی زیب نے کہا۔

زنوبیہ نے ایک نگاہ سمندر کی طرف دیکھا، کوسٹ گارڈ کی بڑی لانچ اب تک وہیں موجود تھی جبکہ وہ چھوٹی تنہا لانچ لہروں کے سہارے ڈولتی پھر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی قیامت کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی، لیکن اس کی قیامت کا کوئی پتا نہیں تھا۔ ماریہ نے سب سے پہلے اس کے دوست عامر کو فون کیا۔

''عامر، دانش کہاں ہے، کئی دنوں سے دکھائی نہیں دیا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کے بارے میں تم سے زیادہ اور کون جانتا ہے؟''

''یہ بات تو ہے، لیکن پچھلے کچھ دنوں سے موصوف کی سرگرمیاں کچھ پراسرار ہوگئی ہیں، نجانے کہاں رہتے ہیں، بہرحال اگر تمہیں مل جائیں تو فوری طور پر میرے پاس بھیج دینا۔''

''ظاہر ہے وہ تمہارے علاوہ اور جا بھی کہاں سکتا ہے۔''

ماریہ اور دانش ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے، ان دونوں کے درمیان اگرچہ لفظ محبت کا کبھی تبادلہ نہیں ہوا تھا، اس کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے سے گہری محبت تھی۔ دونوں کا تعلق کھاتے پیتے روشن خیال گھرانے سے تھا، اس لیے ملاقاتوں میں بھی کسی قسم کی دشواریاں نہیں تھیں، جب چاہا ایک دوسرے سے مل لیے۔ ان کی شامیں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزرا کرتی تھیں، دونوں کو ایک دوسرے کی سرگرمیوں کا اچھی طرح علم تھا لیکن گزشتہ کچھ دنوں سے دانش کی سرگرمیاں کچھ تبدیل ہوگئی تھیں، وہ ماریہ کے پاس آنے کے بجائے کہیں اور نکل جاتا تھا۔ ماریہ اپنے کمرے میں بند ہو کر بہت دیر تک دانش کے بارے میں سوچتی رہتی، دانش کا تصور اسے ہمیشہ سرشار کر دیا کرتا تھا، وہ ایک خوب صورت ذہین اور بے تکلف نوجوان تھا، جس کی باتیں بہت خوب صورت ہوا کرتی تھیں اور جس کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جس کی دھڑکنیں ماریہ کے لیے مخصوص ہو چکی تھیں۔

بہت دیر کے بعد فون کی بیل بج اٹھی۔ دوسری طرف عامر تھا۔ ''ماریہ مجھے تم سے بہت ضروری ملنا ہے، دانش کے سلسلے میں یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔''

''کیوں خیریت تو ہے نا؟'' ماریہ پریشان ہوگئی۔

''ہاں خیریت ہی ہے، لیکن یہ ملاقات بہت

ضروری ہے، تم ایسا کرو بلیومون پہنچ جاؤ، میں وہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

بلیومون ان سبھی کا پسندیدہ ریسٹورنٹ تھا، ماریہ کئی بار دانش کے ساتھ وہاں جا چکی تھی، کبھی کبھی عامر بھی ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا، لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ عامر نے ماریہ کو وہاں ملاقات کے لیے بلایا تھا وہ بھی دانش کی غیر موجودگی میں، عامر ماریہ کا انتظار کر رہا تھا، وہ خود بھی ایک ہینڈسم اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا، اس کی نگاہیں کبھی کبھی ماریہ کو پیغام دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، لیکن ماریہ نے ان نگاہوں کی پروا نہیں کی تھی۔ اس نے تو اپنے آپ کو دانش کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

"ہاں بھئی، بتاؤ۔ ایسی کون سی خاص بات ہوگئی؟" ماریہ نے بیٹھنے کے بعد دریافت کیا۔

"تمہارے فون کے بعد میرا ایک جاننے والا میرے پاس آ گیا تھا، وہ ایک خلط قسم کا آدمی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ عیاش قسم کا، پیسے والا ہے اسی لیے اس قسم کی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ اس نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد گفتگو کے درمیان میں دانش کے بارے میں بتایا کہ وہ آج کل کسی سائرہ کے چکر میں ہے۔"

"سائرہ کون ہے یہ؟"

"ایک ماڈل بلکہ سوسائٹی گرل، خاصی بدنام لڑکی ہے۔" عامر نے بتایا۔

"تو کیا وہ تمہارا دوست دانش کو جانتا ہے۔"

"ہاں دو چار بار وہ میرے ساتھ ہی دانش سے مل چکا ہے، اس لیے وہ باتوں کے دوران دانش کا تذکرہ لے بیٹھا اور یہ بتایا کہ دانش ان دنوں سائرہ کے چکر میں ہے بلکہ وہ اس کے پاس کئی راتیں گزار چکا ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ دانش ایسا تو نہیں ہوسکتا، ہوسکتا ہے اس نے کوئی غلط بیانی کی ہو۔"

"لیکن وہ غلط بیانی کیوں کرنے لگا؟"

"عامر پلیز! اب ذرا میری خاطر پتا چلاؤ، دیکھو تو سہی یہ کیا سلسلہ ہے، کیا دانش واقعی بہک گیا ہے، میں اس لڑکی سے خود ملوں گی۔"

"نہیں نہیں تمہیں ملنے کی ضرورت نہیں ہے، میں اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" عامر نے کہا۔

☆☆☆

رات بہت خوب صورت تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ پراسرار بھی تھی۔ اس کی یہ خوب صورتی اور اس کا یہ اسرار پھیلی ہوئی دلکش چاندنی کی وجہ سے تھی جو دور دور تک روپہلا رنگ بکھیر رہی تھی، زنوبیہ اس وقت کھڑکی میں کھڑی تھی، اس کا باپ کچھ دیر پہلے ہی اس سے مل کر اپنی لیب کی طرف چلا گیا تھا اور اب زنوبیہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

اس کے دھیان میں ابھی تک وہی دونوں لانچیں تھیں، ایک جان بچا کر بھاگتی ہوئی لانچ اور دوسری اس کا تعاقب کرتی ہوئی لانچ جس نے برسٹ مار کر چھوٹی لانچ کے سوار کو تہ آب کر دیا تھا، نجانے اس چھوٹی لانچ کے مسافر کا کیا حال ہوا ہوگا، یقیناً وہ مر گیا ہوگا کیونکہ بعد میں اسے پتا چلا تھا کہ کوسٹ گارڈ والوں نے اس لاش کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں مل سکی تھی۔

زنوبیہ کو اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوسکا تھا اچانک زنوبیہ کو احساس ہوا جیسے اس چاندنی میں کوئی لنگڑاتا ہوا ایک درخت کے عقب سے نکل کر دوسرے درخت کے پاس چلا گیا، یہ اس کا وہم نہیں ہوسکتا تھا اس نے واقعی کسی کو دیکھا تھا، یہ اور بات ہے کہ اتنے فاصلے سے اس کے خدوخال دکھائی نہ دیے ہوں، لیکن وہ جزیرے کا کوئی محافظ تو ہرگز نہیں تھا کیونکہ وہاں کے محافظ ایک خاص قسم کی وردی پہنا کرتے تھے۔ جبکہ اس چھپنے والے کے جسم پر وردی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پھر وہ کون ہوسکتا تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں درختوں کی جانب مرکوز کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر دکھائی دیا، وہ بہت محتاط انداز میں چل رہا تھا، اس کی چال یہ بتاتی تھی کہ وہ زخمی بھی

ہے۔

زنوبیہ نے جھپٹ کر دوربین اٹھالی۔ وہ اچھی خاصی طاقت ور دوربین تھی، اس نے دوربین ایڈجسٹ کر کے درختوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا، اب وہ شخص صاف دکھائی دے گیا۔ تیز چاندنی نے زنوبیہ کی نگاہوں کے سامنے اسے واضح کر دیا تھا، وہ ایک جوان آدمی معلوم ہوتا تھا، اس کے سفید لباس پر کچھ دھبے دکھائی دے رہے تھے وہ یقیناً خون کے دھبے ہوسکتے تھے، وہ کون ہوسکتا تھا، اس جزیرے پر باہر کے آدمی کی گنجائش نہیں تھی، یہاں تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا پھر وہ کسی طرح آ گیا تھا۔

اچانک زنوبیہ کا دل ایک خیال سے دھڑک اٹھا، یہ کہیں وہی اسمگلر تو نہیں تھا جس کی لانچ ڈوبتی گئی تھی، کوسٹ گارڈ والے جس کی تلاش میں ناکام ہوگئے تھے۔ شاید یہ وہی تھا، وہ کسی طرح بچ کر جزیرے کی طرف نکل آیا تھا اور اب اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا تھا۔

زنوبیہ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا وہ ابھی اسٹرکام پر کسی کو بھی آگاہ کر دیتی اور وہ شخص پکڑ لیا جاتا، لیکن وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس بے زار کر دینے والے جزیرے میں کوئی تبدیلی تو آئی تھی۔ تھوڑی سی سنسنی تو پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک بے خوف لڑکی تھی اور یہ ایسا موقع تھا جسے ضائع کر دینا اسے مناسب نہیں معلوم ہوا، اس نے جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ اپنے بچاؤ کے لیے اس نے احتیاطاً اپنا چھوٹا سا پستول بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

محافظوں نے اسے دیکھا تو تھا لیکن ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، زنوبیہ اکثر اسی طرح جزیرے کی طرف نکل جایا کرتی اور گھوم پھر کر اور کسی آوارہ روح کی طرح بھٹکنے کے بعد جب تھک جاتی تو خاموشی سے واپس آ جایا کرتی، زنوبیہ کا رخ اسی سمت تھا جہاں وہ آدمی دکھائی دیا تھا، وہ اسے درختوں کے پاس تلاش کرنے لگی لیکن اس آدمی کا کوئی سراغ نہیں تھا، ایک درخت سے دوسرے اور پھر تیسرے درخت کے پیچھے چیک کیا اور جب بور ہو کر واپسی کا ارادہ کیا تو وہ اچانک سامنے آ گیا۔

وہ ایک درخت کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا جس کا رخ زنوبیہ کی طرف تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بری طرح خوف زدہ ہو کر رہ گئی تھی۔ دونوں گہری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، آہستہ آہستہ زنوبیہ کا خوف کم ہوتا چلا گیا، اس کے سامنے ایک ایسا نوجوان کھڑا تھا جو خاصا خوش شکل تھا یہ اور بات ہے کہ اس کے جسم پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔ لباس پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔

"کون ہو تم؟" اس شخص نے دریافت کیا۔

"میں زنوبیہ ہوں۔" زنوبیہ نے جواب دیا اب اس نوجوان کی طرف سے اس کا خوف ختم ہو چکا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" زنوبیہ نے سوال کیا۔

"میں؟" وہ نوجوان گڑبڑا کر رہ گیا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم یہاں کس طرح آئے ہوگے، تم کوسٹ گارڈ والوں سے چھپ کر آئے ہو یہاں، ان کی لانچ تمہاری لانچ کا تعاقب کر رہی تھی۔"

"تم تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟"

"اس لیے کہ میں خود یہ سب دیکھ رہی تھی۔"

"اوہ۔" نوجوان نے گہری سانس لی۔ "تم کون ہو اور اس جزیرے پر کیا کر رہی ہو؟"

"یوں سمجھ لو کہ میں اسی جزیرے پر رہتی ہوں۔"

"تم یہاں رہتی ہو۔"

"ہاں کیونکہ پروفیسر گردیزی میرے والد ہیں۔" زنوبیہ نے بتایا۔

"پروفیسر گردیزی۔" نوجوان نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شاید تم میرے پاپا کو نہیں جانتے، وہ اس ملک

کے بہت بڑے سائنٹسٹ ہیں۔" زنوبیہ نے بتایا۔

"اوہ، وہ پروفیسر گردیزی۔ ہاں میں ان کا بہت نام سنا ہے۔"

"تم زندہ کس طرح بچ گئے۔" زنوبیہ نے پوچھا۔

"میں سمجھ گیا، تم مجھے باتوں میں الجھا کر گرفتار کرانا چاہتی ہو، تم یہ چاہتی ہو کہ اس جزیرے کے محافظ اس طرف آ نکلیں۔"

"بیوقوف ہو تم۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں اپنی کھڑکی میں تھی، میں نے تمہیں وہیں سے دیکھا تھا اور اکیلی اسی لیے اس طرف آئی ہوں کہ شاید تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

"کیوں تم میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟"

"بس یونہی، شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں یہاں کے ماحول میں کچھ تبدیلی چاہتی تھی، خود تمہارے آنے کے بعد یہاں تبدیلی آ گئی ہے، ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

"دانش ہے میرا نام۔" اس نوجوان نے جواب دیا۔ زنوبیہ اس نوجوان کے لیے کھانے کے ڈبے اور پانی کی بوتل لے آئی تھی، اس نے دانش کے لیے ایک ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں وہ آسانی سے اس جزیرے پر چھپ سکتا تھا۔ زنوبیہ کو اس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور کچھ انسیت بھی محسوس ہونے لگی تھی جیسے وہ نوجوان بہت دنوں سے اس کے ساتھ ہو، اب اس نوجوان کے آنے سے اس جزیرے کی بوریت اچانک ختم ہو گئی تھی، اب ایک سنسنی سی تھی، اس جزیرے پر رہنے کا ایک مقصد اس کی سامنے آ گیا تھا۔

اس نے دانش کے لیے دوسرے لباس کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ یہ لباس وہ اپنے باپ کے وارڈ روب سے چرا کر لائی تھی، اسے معلوم تھا کہ پروفیسر کو اپنے کپڑوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی، اسی لیے اسے اس چوری کا احساس بھی نہیں ہو سکے گا، کھانے کے ڈبوں اور پانی کی بوتلوں کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"آخر کیوں تم میرے لیے یہ سب کیوں کر رہی ہو؟" دانش نے پوچھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں یہ سب تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کر رہی ہوں۔" زنوبیہ نے کہا۔

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟"

"تم شاید یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں کس انداز کی زندگی گزار رہی ہوں، ایک خاموش، ویران اور اداس زندگی، ایک جیسے شب و روز، کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو دوست کہہ کر مخاطب کر سکوں۔ ہر طرف احترام کرنے والے لوگ ہیں، اسی لیے تمہارے آنے کے بعد زندگی میں ایک ہلچل محسوس ہونے لگی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے مجھ کو شاید اسی ہلچل کی ضرورت تھی۔"

"زنوبیہ، تمہارا احسان ہے کہ تم نے ایک اسمگلر کو اس قابل سمجھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جیسا آدمی اسمگلر بھی ہو سکتا ہے، آخر کیوں تم اسمگلر کیسے ہو گئے، کیوں ہو گئے؟"

"بس وقت اور حالات نے اس مقام پر پہنچا دیا ہے مجھے، زندگی میں جب پریشانیاں بڑھنے لگیں اور واپسی کی کوئی راہ نہیں رہی تو پھر کچھ ایسے لوگ مل گئے جنہوں نے مجھے یہ راہ دکھائی اور میں بھی آنکھیں بند کر کے اس راہ پر چل پڑا۔"

"اور اب، اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔" دانش نے ایک گہری سانس لی۔ "حالانکہ میں فزکس میں ایم ایس سی ہوں۔"

"کیا؟" زنوبیہ یہ سن کر اچھل پڑی۔ "فزکس میں ایم ایس سی۔"

"ہاں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اتنی پڑھائی کا، زندگی جس طرح پہلے دشوار تھی اسی طرح آج بھی دشوار ہے۔"

"اگر تم کہو تو میں اپنے پاپا سے تمہارے لیے

بات کروں۔"

"کیا بات کرو گی؟"

"یہی کہ وہ تمہیں اپنی ساتھ رکھ لیں۔ تم ان کے معاون کے طور پر ان کی لیبارٹری میں کام کر سکتے ہو۔"

"کیا تمہارے پاپا کسی اسمگلر کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

"اوہو پاپا کو یہ تو نہیں بتایا جائے گا کہ تم کوئی اسمگلر ہو، بلکہ تم میرے دوست ہو اور میں تمہیں اپنے ساتھ شہر سے لے کر آئی ہوں۔"

"لیکن یہ سب کس طرح ہو گا؟"

"ہو گا یوں کہ میں تمہیں ایک چھوٹی بوٹ کا بندوبست کر دوں گی، رات میں تھوڑی دور تک تم اس لانچ کو چپوؤں کے ذریعے دور تک لے جاؤ گے اس کے بعد اس کا انجن اسٹارٹ کر کے شہر تک جاؤ گے، میں دو چار دن کے بعد شہر آ جاؤں گی، جہاں موبائل کے ذریعے ہم دونوں رابطہ کریں گے، پھر میں شہر سے تمہیں لے جا کر اپنے ابو سے متعارف کراؤں گی۔ تم میرے مہمان بن کر آؤ گے، پاپا سے تمہاری ملاقات ہو گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری سفارش مان لیں گے۔"

"کیا مجھے اسمگلر کی حیثیت سے شناخت نہیں کرلیا جائے گا؟"

"اس کے لیے تمہیں اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی ہو گی، اس کے علاوہ کسی کو شبہ بھی ہو سکتا ہے، یقین نہیں ہو سکتا کیونکہ دانش نام کا اسمگلر تو کوسٹ گارڈ سے جھڑپ میں مارا جا چکا ہے۔"

"اوہ..... اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے پہلے سے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔"

"سب کچھ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، پھر تمہاری باتیں سنی تھیں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں تیار ہوں، اب اصل مسئلہ جزیرے سے نکلنے کا ہے۔"

"تم فکر مت کرو، بس میں جس بوٹ کی نشاندہی کروں تم اس تک پہنچ کر اس میں چھپ جانا، رات کو دو بجے ڈیوٹی بدلتی ہے، بس تم نے اس دوران ہوشیاری سے بوٹ کو ساحل تک لے جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" دانش نے کہا پھر وہ ہوشیاری سے بوٹ میں جا کر چھپ گیا، اور وقت مقررہ پر بوٹ کو ساحل تک لے گیا، پھر اس نے چپوؤں کی مدد سے اسے دھکیلنا شروع کر دیا اور کافی دور تک لے گیا تھا، اس کے بعد اس نے اطمینان سے بوٹ کا انجن اسٹارٹ کیا اور شہر کی طرف چل پڑا تھا۔ زنوبیہ دور بین سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ اطمینان سے کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر اپنی جگہ آ گئی تھی۔

☆☆☆

شہر پہنچنے کے بعد دانش نے زنوبیہ کو فون کر کے اپنے صحیح سلامت پہنچنے کی اطلاع دی اور زنوبیہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ دو دن کے بعد شہر پہنچ گئی تھی، وہاں پہنچ کر دانش سے ملی اور پروگرام کے مطابق دونوں واپس جزیرے پر پہنچ گئے۔ زنوبیہ کسی انتظار اور تاخیر کیے بغیر دانش کو اپنے پاپا کے پاس لے آئی تھی۔ اس نے دانش کے بارے میں پروفیسر کو بتاتے ہوئے کہا۔

"پاپا، دانش وہ آدمی ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ مضبوط مخلص بہادر اور ساتھ دینے والا۔"

"بہت خوب۔" پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی وہ متلاشی نگاہوں سے دانش کا جائزہ لے رہا تھا۔

"بابا یہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے فزکس میں ماسٹر کی ڈگری لے رکھی ہے۔"

"جی جناب!" دانش ادب سے بولا۔ "میں نے اب تک کی جو زندگی گزاری ہے میں اسے فراموش کر دینا چاہتا ہوں بہت پریشان رہا ہوں ہر وقت کی بھاگ دوڑ۔ سر پر خوف اور موت کی تلوار لٹکی ہوئی، اسی لیے چاہتا ہوں کہ زندگی کو کسی اور انداز سے گزارنے کی کوشش کروں اور اس کوشش کے لیے مجھے آپ سے بہتر اور کون مل سکتا ہے۔"

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' پروفیسر کچھ سوچنے لگا۔ ''دیکھو نوجوان برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ تم ایک مجرم ہو، پولیس کو تمہاری تلاش ہے، اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اس معاشرے میں تمہاری حیثیت بہت مشکوک ہے جبکہ میں ایک معزز آدمی ہوں۔ ایک ساکھ ہے میری، عوام میں بھی اور حکومت کی نگاہوں میں بھی اب ایسے میں اگر میں نے تمہیں پناہ دی تو خود میری پوزیشن کیا رہ جائے گی۔ اس کا تمہیں اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے۔''

''جی ہاں مجھے اندازہ ہے۔''

''دوسری طرف تمہاری اپنی صلاحیتیں ہیں، تم نے جس انداز سے زنوبیہ کی حفاظت کی ہے، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں سارے خدشوں سے بے نیاز ہو کر تمہاری مدد کروں۔''

''پاپا..... آپ کو یہ تو کرنا ہی ہوگا، میں دانش کو اب یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔''

''او کے او کے۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''لیکن میں ابھی اس کا فیصلہ نہیں کرسکتا، دو چار دن سوچنے کے بعد بتاؤں گا، اور دو چار دن کے بعد پروفیسر کا فیصلہ ان دونوں کے حق میں تھا۔

''ٹھیک ہے، میں دانش پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اپنی ٹیم میں شامل کر رہا ہوں، یہ لیب میں میرے ساتھ رہے گا لیکن اس طرح نہیں، اسے شہر جانا ہوگا اور وہاں جا کر یہ اپنے آپ کو تھوڑا بہت تبدیل کرلے، اس کے بعد زنوبیہ تم شہر جا کر اسے اپنے ساتھ لاؤ گی اور یہ ظاہر کیا جائے گا کہ تم اپنے کزن کو میری مدد کے لیے لے کر آئی ہو۔''

یہ پلان طے پا گیا اور اس پلان کے تحت دانش کو شہر بھیجا گیا تھا، جہاں اس نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی بھی کرلی، کچھ دنوں کے بعد زنوبیہ بھی پلان کے مطابق دانش کے پاس پہنچ گئی اور اب ان دونوں کو جزیرے کی طرف واپس جانا تھا۔

پروفیسر بہت گہری نگاہوں سے دانش کا جائزہ لے رہا تھا، اس کمرے میں دانش، پروفیسر اور زنوبیہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا، البتہ ایک اعصاب شکن خاموشی ضرور تھی۔

''نوجوان، تم ہر لحاظ سے میرے معیار پر پورے اترے ہو۔ تم نے یہ ثابت کردیا کہ زندگی کے اس تھکا دینے والے سفر میں تم زنوبیہ کے بہترین رفیق ہوسکتے ہو۔''

''جناب میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا، آپ تو جانتے ہیں کہ میرا ایک گراؤنڈ کیا ہے، میں کیسا آدمی ہوں۔''

''ہاں تم ایک مجرم ہو، ایک خطرناک مجرم، تمہارے بارے میں ساری معلومات مجھے حاصل ہو گئی ہیں، میرے آدمیوں نے تمہاری ہر بات کا سراغ لگایا ہے۔ تم سے ایک قتل بھی سرزد ہوگیا ہے۔ پولیس تمہارے تعاقب میں ہے اور شاید تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ پولیس تمہارے باپ اور بھائی کو تمہارے لیے گھر سے اٹھا کر لے گئی ہے۔'' دانش لڑکھڑا کر رہ گیا تھا، اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

''حوصلہ رکھو دانش! اب تم ان کے لیے کچھ نہیں کرسکتے، لہٰذا ان کے بارے میں سوچنے اور پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''میں کوشش کروں گا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے، ویسے بھی اگر تم پولیس کے ہاتھ نہیں آئے تو وہ انہیں چھوڑ ہی دے گی، اب تمہیں وہ بات بتانی ہے اس کے لیے اس وقت تمہیں بلایا ہے۔''

''یس سر۔'' دانش نے جواب دیا ''ابھی میرے پاس آپ کی بات سننے کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے، کیونکہ میں نے اپنی ساری کشتیاں جلا دی ہیں، اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''تم اداس مت ہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' یہ کہہ کر پروفیسر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''اب میں تمہیں ایک مختصر سی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ اس کہانی کو سن کر تمہیں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔''

''میں سر میں سن رہا ہوں۔''

''جو کچھ میں سنانا چاہ رہا ہوں وہ زنوبیہ کے لیے بھی نیا ہوگا، یہ کہانی ایک ذہین ترین طالب علم کی ہے جس نے سائنس کے شعبے میں اپنی مہارت اور ذہانت تسلیم کروالی تھی۔ استاد اسے پسند کرتے تھے اور اس کا مستقبل شاندار قرار دیتے تھے۔ اس نے زمانہ طالب علمی میں ایسی ایسی چیزیں ایجاد کرلی تھیں جو پوری دنیا میں تہلکہ مچا سکتی تھیں، وہ شخص میرا بڑا بھائی تھا۔''

''ڈیڈی آپ نے پہلے کبھی مجھے نہیں بتایا کہ آپ کے بڑے بھائی بھی سائنس دان تھے۔''

''بیٹا اس کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ بہرحال اس کی کہانی سن لو، جو مجھ سے کہیں زیادہ ذہین تھا، اس کی وجہ سے میں بھی سائنس کے شعبے میں آ گیا، ایک بہت بڑا سائنس داں بننے کی آرزو کی اور میں اس سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوا ہوں۔ بہرحال ہوا یہ کہ اس غریب نے ایک شاندار فارمولا دریافت کیا، میں اس وقت اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گا، بس اتنا سمجھ لو کہ اس فارمولے کی وجہ سے اس ملک کو بہت فائدہ ہوسکتا تھا، اس نے سوچا تھا کہ اس فارمولے کی وجہ سے اس کی پورے ملک میں پذیرائی ہوگی، اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا، لیکن اس کے برعکس اسے مروا دیا گیا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی۔''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، یہاں کے بڑوں نے اس کا قتل کروا دیا، کیونکہ ان کے مفادات اس کی دریافت سے تباہ ہو جاتے، یہ میرے لیے بہت بڑا دکھ تھا، بہت بڑا المیہ تھا، پھر میں نے ایک بات کا تہیہ کرلیا، وہ میرے زندگی کا وہ فیصلہ تھا جس پر میں آج تک عمل کرتا آ رہا ہوں اور اب اس فیصلے کا نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں سر، کیا فیصلہ تھا آپ کا؟'' دانش نے پوچھا۔

''وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اس ملک کے وسائل کام لوں گا، یہاں کے وسائل کو استعمال کروں گا۔ ان اس ملک کو اپنی ذات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچاؤں گا کیونکہ یہ اس قابل ہی نہیں ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

یہ ایک انوکھا سفر تھا، زنوبیہ کو سب سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی، بالآخر پروفیسر نے اپنی کہانی سنا دی تھی اور کہانی کا اختتام کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''تو اس طرح میں نے ایک اہم فارمولے پر کام شروع کردیا، میں ایک ایسی دریافت کرنے والا تھا جو پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیتی اور یہ فارمولا جس ملک کے ہاتھ لگ جاتا اس کی طاقت عظمت کو سب جھک کر سلام کرتے، اسی دوران میں کچھ غیر ملکی ملے اور انہوں نے پیش کش کی کہ میں یہ فارمولا مکمل ہونے کے بعد اسے لے کر ان کے ملک آ جاؤں۔ جہاں وہ مجھے دنیا بھر کی سہولیات دینے کو تیار ہیں، میں کئی ہفتوں تک اس پیش کش پر غور کرتا رہا پھر میں نے ان کی پیش کش قبول کرلی۔''

''ڈیڈی یہ تو شاید کوئی اچھی بات نہ ہوئی۔'' زنوبیہ نے کہا۔

''نہیں بیوقوف! یہی تو بات اچھی ہوئی ہے۔ یہاں کیا ملا ہے مجھے اور مجھے اس ملک سے اپنا انتقام بھی لینا تھا بہرحال اب وہ فارمولا تیار ہے اور میں اس ملک سے روانہ ہو رہا ہوں، میرے ساتھ تم ہو اور دانش ہے جو مستقبل میں تمہاری زندگی کا ساتھی بننے والا ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔'' دانش نے پوچھا۔

''پورا یقین ہے کیونکہ تمہارے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے، تم اور کہاں جاؤ گے؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، اور کوئی راستہ نہیں ہے میرے پاس، لیکن ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟''

''بہت آسانی سے، کل رات اس ملک کی ایک آبدوز آنے والی ہے، وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔''

''ڈیڈی، کیا آپ کو یہ سب کرتے ہوئے دکھ نہیں ہوگا؟'' زنوبیہ نے پوچھا۔

''نہیں کیونکہ میں ناقدروں کے ملک میں زندگی نہیں گزارنا چاہتا، یہ شاید دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ٹیلنٹ کی کوئی قدر نہیں ہے، یہاں اپنے فائدے کے چکر میں ٹیلنٹ کا سر کچل کر رکھ دیا جاتا ہے اور پوری قوم تماشا دیکھتی رہ جاتی ہے۔ یہ المیہ صرف ایک شعبے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہر شعبے کا یہی حال ہے۔ اول تو کسی بھی ٹیلنٹ کو ملک میں آنے نہیں دیتے، اگر کوئی ملک میں پیدا ہو جائے وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنا چاہے تو اسے تباہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' دانش نے کہا۔

''تو بس اسی لیے میں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں ایک نئی دنیا میں، ایک نئی زندگی کی طرف، اس مرحلے میں مجھے سب سے زیادہ فکر زنوبیہ کی تھی، اس کا کیا ہوگا، ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں کا کلچر بالکل مختلف ہے، زنوبیہ کا جیون ساتھی بھی اسی انداز کا ملتا لیکن اب تم ہمارے ساتھ ہو۔''

''لیکن میں تو ایک مجرم ہوں۔''

''مجرم تم یہاں ہو، وہاں تمہیں ایک خاص اہمیت ہوگی، تم کو معزز شہری سمجھا جائے گا، کیونکہ تم پروفیسر کے ہونے والے داماد ہو گے۔''

زنوبیہ نے ایک نظر پروفیسر پر ڈالی اور پھر دانش کی طرف دیکھ کر اپنی گردن جھکا لی۔

اسی رات پروفیسر کے کہنے کے مطابق ان کا وہ سفر شروع ہو گیا تھا، جزیرے کے محافظ، اعلیٰ حکام سب کے سب بے خبر رہے تھے اور ایک آبدوز انہیں لے کر ایک انجان سفر کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

اس آبدوز تک وہ اپنی لانچ میں آئے تھے، ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا تھا، ظاہر ہے پروفیسر اپنی بیٹی اور قابل اعتماد اسسٹنٹ کے ساتھ سمندر کی سیر کو جا رہا تھا اسی لیے انہیں کون روک سکتا تھا۔

اس سفر میں کسی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا صرف پروفیسر کے پاس صرف ایک بریف کیس تھا اور بقول پروفیسر اس بریف کیس میں ایک قیمتی خزانہ موجود تھا۔ اس آبدوز کا عملہ پروفیسر کے سامنے بچھا جا رہا تھا، بہر حال یہ سب کچھ زنوبیہ کے لیے ایک خواب ہی لگ رہا تھا۔

☆☆☆

گہرے سمندر میں اس آبدوز کے علاوہ ایک اور آبدوز بھی موجود تھی۔ اس آبدوز میں کمانڈر علی تھا، جس کے ذمے یہ فریضہ دیا گیا تھا کہ غیر ملکی آبدوز کی نگرانی اور اس کا گھیراؤ کیا جائے، اس مہم کو آپریشن بلیک نائٹ کے نام سے پکارا جا رہا تھا۔ غیر ملکی آبدوز کے بارے میں لحہ بہ لحہ رپورٹ کمانڈر علی کو دی جا رہی تھی۔ انہیں دوسری آبدوز کی طرف سے ایک سگنل کا انتظار تھا اور ان کا آپریشن شروع ہو جاتا، سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ سگنل ملنے سے پہلے وہ آبدوز کہیں بین الاقوامی سمندر کی حدود میں نہ پہنچ جائے۔

''سر آخر یہ معاملہ کیا ہے؟'' ایک آفیسر نے چائے کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا مقصد ہے اس آپریشن کا؟''

''وقت آنے پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' علی نے کہا۔ ''بس اتنا سمجھ لو کہ یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے اور ہمیں ہر حال میں اس آپریشن میں کامیاب ہونا ہے۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک سامنے والی آبدوز سے سگنل موصول ہونا شروع ہو گیا تھا۔

زنوبیہ کے لیے یہ سب کچھ ایسا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے یا کوئی حیرت انگیز فلم سامنے اسکرین پر دکھائی جا رہی ہو۔ جو کچھ بھی ہوا یا جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا، اول دانش کا جزیرے پر آنا۔ زنوبیہ اور دانش کی ملاقات پھر پروفیسر کا حیرت انگیز انکشاف کہ وہ کسی اور ملک کے لیے کام کر رہا ہے اور اب یہ ایک بھیانک سفر اور اسی سفر میں اچانک وہ سب کچھ جو ایک حیرت انگیز خواب کی طرح تھا۔

دانش نے اچانک اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کا رخ پروفیسر کی جانب دیا تھا۔ ''بس پروفیسر اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

دانش نے کوئی جواب دینے کی بجائے پروفیسر پر حملہ کر دیا، اس نے پستول کے دستے کی ضرب اس کے سر پر لگا دی تھی، پروفیسر بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اس وقت یہ تینوں ایک کیبن میں تھے، زنوبیہ دم بخود ہو کر یہ سب دیکھتی رہ گئی تھی۔

''یہ...... یہ تم نے کیا کیا؟'' اس نے دانش سے پوچھا۔

''تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ تمہیں اپنے ملک کے ساتھ دینا ہے یا اپنے باپ کا؟''

''ظاہر ہے اپنے ملک کا؟''

''شاباش۔'' دانش نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''اب سب ٹھیک ہے، تم یہیں پروفیسر کے پاس رہو کیبن کا دروازہ اندر سے بند رکھنا اور صرف اس وقت کھولنا جب تمہیں میری آواز سنائی دے۔''

''لیکن تم...... تم کہاں جا رہے ہو؟''

''مجھے صرف کنٹرول روم پر قبضہ کرنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کام میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔''

دانش کیبن سے باہر چلا گیا، پروفیسر ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا، زنوبیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ باپ کی یہ حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی، پروفیسر نے ایک کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی، زنوبیہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئی۔ ''ڈیڈی، آپ نے ایسا کیوں کیا، کیوں کیا ایسا؟''

''نہیں میری جان، میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔'' پروفیسر کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی پھر اس نے پوچھا۔ ''وہ دانش کہاں ہے؟''

''وہ کنٹرول روم کی طرف گیا ہے۔'' زنوبیہ نے بتایا۔

''کاش وہ کامیاب ہو جائے۔'' پروفیسر دھیرے سے بولا۔

''ڈیڈی آپ۔''

''بیٹا یہ تم ابھی نہیں سمجھو گی۔'' پروفیسر اٹھ بیٹھا تھا ''باہر چلو، ہمیں اس کی مدد کرنی ہے۔''

اور اسی وقت کیبن کے دروازے پر دستک ہونے لگی دانش آواز دے رہا تھا۔ ''زنوبیہ دروازہ کھولو، اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔''

دانش اس منصوبے کا ایک اہم رکن تھا، اس پر انحصار کرتے ہوئے اسپیشل والوں نے اسے پروفیسر کے ساتھ اٹیچ کیا تھا، اصل میں وہ اسپیشل برانچ کا ایک اہم رکن تھا اور یہ بات اس کے گھر والے تک نہیں جانتے تھے، ایک پروگرام کے تحت اسے اسمگلر کی حیثیت دی گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ پروفیسر ایک فارمولے پر کام کر رہا تھا اور بیرون ملک کے لوگوں نے اس سے رابطے کیے تھے لیکن پروفیسر اگر اپنے ملک کے اعلا حکام کو آگاہ کر دیتا تو ان حکام میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اندر سے اس ملک سے ملے ہوئے تھے، چنانچہ پروفیسر نے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کے ملک کے ان حکام کو بھی ساتھ لے جایا جائے۔ جب ان حکام سے بات کی گئی تو انہوں نے بیرون ملک جانے کی خوشی میں اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

پھر پروگرام کے تحت پروفیسر، زنوبیہ اور دانش کے ساتھ ان تمام افراد کو بھی آبدوز میں ساتھ لے لیا گیا۔ اس طرح جب تمام افراد اس ملک کی طرف چل پڑے تو ان کا گھیراؤ شروع کر دیا گیا اور دانش نے دشمن کی آبدوز کے کنٹرول روم پر قابو پا لیا اور اپنے ملک کی آبدوز کو سگنل دے دیا اس طرح وہ سب لوگ آبدوز سمیت پکڑے گئے جو اس غداری کے مرتکب تھے۔

دانش کو اس جرات کے لیے حکومت کی طرف سے انعام دیا گیا اور سب سے بڑا انعام اس کے لیے زنوبیہ تھی جس سے اس کی شادی کر دی گئی۔

☆☆

شریف غنڈہ

شاداب ضیاء

ایک انسان کتنے روپ اختیار کرکے اس معاشرے میں اپنا کردار ادا کررہا ہے اس کے متعلق کوئی بھی درست اندازہ نہیں لگاسکتا۔ ایک شخص کا قصہ جس نے اپنے گھر والوں کو سکون دینے کے لیے اپنے کردار پر داغ لگالیا۔ ایک ایسے فرد کا کردار جو بظاہر شریف نظر آرہا تھا لیکن درحقیقت اس کا کردار بھیانک تھا اور ایک بدمعاش کا کردار جو بدمعاش ہی تھا لیکن.....

اچھے اور برے انسان کی پہچان سے ناواقف ایک معصوم لڑکی کی کتھا

زندگی کی کہانی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے کون یاد رکھے، گزرنے والا ہر لمحہ ایک نئی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ ماضی کے دھندلکوں میں بھی کچھ یادیں ابھر آتی ہیں جو حال سے منسلک ہو جاتی ہیں، ورنہ حال ہی سب کچھ ہوتا ہے کہ ہر ذی روح کی ایک کہانی ہوتی ہے اور اگر اسے تحریر کیا جائے تو ایک دلچسپ داستان بن جاتی ہے۔

میرا ماضی بھی عجیب ہے۔ یادوں کی بند کھڑکیاں کھولوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی کھڑکی کے باہر بکھرے ہوئے مناظر بیان کروں، ہر واقعہ ابتداء بن سکتا ہے۔ مثلاً وہ خوب صورت مکان جس کے لیے بڑی تگ و دو کی گئی تھی۔ جب والد صاحب نے وہ خالی پلاٹ خریدا تھا تو ہمارے حالات بہتر نہیں تھے۔ کسمپرسی کے حالات میں خریدے گئے اس پلاٹ کی بڑی اہمیت تھی اور ہم دوسرے تیسرے دن اسے دیکھنے جاتے تھے۔ پھر اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ امی نے کمیٹیاں ڈال کر کچھ رقم اکٹھی کی اور مکان کی بنیادیں تعمیر ہوئیں۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ تھوڑے سے پیسے اور جمع ہو جائیں تو اس حد تک مکان کی تعمیر ہو جائے گی کہ ہاؤس بلڈنگ سے قرض مل جائے گا لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے پہلے ہی کمیٹیوں کی خاصی رقم نکل جاتی تھی۔

والد صاحب اس وقت ایک فرم میں نوکری کرتے تھے، تنخواہ بس اتنی ہی ملتی تھی کہ گزارا ہو جائے وہ برے انسان نہیں تھے اور ان کی کمائی میں کوئی ناجائز رقم شامل نہیں تھی اس کا وہ خاص طور سے خیال رکھتے تھے، لیکن امی کو ان کی یہ نیک نفسی پسند نہیں تھی۔ وہ جھلتی ہی رہتی تھیں۔ میری دو چھوٹی بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ بھائی سب سے چھوٹا تھا اور اس وقت اس کی عمر صرف دو سال تھی، باقی دونوں بہنیں اس سے ایک ایک سال بڑی تھیں جبکہ میں ان دونوں بہنوں سے سات اور آٹھ سال بڑی تھی۔

اس دن میرا نویں کلاس کا نتیجہ نکلا تھا اور میری خوشی کی انتہا نہیں تھی اخبار سینے سے لگائے پھر رہی تھی

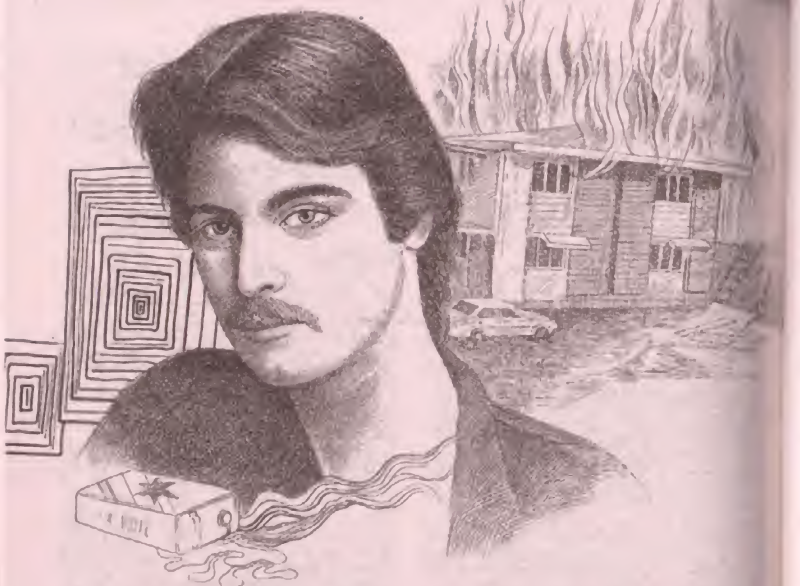

پڑوس کی محمودہ خالہ نے کہا۔ ”زریں اپنی امی کو مبارک باد دینا میری طرف سے شاید کو بخار چڑھا ہوا ہے ورنہ میں خود آتی ان سے کہنا مٹھائی کھلانا نہ بھولیں۔“

میں نے گھبرا کر امی سے کہا۔ ”امی محمودہ خالہ مٹھائی مانگ رہی ہیں“ اور امی کا چہرہ ست گیا۔ اس رات امی اور ابو کے درمیان کافی تلخ گفتگو ہوئی جو کچھ یوں تھی۔

”پڑوسی مٹھائی مانگ رہے ہیں۔“

”پہلی تاریخ کا وعدہ کرلو“ ابو نے کہا۔

”گویا اعلان کردوں کہ ہماری اوقات بس اتنی ہے۔ چونکہ روپے کے لیے ہمیں پہلی تاریخ کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”یہ اعلان ہماری عظمت ہے فریدہ۔“

”سبحان اللہ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”حلال کی روزی کمانے والوں کی یہی شان ہوتی ہے محترمہ۔“

”حلال کی روزی۔ جو لوگ زندگی میں کچھ نہیں کرپاتے وہ ان باتوں کی آڑ لیتے ہیں دوسرے تمام لوگ تو جیسے انسان ہی نہیں ہیں۔“

”مطلب؟“

”ایسی زندگی تو کوئی نہیں گزارتا۔ تھک گئی ہوں میں..... اب مصائب کی کوئی حد تو ہو۔ امید کی کوئی کرن تو ہو جس کے سہارے انسان جیتا رہے۔ ہر روز مرنا ہوتا ہے روز روز کی یہ موت۔ میں نہیں مر سکتی۔ مجھے روشنی چاہیے اجالے کو آنکھ ترس گئی ہے۔“ اور امی رونے لگیں۔

”کچھ زیادہ سنجیدہ ہو یار۔“ ابو نے بھی سنجیدہ ہو کر کہا۔

”ہاں اب مجبور ہوگئی ہوں، تھک کر چور ہوگئی ہوں۔ ضبط کے دھاگے ٹوٹ گئے ہیں۔ بتاؤ کیسے جیوں۔ کیسے پرورش کروں ان کی، اولاد ہے میری ان کی آنکھوں میں بھی آرزوئیں چمکتی ہیں کب تک جھوٹے دلاسے دے کر ان چراغوں کو روشن رکھوں۔ مجھ سے یہ بجھے چراغ نہیں دیکھے جاتے۔“

’’میں کیا کروں فریدہ مجھے مشورہ دو۔‘‘
’’یہ تمہارا کام ہے۔ میرا نہیں۔ دوسرے کیا کرتے ہیں ان سے پوچھا۔‘‘
’’جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ اچھا نہیں فریدہ۔‘‘
’’یہ صرف گریز ہے اور کچھ نہیں۔‘‘
’’واقعی سچ کہہ رہی ہو۔‘‘
’’ہاں شمیم۔ میں عاجز آ گئی ہوں۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو موت میرے لیے اس زندگی سے کہیں بہتر ہوتی۔‘‘ امی نے بدستور روتے ہوئے کہا۔ اور ابو کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ بہت دیر تک وہ کچھ نہ بولے اور تھوڑی دیر کے بعد ان کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔
’’نہیں فریدہ، مجھے صورت حال کے اس حد تک بگڑنے کا اندازہ نہیں تھا تم ٹھیک ہی تو کہتی ہو واقعی یہ گریز ہے۔ میرا خیال ہے میں اپنے فرض سے غفلت برتتا رہا ہوں، اپنی ذات کی تسکین کے لیے اپنی شرافت اور نجابت کو زندہ رکھنے کے لیے میں نے تم سب کو مار دیا ہے خیال نہیں آیا تھا یار معاف کر دو مجھے تمہاری زندگی چاہیے تم۔ فریدہ تم میرے لیے بہت زیادہ اہم ہو۔ میں اپنی ذات کو تم پر قربان کر سکتا ہوں۔ ایسی بات نہیں تھی یار ایسی بات نہیں تھی چلو معاف کر دو۔ وقت بدل جائے گا فریدہ وقت واقعی بدل جائے گا۔‘‘ ابو کا لہجہ عجیب ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔ امی خاموش ہو گئیں اور اس کے بعد کوئی بات نہ ہوئی۔
مٹھائی پہلی تاریخ ہی کو آئی تھی کیونکہ اس میں زیادہ دن نہیں تھے لیکن اس کی مقدار اتنی تھی کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ مزدور مٹھائی کے تین ٹوکرے لاد کر لائے تھے اور پڑوسیوں کو اتنی اتنی مٹھائی بھجوائی کہ وہ بھی حیران رہ گئے اور اس کے بعد حالات بدلنا شروع ہو گئے یہ نا معلوم ہو سکا کہ ابو نے شرافت کی کینچلی کب اتار پھینکی اور کس طرح انہوں نے دنیا سے اپنا حصہ وصول کرنا شروع کیا بس میں نے یہ دیکھا کہ دو مہینے کے اندر امی کے جسم پر سونے کے زیورات نظر آنے لگے ہمارے کپڑے تبدیل ہو گئے اسکول کے یونیفارم ایک کے بجائے چار چار سل گئے نئے جوتے آئے گھر میں نیا فرنیچر آیا اور پرانی چیزوں کو ردی خریدنے والوں کے ہاتھوں کوڑیوں کے دام فروخت کر دیا گیا۔ گھر کا چولا ہی بدل گیا تھا دوسری طرف ہمارے اس مکان کی تعمیر بھی شروع ہو گئی۔
امی ایک بار ہم سب کو بنتا ہوا مکان دکھانے کے لیے لے گئیں ہم نے دیکھا کہ مکان کے نقشے میں بھی کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں پہلے ایک سادہ سی رہنے کی جگہ بنائی جا رہی تھی لیکن اب کی تعمیر کا پورا پلان بدل گیا تھا بہت سے مزدور کام پر لگے ہوئے تھے ایک ٹھیکے دار نے مکان کی تعمیر کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔
صورتحال تبدیل ہوئی تو ہم اپنا ماضی بھول گئے امی بھی خوش نظر آتی تھیں اور ہم سب بھی خوش تھے لیکن ابو کے چہرے کی وہ ہنسی کم ہو گئی تھی جو ہم سب کے لیے بہت قیمتی تھی۔ گھر میں آنے کے بعد ہمارا سارا وقت ابو کے ساتھ گزرتا اور اس دوران میں وہ ہمیں کہانیاں اور لطیفے سناتے رہتے تھے بات بات پر ہنستے رہتے تھے اور ہنساتے تھے لیکن اب وہ لطیفے سنانا بھول گئے تھے انہیں کوئی کہانی یاد نہیں رہ گئی تھی بلکہ انہوں نے ہمیں ایک ٹیپ ریکارڈ لا کر دے دیا تھا جس پر ہم کیسٹ کہانیاں سنا کرتے تھے اور ٹیلی ویژن بھی آ گیا تھا اور زندگی کی دوسری تمام ضروریات آہستہ آہستہ ہمارے گھر میں بھرتی جا رہی تھیں۔ ٹیلی ویژن کے ڈرامے تھے ٹیپ ریکارڈ پر کہانیاں تھیں بس ابو کی کہانیاں ہم نہیں سن پاتے تھے وہ ہمارے ساتھ زیادہ وقت بھی نہیں گزارتے تھے دفتر سے واپس آئے کوئی دوست ملنے آ گیا تو باہر جا بیٹھے چائے پہنچتی رہی اور اس کے بعد دوستوں کے ساتھ ابو بھی کہیں چلے گئے۔
وقت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا رہا میں نے میٹرک کیا فرسٹ ایئر میں داخل ہو گئے اور جب میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی تو ہم اپنے نئے تعمیر شدہ مکان میں چلے گئے۔
ابو نے مکان بننے سے پہلے ہمیں منع کر دیا کہ اب ہم وہاں نہ جائیں وہ ہمیں چونکانا چاہتے تھے پھر جب ایک دن ہم اپنے سامان سمیت وہاں پہنچے تو مکان دیکھ کر دنگ رہ گئے امی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں

ان تھا کہ ایک خوب صورت کھلونا اتنا سجا ہوا اتنا حسین یقین نہ آئے ہم اس کی ایک ایک چیز کو دیکھتے ہے۔ شاندار فرنیچر سے آراستہ حسین پردے پڑے ہوئے۔ امی نے گیراج کی خالی جگہ دیکھ کر کہا۔
’’شمیم یہ گیراج خالی کیوں ہے؟‘‘
’’اس لیے محترمہ کہ گاڑی آپ کی پسند سے خریدی جائے گی۔‘‘ ابو نے جواب دیا۔
’’واقعی، واقعی شمیم کیا۔ کیا؟‘‘
’’جی ہاں۔ دو چار دن ذرا اسے ترتیب دے لیں اس کے بعد گاڑی بھی آ جائے گی۔‘‘
اور گاڑی آ گئی۔ گاڑی آئی تو گویا گھر میں ہر روز عید ہو گئی شام میں گھومنے نکلتے، کبھی سفاری پارک، کبھی ہل پارک کبھی کلفٹن اور کبھی اولڈ کلفٹن ہوٹلوں میں کھانے کھائے جاتے یہ ساری باتیں خوابوں کی سی باتیں معلوم ہوتیں جو وقت گزار چکے تھے اس کے بعد یہ وقت ایسا حسین تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خواب دیکھ رہے ہوں، آنکھ کھل جانے کے خوف سے ہمیشہ لرزتے رہتے تھے۔
لیکن امی تسلی دیتی رہتیں، کہتی تھیں کہ یہ کچھ خواب نہیں ہے۔ انٹر کا رزلٹ آیا تو خوشیوں کی انتہا نہ رہی مٹھائیوں کے مخصوص قسم کے ڈبے تقسیم کیے گئے تھے اور مجھے وہ گزرا ہوا لمحہ یاد آ رہا تھا جب محمودہ خالہ نے مجھ سے مٹھائی مانگی تھی اور ہمارے گھر میں مٹھائی کے لیے پیسے نہیں تھے۔ غالباً وہی لمحہ ہماری تقدیر کے بدلنے کا لمحہ بنا تھا۔ اسی گفتگو نے ہمارے گھر کی کایا پلٹ دی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی اس وقت میں نے سوچا تھا کہ اگر امی پہلے ہی ابو سے گفتگو کر لیتیں تو شاید ہمیں وہ تلخ لمحات دیکھنے ہی نہ پڑتے۔ ابو پہلے ہی مستعد ہو جاتے۔ سچ بات ہے انسان کی زندگی کے لیے ایک لمحہ تبدیلی کا لمحہ ہوتا ہے، ہمارے دن اس طرح پھرے تھے کہ یقین نہیں آتا تھا۔ دن عید اور رات شب برات کی مانند گزر رہی تھی۔ کوئی مسئلہ نہیں رہ گیا تھا۔ انٹر میں کامیابی کے بعد پروگرام تھا کہ بی اے کیا جائے چنانچہ تیاریاں شروع ہو گئیں۔ چھٹیوں کے دن گزار رہی تھی کہ وہ منحوس شام آ گئی جب تاریکیوں کا آغاز ہو گیا۔ سورج چڑھنے کے بعد ڈھلتا ضرور ہے اس شام ابو واپس نہیں آئے ان کے آنے کا وقت ہو گیا لیکن ان کی مصروفیات ذرا مختلف ہو گئی تھیں اس لیے تشویش نہ ہوئی۔
رات ہو گئی کھانے پر بھی ابو نہیں تھے پھر اور رات گزر گئی، اور جب بارہ بج گئے تو امی کی پریشانیوں کا آغاز ہوا۔
’’تعجب ہے کوئی اطلاع بھی نہیں آئی ابھی تک، کہاں مصروف ہو گئے۔‘‘ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذہن کے کسی گوشے میں کوئی ایسا تصور نہیں تھا جو خوف پیدا کرے ساری رات گزر گئی، ہم لوگ تو سو گئے لیکن امی جاگتی رہیں دوسری صبح وہ بے چین ہو کر باہر نکل گئیں اور تقریباً گیارہ بجے لرزاں و ترساں واپس آئیں ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھوں سے خوف ٹپک رہا تھا۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اندر آ کر بیٹھ گئیں، میں اب بچی نہیں تھی کہ ان کی اس کیفیت کا جائزہ نہ لے پاتی۔ ابو کے بارے میں میرا دل ہول رہا تھا۔ ہم سب ہی پریشان تھے اور امی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔
’’کچھ پتا چلا۔‘‘ میں نے سوال کیا اور امی نے سہمی ہوئی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر بولیں۔
’’ہاں۔‘‘
’’وہ......وہ گرفتار ہو گئے ہیں۔‘‘
’’کیا ہو گئے ہیں۔‘‘ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
’’شمیم، شمیم گرفتار ہو گئے ہیں۔‘‘ امی نے کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ان کے رونے میں ہم بھی شامل ہو گئے ہیں بھلا میں کیوں سمجھتی کہ ابو کیوں گرفتار ہو گئے ہیں لیکن امی کا دل شاید سب کچھ جان رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام انہیں خاموش کیا اور پھر پوچھا۔
’’امی کیوں گرفتار ہو گئے ہیں ابو کیا ہوا؟‘‘
’’خدا جانے۔‘‘ امی نے جواب دیا۔
ہمارے اطراف کچھ بھی نہیں تھا تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ صرف کچھ شناسا تھے جن سے ملاقات

تھی ...... نئے محلے کے لوگ بھی کچھ، واقف کار تھے لیکن بات کچھ ایسی تھی کہ دوسرے لوگوں کو اس کی اطلاع بھی نہیں دی جاسکتی تھی۔

شام کو تقریباً ساڑھے چار بجے ابو کے کچھ دوست آئے اور انہوں نے امی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جب سے ہم ذرا جدید ہوئے تھے امی نے ابو کے دوستوں کے سامنے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کے سامنے پہنچ گئیں۔

”بھابھی آپ کو صورت حال کا علم تو ہو گیا ہو گا۔“ ابو کے ایک دوست نے کہا۔

”ہاں بھائی صاحب ہم بدنصیبوں کا تو کوئی بھی نہیں ہے یہاں۔ ہم سب ہیں۔ میں ہوں، میری بچیاں ہیں چھوٹا سا بچہ ہے ہم سب بالکل بے بس اور لاوارث ہیں۔“

”نہیں بھابھی ایسی بات نہیں آپ ہمیں بتائیے کہ ہم کیا کریں۔“

”بھائی صاحب میں کچھ نہیں جانتی مجھے یہ تو پتا چلے کہ کیا کیا ہے شمیم نے۔“

”بھابھی۔ شمیم بھائی ایک مثالی انسان تھے جو کچھ ہوا ہے اس پر ان لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا جو نقصان اٹھا چکے ہیں لیکن حالات واقعات اور ثبوت اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ شمیم بھائی نے چھتیس لاکھ روپے کا غبن کیا ہے انہوں نے ایسے فراڈ کیے ہیں بھابھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے یہی نہیں بلکہ ایک اور چارج لگایا گیا ہے ان پر۔ انہوں نے منشیات کی اسمگلنگ کرنے والے ایک گروہ کے افراد سے قائم کر رکھا ہے اور تقریباً دس لاکھ روپے سے یہ نیا کاروبار شروع کیا تھا۔“

”کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا ہے ان کی نشان دہی پر انہوں نے تمام صورت حال بتائی ہے اسمگلنگ کے اس کاروبار میں شمیم بھائی برابر کے شریک ہیں حالات بہت بگڑے ہوئے ہیں بھابھی آپ ہمیں بتائیے ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں۔“

”خدا کے لیے ان کی ضمانت تو کرادو کسی طرح ان کی ضمانت تو کرادو۔“

”بھابھی ضمانت آسان نہیں ہے جب تک کمپنی کے مالکان اس سلسلے میں نرم نہیں پڑیں گے ضمانت نہیں ہو سکتی کیس بہت سنگین ہے۔“ ابو کے دوست نے کہا اور امی زار و قطار رونے لگیں۔

”رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا بھابھی ہمیں ہماری خدمات بتائیے ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔“

”بھائی جو مناسب سمجھو کرو۔ میں ہر طرح حاضر ہوں۔“

”تو پھر کسی عمدہ سے وکیل سے رابطہ قائم کیا جائے گا آپ کو اس سلسلے میں کچھ خرچ کرنا ہوگا بھابھی۔“

”بہت کچھ موجود ہے میرے پاس جو کچھ ہے لٹادو ان پر مگر خدا کے لیے ان کی زندگی بچالو۔“ امی کو شاید اب یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ ان کا کیا دھرا ہے وکیل صاحب نے امی سے ملاقات کی، ابو سے ملے، خاصی رقم دی گئی تھی انہیں جو امی نے اپنے ذاتی بینک بیلنس سے نکال کر دی تھی ابو کے معاملات کیا تھے اس کے بارے میں امی نے بتایا کہ انہیں خود پتا نہیں ہے ان کے کاغذات بھی یہاں موجود نہیں تھے ابو نے بھرپور کام کیا تھا چھتیس لاکھ روپے کا غبن معمولی بات نہیں تھی جب وکیل صاحب لاک اپ میں ابو سے ملے تو ابو نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی ضمانت نہیں چاہتے امی نے ان سے ملنا چاہا تو ابو نے انکار کر دیا۔

امی اس بات سے اور زیادہ ہراساں ہو گئیں اور اتنی پریشان ہوئیں کہ انہیں شدید بخار نے آلیا۔ ابو کو تھانے سے جیل بھیج دیا گیا اور اس کے بعد ان پر مقدمہ چلتا رہا۔ ہم سب کی حالت بری ہو گئی تھی۔ ایک خوف، ایک ہراس ہمارے دل میں تھا۔

کالج کے داخلے شروع ہو گئے۔ لیکن میرے داخلہ لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، میں تو ابو کی واپسی چاہتی تھی۔ بمشکل تمام ابو نے ایک دن ہم لوگوں کو ملنے کی اجازت دے دی اور ہم سب جیل پہنچ گئے، کیا خوف ناک ماحول تھا وہاں کا، ہمیں اس کٹہرے کے سامنے پہنچا دیا گیا جس کے پیچھے ابو موجود تھے۔

ابو کی حالت تباہ ہو گئی تھی شیو بڑھا ہوا تھا بال بکھرے ہوئے تھے لباس بے ترتیب تھا ابھی انہیں قیدیوں کا لباس نہیں پہنایا گیا تھا کیونکہ ابھی مقدمہ چل رہا تھا ان پر جس کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ امی سے انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں صرف چند الفاظ کہے۔

”میرا مشن پورا ہو چکا ہے اب سے آگے کی زندگی تمہیں سنبھالنا ہوگی۔“ ابو کی اس بات پر امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، لیکن ابو کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ انہوں نے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

”بیٹی نوشابہ اب تم بڑی ہو چکی ہو، صورت حال کو یقیناً سمجھ رہی ہوگی۔ بات کچھ نہیں ہے تمہاری امی اپنی زندگی سے تنگ آ گئی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو وہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتیں۔ مجھے ان کی خودکشی گوارا نہیں تھی اور تم سب کے لیے میں نے خودکشی کی ہے بیٹی مجھے یہ حرام موت قبول ہے۔“ ابو کے ان الفاظ پر میری جو کیفیت ہوئی اسے میں بیان نہیں کر سکتی دفعتاً نفرت کا ایک جذبہ پیدا ہوا تھا میرے سینے میں اپنی ماں کے لیے اس ماں کے لیے جس کا نام ہی شیرینی کی علامت ہے۔

میں جانتی تھی، میں نے وہ الفاظ اپنے کانوں سے سنے تھے، میں نے ابو کی سنجیدگی کو محسوس کیا تھا۔ ہاں وہی رات ہماری تکلیف دہ زندگی کی آخری رات تھی اور اس کے بعد ابو نے ہماری زندگی میں خوشیاں بکھیر دیں۔ وہ کہتے تھے کہ کسمپرسی اور بے بسی کا اعلان ہماری عظمت کی علامت ہے۔ وہ اپنی عظمت کو زندہ رکھنا چاہتے تھے لیکن اس نے ان کی عظمت کو قتل کر دیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ حلال روزی کمانے والوں کی یہی شان ہوتی ہے لیکن اس نے کہا تھا جو لوگ زندگی میں کچھ نہیں کر پاتے وہ اس احساس کا سہارا لیتے ہیں اور یہی الفاظ ان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ تب ابو نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ زندگی میں بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن اس کچھ کے راستے تباہ کن ہوتے ہیں۔ زندگی کے تعیشات سے خوب لطف اندوز ہوئے تھے، اب یہ تاریکیاں بھی دیکھنی تھیں اور اب ابو ان تاریکیوں میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ چلتے وقت ابو نے کہا۔

”اگر مناسب سمجھو فریدہ۔ تو ان معصوم بچوں کو آئندہ میرے پاس جیل میں نہ لانا یہاں ان پر جو نگاہیں پڑتی ہیں وہ میری ذات کے لیے بہت تکلیف دہ ہیں۔ اگر تم یہ تکلیف بھی مجھے دینا چاہتی ہو تو دوسری بات ورنہ میری خواہش یہی ہے کہ مجھ سے ملاقات کے لیے نہ آیا جائے۔“ مقدمہ چلا عدالت میں کٹہرے کے پیچھے کھڑے ہو کر ابو نے جرم کا اعتراف کیا اور کہا کہ ”ہاں یہ رقم انہوں نے ضرورتاً غبن کی ہے اور اسے واپس نہیں کر سکتے جب ان سے منشیات کی تجارت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں لکھ پتی سے کروڑ پتی بننا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اس معاملے میں پورا پورا حصہ لیا اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔“ ابو کے وکیل سر پیٹ کر رہ گئے واپسی میں عدالت کے کمرے سے نکلے تو وہ امی پر برس پڑے۔

”آپ کے شوہر شاید پاگل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے خود ہی کیس بگاڑ دیا ہے مجھے تو صرف یہ افسوس ہے کہ میں اپنے ہی موکل کے ہاتھوں اپنا کیس ہار رہا ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا محترمہ نہ مجھے آپ سے کچھ چاہیے اور نہ میں اس احمق آدمی کا کیس لڑوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ جھلاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ امی سسکیاں بھرتی ہوئی واپس آ گئی تھیں میں نے اس موضوع پر کبھی امی سے کوئی بات نہیں کی، میں جانتی تھی کہ صورت حال انہی کی بگاڑی ہوئی ہے۔

مقدمے کا فیصلہ بالآخر ہو گیا۔ ابو کے سات سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اس کے علاوہ عدالت نے حکم دیا کہ فرم اپنے چھتیس لاکھ روپے حاصل کرنے کے لیے اس تمام ساز و سامان کی مالک ہے جو ابو کی تحویل میں ہے۔ ہمارا گھر ہم سے چھن گیا گاڑی چھین لی گئی صرف چند چیزیں ہمارے سپرد کر کے ہمیں حکم دیا گیا کہ ایک ہفتے چمک دمک کی وہ زندگی جو امی کی خواہشات کا حامل تھی ایک دم ختم ہو گئی تھی بس اس طرح جیسے کوئی جلتا ہوا

بلب بجھ جاتا ہے۔

ہمارے تمام اثاثے پر قبضہ کرلیا گیا تھا اور اب اس خوب صورت مکان میں جس کا پلاٹ امی نے کمیٹیاں ڈال ڈال کر خریدا تھا ہمارے صرف چند لمحات باقی رہ گئے تھے جو وقت آنا تھا اسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا گزرے ہوئے واقعات کا رونا رونے کے لیے تو زندگی پڑی تھی مسئلہ یہ تھا کہ اب کہاں جائیں۔ ابو کے وہ دوست جو ہمیں دلاسے دینے آتے تھے اور امی سے خاصی رقمیں کھینچ کر لے جاتے تھے اب گم ہو گئے تھے انہیں پتا تھا کہ صورت حال اب دوسری شکل اختیار کرچکی ہے اور یہ وقت واپسی کا وقت ہے۔

کوئی اور ترکیب بھی امی کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ ان دنوں وہ اسی سوچ میں غلطاں تھیں کہ اب کیا کیا جائے۔ پرانے محلے کے لوگوں سے رابطہ تقریباً کٹ گیا تھا وہ ہمارے برے دنوں کے رازدار تھے۔ چنانچہ بڑے لوگوں کی بیگمات کے درمیان بیٹھ کر امی کبھی محمودہ خالہ کو اپنے درمیان پسند نہیں کرسکتی تھیں کیونکہ محمودہ خالہ ان سے اس طرح باتیں کرتی تھیں جیسے اپنے محلے میں۔

ایسے جاہل اور بدتمیز لوگوں کو اپنے نزدیک بلانا اپنی حیثیت کو خراب کرنا تھا۔ چنانچہ ان سب سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ امی دو تین بار اس بے رخی سے ان سے پیش آئیں کہ پھر ان کے آنے کی جرات نہ ہوئی اور اب تو عرصہ گزر چکا تھا کہ ہم ان سے نہیں ملے تھے، امی نے مجھ سے کہا۔

''تم بڑی ہوگئی ہو نوشابہ۔ مشورہ دو کہ اب کیا کیا جائے برا وقت آچکا ہے ہم پر، جو کچھ کرنا ہے ہمیں ہی کرنا ہے تم دیکھ رہی ہو کہ سب آہستہ آہستہ رخصت ہوگئے ہیں۔''

''امی آپ کے فیصلے زیادہ مضبوط اور قوی ہوتے ہیں، آپ کی سوچ بلند ہے آپ ابو جیسے آدمی کو مشورہ دے سکتی ہیں تو بھلا میری ناقص رائے آپ کے لیے کیا ہوگی۔'' جواب میں امی رو پڑیں۔ اگر وہ چراغ پا ہوتیں میری اس طنز پر تلملا جاتیں مجھے برا بھلا کہتیں تو مجھے دکھ نہ ہوتا یہ سب کچھ تو کرتی ہی رہی تھیں لیکن بے بسی کے ان آنسوؤں نے میرے دل کا غبار دھو دیا اور میں امی کے ساتھ رونے لگی۔ امی نے کہا۔

''نوشابہ ہوسکے تو مجھے معاف کردو شمیم سے تو اب میں معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ ہماری وہ چھوٹی سی جنت اس جہنم سے کہیں زیادہ حسین تھی، جو چیز ہمیں مل جاتی ہے ہم اسے ٹھکرانے پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور جو چیز نہیں ملتی اس کے پیچھے دوڑتے ہیں، یہ جانے بوجھے بغیر کہ جو مل جائے گا وہ کیا ہوگا۔ نوشابہ میں تم سب کی مجرم ہوں مجھے سولی پر چڑھادو مگر خدا کے لیے میرے دل کو زخمی نہ کرو۔ بڑا درد ہوتا ہے میرے دل میں۔'' میں روتی رہی امی نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم محمودہ خالہ سے مل کر پرانے محلے میں کرائے کا کوئی مکان تلاش کریں کچھ ایسی چیزیں اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں جن کی فہرست نہ بنائی گئی تھی اور ان چیزوں سے ہم کم از کم اتنا فائدہ اٹھا سکتے تھے کہ اپنا کوئی چھوٹا سا مکان لے کر کچھ وقت گزار سکیں۔

بہرطور میں نے اس بات کی مخالفت کی کہ پرانے محلے میں واپس جایا جائے، کس منہ سے جاتے ہم لوگ۔ لوگ کہتے کہ چمک دمک کا دور ختم ہوگیا، اور واپس اپنی اوقات پر آگئے چنانچہ کوشش یہ کی گئی کہ کسی دوسری ایسی بستی میں جہاں چھوٹے لوگ رہتے ہوں اور اس کوشش میں کامیابی ہوہی گئی۔

دو منزلہ مکان تھا لیکن صورت حال یہ تھی کہ اوپر صرف دو ہی کمرے تھے جن پر سیمنٹ کی چھتیں پڑی تھیں ایک چھوٹا صحن تھا غسل خانہ اور باورچی خانہ وغیرہ تھا کہ یہ تین سو روپے ماہوار، ہمیں وقتی طور پر یہ جگہ غنیمت محسوس ہوئی کم از کم اتنا سرمایہ تھا ہمارے پاس کہ دو چار سال کا کرایہ ہی دے سکتے، کھانے پینے کا اللہ مالک تھا بظاہر تو کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔

چنانچہ عزت آبرو کے ساتھ اس مکان میں پہنچ گئے جہاں ہمارا کوئی شناسا نہیں تھا لوگ نہیں جانتے تھے کہ ابو نے کیا کیا ہے اور کہاں ہے۔ بس مکان مالکہ نے ہم سے یہی پوچھا کہ یہاں کون کون رہے گا

اور امی نے بتادیا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہیں گی ایڈوانس چھ مہینے کا دیا گیا اور ہم اپنے اس مکان میں منتقل ہوگئے تھوڑا سا الٹا سیدھا سامان خرید لیا گیا۔ چونکہ مکان کا چارج دیتے ہوئے ہم کو ہر چیز کی فہرست کے مطابق ان لوگوں کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ کار گئی بنگلہ گیا زندگی کی عیش و آسائشیں گئیں اور اب یہ مکان تھا جس میں بچے گرمی سے بری طرح بلبلا جاتے تھے۔ وہ سب احتجاج کرتے تھے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ صورت حال کیا ہوگئی ہے۔ ابو کی غیر موجودگی نے ہی ان پر بہت برا اثر ڈالا تھا اور اب اس تکلیف دہ مکان میں آکر زندگی کے تمام لوازمات چھوڑ کر وہ شدید گھٹن کا شکار ہوگئے کافی عرصے تک میرے بہن بھائی بیمار پڑتے رہے لیکن آہستہ آہستہ اس تلخ اور تکلیف دہ زندگی کے عادی ہوگئے اب ایک خوف ناک مستقبل ہمارے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا ابو کی قید کو تو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔ ابھی تو ان کی واپسی میں چھ سال تھے۔ اس دوران انہوں نے ہم سے صرف دوبار ملاقات کی ظاہر ہے ہم لوگ اس طرح جا بھی نہیں سکتے تھے۔ میں اور امی ہی ابو کے پاس گئے تھے بچوں کو دیکھنے کی خواہش ابو نے ظاہر کی تھی اور امی نے کہا تھا کہ چند روز کے بعد انہیں بھی ملانے لے آئیں گی لیکن صورت حال بڑی خوف ناک تھی ان کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ بچوں کو ابو سے ملائیں، انہیں تڑپا کر رکھ دیں۔ امی کی صحت خراب ہوتی جارہی تھی۔ یہ احساس ان کو کھائے جارہا تھا کہ جب یہ بچی کھچی پونجی ختم ہوجائے گی تو پھر کیا ہوگا زندگی کس طرح گزرے گی اور اس وقت میں نے اپنے دل میں ایک عزم کیا۔ میں نے کہا۔

''امی بدقسمتی سے ہمارا بھائی سب سے چھوٹا ہے ابو کے واپس آنے سے پہلے ہمیں ایک ایسا ماحول تیار کرنا ہوگا امی کہ ابو کو اس کا دکھ نہ ہو۔ اور اس کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ میں میدان عمل میں آجاؤں یہ دور ایسا نہیں ہے کہ لڑکیاں اپنا بوجھ نہ سنبھال سکیں۔ میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔''

''تم، تم ملازمت کروگی......؟''

''ہاں امی میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''مگر نوشابہ تمہیں تو اس کا تجربہ نہیں ہے۔''

''جو کچھ آپ نے پڑھایا ہے امی میں اب اس کی ادائیگی کرنا چاہتی ہوں۔ ملازمت مل ہی جائے گی کہیں نہ کہیں۔ اخبار دیکھوں گی جہاں جہاں ملازمتوں کے اشتہار نکلتے ہیں وہاں درخواستیں دوں گی، کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔'' امی نے سہمی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا میری عمر اب ان حدود میں داخل ہوچکی تھی جہاں دلکشی اور رعنائیاں خود بخود جھلکتی ہیں۔ گو میں نے کبھی اپنے وجود پر توجہ نہیں دی تھی لیکن امی کی نگاہ میں، میں اب ٹائم بم تھی جو مقررہ وقت پھٹ سکتا ہے۔ نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی ہوں گی وہ اس سلسلے میں لیکن میں اپنے ارادوں میں اٹل تھی۔ میں نے ان کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ آخر اس زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنا تھا ہی لغزش کس کی تھی، گناہ کس نے کیا تھا سزا کون پا رہا تھا یہ ساری باتیں اب بے معنی ہوگئی تھیں۔ اب تو مجھے اس سزا میں شریک ہونا تھا جو امی نے ہم سب کے لیے منتخب کی تھی۔

دوسرے ہی دن میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ امی کے اعمال کی سزا میں اپنے بہن بھائیوں کو نہیں دے سکتی تھی، اخبارات کھنگالے جو جو اشتہارات میری ملازمت کے قابل ہوسکتے تھے ان کے لیے درخواستیں لکھیں اور روانہ کردیں۔ اور پھر یہ میرا روز کا معمول بن گیا۔ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ دوسرے ہی ہفتے مجھے کچھ جگہوں سے جواب موصول ہوئے اور اب مجھے دو جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا پہلی جگہ ایک گارمنٹ انڈسٹری تھی جس میں ایک کلرک کی ضرورت تھی وہاں پہنچی تو وہاں کے ماحول سے کچھ طبیعت لگ نہ سکی۔ انٹرویو دیا اور واپس آگئی۔ دوسرے دن دوسری جگہ انٹرویو دینا تھا۔ یہ دوسری جگہ مجھے پسند آئی۔ امپورٹ ایکسپورٹ کرنے والی ایک فرم تھی۔ وہاں میرا انٹرویو ہوا انٹرویو لینے والوں میں تین افراد شامل تھے۔

مجھ سے مختلف سوالات پوچھے گئے اور اس کے

بعد مجھے اطلاع دینے کے لیے کہا گیا۔ میں نے دنیا کے بہت سے رنگ ابھی نہیں دیکھے تھے لیکن کم از کم حالات کا اتنا اندازہ ضرور تھا کہ جب انسان مصائب کا شکار ہوتا ہے تو چاروں طرف سے اسے مایوسیوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اسی پر اکتفا نہ کی اور مسلسل اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ جس فرم میں، میں نے انٹرویو دیا تھا جس کی طرف سے جواب موصول ہوگیا مجھے میری ڈیوٹی پر طلب کرلیا گیا تھا۔ یہاں تقریباً اٹھارہ آدمیوں کا اسٹاف تھا۔ مجھے انہی کے درمیان بیٹھنا تھا۔ لیکن تقریباً ڈیڑھ ماہ ملازمت کی تھی میں نے وہاں کے مجھے نوٹس مل گیا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی، اس لیے مجھے اس آزمائشی مدت کے بعد سبکدوش کیا جاتا ہے۔ میں نے صبر وسکون سے یہ فیصلہ سنا اور اپنی تنخواہ لے کر گھر آ گئی۔ امی نے اب اپنے آپ کو ان تمام حالات کا عادی بنالیا تھا چنانچہ ہم نے ایک دوسرے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور میں نے دوبارہ کوشش شروع کردی جو پہلے آ گئے تھے انہیں غنیمت سمجھا گیا۔ مکان کا کرایہ ابھی ہماری جمع شدہ پونجی سے نکل رہا تھا اسی لیے زیادہ وحشت نہ تھی یہ امید تھی کہ کم از کم سر چھپانے کی جگہ نہیں چھن سکے گی۔ باقی کھانے پینے اور دوسرے اخراجات کا معاملہ تھا وہ چلانے کے لیے خاصی تنگی ترشی سے کام لینا پڑتا تھا بچوں کو اچھے اسکولوں سے اٹھا لیا گیا تھا اور فریبی اسکولوں میں ڈال دیا گیا تھا جہاں ان کی فیسیں نہیں جاتی تھیں۔ بس دوسرے کچھ ایسے اخراجات تھے جن کی ادائیگی کچھ بہت زیادہ مشکل نہیں ہورہی تھی۔ کھانے پینے کے معاملات کچھ یوں تھے کہ ہم تقریباً اچھا کھانا بھول گئے تھے۔ بس اتنا کھا لیا کرتے تھے کہ پیٹ بھر جائے اور تن ڈھک جائے۔

تیسرے ہی ہفتے مجھے پھر ایک فرم میں ملازمت مل گئی یہ فرم پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ یہاں پر مجھے یہ ہدایات دی گئیں کہ میں ٹائپ سیکھ لوں اس کے لیے مجھے مراعات بھی دی گئی تھیں اور میں نے ٹائپ سیکھنا شروع کردیا۔ کلرک ہی کی پوسٹ تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میری تھوڑی بہت ٹائپ اسپیڈ ہوگئی تھی مجھے ایک ٹائپ رائٹر دے دیا گیا۔ مہربان لوگ تھے خاص طور پر اس فرم کے منیجر مسٹر تنویر صاحب دراز قامت صحت منداور خوب صورت آدمی تھے۔ چہرے سے اتنی نرمی اور شرافت ٹپکتی تھی کہ ان پر خواہ مخواہ اعتماد کرنے کو دل چاہا تھا جس کسی سے بات کرتے اتنے نرم لہجے سے کرتے کہ انسان خود بخود متاثر ہوجائے۔ دفتر کے تمام ہی لوگ ان کی تعریف کرتے تھے۔ اس دفتر میں میرے علاوہ چار لڑکیاں اور تھیں ان میں ایک کرسچن تھی اور تین مسلمان ہر لڑکی اپنے اپنے رنگ میں مست تھی۔ مختلف کام تھے ان کے سپرد یہاں وہ ہنستی مسکراتی اور ہر شخص سے ہنسی مذاق کرتی لیکن میں ابھی اس ماحول میں گھلی ملی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میری یہ فطرت نہیں تھی کہ بلاوجہ کسی سے گفتگو کروں، ہاں لڑکیوں سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ عائشہ جو ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی عام طور سے سفید لباس میں ملبوس رہتی تھی۔ اس کے انداز میں ایک وقار ایک تمکنت جھلکتی تھی روزی اپنی فطرت کے مطابق تھی، ایک سے ایک بھڑکیلا لباس پہنتی، ہر وقت ہنستی رہتی اور ہر شخص سے اس کا مذاق تھا۔ باقی دو لڑکیوں میں نزہت اور شمسہ تھیں، شمسہ کے بارے میں تو کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ ملازمت کرنے کیوں آتی ہے، میں نے اسے ہر روز ایک نئے لباس میں دیکھا تھا سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ اس نے کتنے کپڑے بنائے ہوئے ہیں، ایک سے ایک قیمتی اور خوب صورت لباس ہوتا تھا، بڑے طمطراق سے آتی تھی۔ دوپہر کو لنچ کرنے کے لیے قریب کے ایک شاندار ہوٹل میں جاتی تھی تو تنہا ہی ہوتی تھی لیکن کئی بار اس نے اپنی ساتھی لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ لنچ کی دعوت دی تھی، ایک دو دفعہ مجھے بھی پیش کش کی، لیکن میں نے معذرت کرلی اور کہا کہ میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاتی۔

بہرطور معاملات پرسکون چل رہے تھے، ٹائپنگ کی اسپیڈ بڑھتی جارہی تھی اور میں پوری محنت

اور دیانت سے اپنا کام انجام دے رہی تھی۔ دفتر کا ماحول ملا جلا تھا مرد بھی تھے اور ان میں خاص طور سے قابل ذکر تھے۔ لمبے چوڑے تن وتوش کا آدمی، بڑی بڑی مونچھیں، داہنے گال پر ایک مسہ، شکل ہی سے لفنگا لگتا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی چک پائی جاتی تھی۔ لڑکیاں اس سے خاص طور سے خوف زدہ رہتی تھیں۔

عائشہ نے ایک دن مجھ سے کہا۔

''نوشابہ تم ایک شریف لڑکی ہو، دفتر میں بہتر یہ ہوگا کہ کسی سے زیادہ ربط ضبط نہ بڑھاؤ، یہ لوگ تمہارے بارے میں بہت چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔''

''کون؟'' میں نے خوفزدہ ہوکر پوچھا۔

''مختلف لوگ، نادر عموماً تمہیں گھورتا رہتا ہے۔ کیا تم نے کبھی اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی ہوس نہیں دیکھی۔''

''تم مجھے ڈرا رہی ہو عائشہ۔''

''نہیں بہن ڈرا نہیں رہی محتاط کررہی ہوں، ہوشیار۔''

اس نے کہا اور درحقیقت نادر سے مجھے بے پناہ خوف محسوس ہونے لگا۔ میں نے خود بھی کئی بار محسوس کیا کہ وہ اپنی میز پر بیٹھا ہوا مجھے گھورتا رہتا ہے۔ شمسہ کے نادر سے بڑے قریبی تعلقات تھے اور وہ فارغ اوقات میں اکثر نادر کی میز کے سامنے جا بیٹھتی تھی اور اس کے بعد نادر کے اور اس کے قہقہے گونجتے رہتے، دفتر کے عملے کے دوسرے لوگ بھی نادر سے خوف زدہ رہتے تھے کچھ ایسا ہی انسان تھا وہ بہرطور میرے دل میں نادر کے لیے ایک خوف، ایک نفرت سی بیٹھ گئی تھی۔

دوسرے لوگ بھی تھے۔ سب سے پہلے میرے پاس ایک آنے کی کوشش ہمارے دفتر کے ایک ٹائپسٹ صاحب نے کی، جن کا نام سلیم تھا، بڑی غم زدہ سی شکل کے مالک تھے، کچھ دلیپ کمار کا سا انداز اپنائے رہتے تھے، بال بھی اسی طرح ماتھے پر بکھرے رہتے تھے۔ ایک دفعہ بس اسٹاپ پر مجھے مل گئے۔ میرے قریب آ گئے اور کہنے لگے۔

''مس نوشابہ آپ کو دیکھ کر نہ جانے کیا کیا احساس ذہن میں جاگ اٹھتے ہیں۔''

''جناب عالی یہ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوکر آپ کو اپنے احساسات کا اظہار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا۔

''آپ نہیں سمجھتیں نوشابہ، میں آپ کو دنیا کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔''

''بس آ رہی ہے خدا حافظ۔'' میں نے کہا اور بس میں چڑھ گئی۔ سلیم صاحب دیکھتے رہ گئے تھے۔ دوسری تیسری بار بھی سلیم صاحب نے مجھ سے بکواس کرنے کی کوشش کی لیکن میرا ترش رویہ دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ چوتھی بار جب انہوں نے ایک دفعہ تنہائی میں مجھے آ لیا اور میرے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے تو میں نے ان سے سخت لہجے میں کہا۔

''سلیم صاحب آپ تنویر صاحب کو جانتے ہیں؟''

''کون تنویر صاحب؟''

''اوہ۔ اس کا مقصد ہے کہ آپ ان سے ناواقف ہیں۔ بدقسمتی سے وہ ہمارے دفتر کے جنرل منیجر ہیں۔''

''اوہ..... جی ہاں، جی ہاں اپنے تنویر صاحب کی بات کررہی ہیں آپ۔''

''جی ہاں۔ آپ کے ہی تنویر صاحب کی بات کر رہی ہوں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ اس کے بعد مجھ سے کسی قسم کی فضول بکواس کرنے کی کوشش مت کریں، ورنہ میں سیدھی تنویر صاحب کے کمرے میں جاؤں گی اور آپ کے بارے میں انہیں تفصیلات بتادوں گی۔''

اوہ آپ شاید کچھ غلط سمجھی ہیں مس صاحبہ بہتر ہے میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ اور اس کے بعد امن وامان ہوگیا۔ اور اس کے بعد امن وامان ہو گیا۔ سلیم صاحب کا بھوت اتر گیا اور پھر انہوں نے خصوصاً مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی۔

نادر نے بھی کئی بار مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی ایک بار اس نے دفتر کے سب لوگوں کی دعوت کی جس میں مجھے بھی شریک کیا گیا تھا لیکن میں

نے اس سے معذرت کرلی تو وہ میرے پاس آیا۔

''بی بی دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر اچھا نہیں ہوتا۔ آپ جو کچھ بھی ہیں۔ لیکن دوسروں کا ساتھ دینا ضروری ہے۔''

''میں یہاں دفتر میں صرف ملازمت کرتی ہوں نادر صاحب ساتھ دینا یا ساتھی بننا اس ملازمت میں شامل نہیں ہے۔ امید ہے آپ برا نہیں منائیں گے۔''

''تمہاری مرضی۔'' اس نے شانے ہلائے اور چلا گیا۔

شمسہ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔ ''نوشابہ کیا حماقت کرتی ہو تم، دفتر کے ساتھ بالکل اپنے ہوتے ہیں، تقریباً تمام ہی لوگ تمہارے ٹک چڑھے ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔''

''تو پھر؟''

''میرا مطلب ہے ان لوگوں کے دلوں میں اپنے خلاف نفرت کیوں بٹھا رہی ہو۔''

''کیوں کیا کرلیں گے یہ لوگ میرا۔'' میں نے تنک کر کہا۔

''کچھ نہیں کرتا کوئی کسی کا، کچھ نہیں ہے بس آدمی خواہ مخواہ نکو بن جاتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہے شمسہ مجھے میرا کام کرنے دو پلیز۔'' میں نے کہا اور ٹائپ رائٹر پر جھک گئی۔

دن گزرتے رہے یہاں کا ماحول مجھے راس آ گیا تھا۔ تنخواہ بھی اتنی مناسب تھی کہ میرا کام چل جاتا تھا اور اب گھر میں خاصی آسودہ حالی ہو گئی تھی بچوں کی شکلیں ایک بار پھر درست ہونے لگی تھیں، ٹوٹے ہوئے تار پھر سے جڑنے لگے تھے۔ ماں کی صحت بھی کچھ بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ البتہ وہ میری طرف سے ہمیشہ پریشان رہتی تھیں اور بار بار یہی کہتی تھیں کہ انہیں میری ذات سے دھڑکا لگا رہتا ہے۔ میں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا تھا کہ۔ ''امی میں ہی نہیں ہزاروں لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کی کفالت کر رہی ہیں آپ مطمئن رہیں میں اپنی ذات میں کبھی کوئی کمزوری کوئی لچک نہیں پیدا ہونے دوں گی۔''

پتا نہیں امی کو اطمینان ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن میرے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ زندگی کا سفر یونہی جاری تھا ابو کا خیال آتا تو دل میں ایک کسک سی پیدا ہو جاتی تھی، بہرطور ہم ان کی صحت ان کی زندگی کے لیے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ ان سے ملاقات بھی کبھی کبھی ہی ہوتی تھی۔ جانے کو جی نہیں چاہتا تھا ان کی حالت دیکھ کر دل کو ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا، وہ کتنے بے بس تھے، وہاں سے آنے کے بعد ہفتوں دل اداس رہتا، امی عموماً روتی رہتی تھیں۔ وہ یہی کہتی تھیں کہ اس ساری تباہی کی ذمہ دار وہ خود ہیں۔ کاش وہ صبر و سکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتی رہتیں۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک دن نزہت نے مجھ سے کہا۔

''شمسہ کو دیکھا کتنا اونچی اڑ رہی ہے۔''

''نہیں نہیں۔ میں نے تو اڑتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا عموماً اپنی سیٹ پر بیٹھی رہتی ہے۔''

''مذاق نہیں نوشابہ، یہ لڑکی یہ لڑکی بہت غلط راستوں پر جا رہی ہے۔''

''میں نہیں سمجھی نزہت!''

''تمہارے علم میں نہیں ہے، اکاؤنٹنٹ صاحب آج کل خصوصی طور پر اس پر مہربان رہتے ہیں اس سے پہلے یہ دفتر کے ایک اور صاحب کے ساتھ نظر آتی تھیں، لیکن جب سے اکاؤنٹنٹ صاحب نے نئی سوزوکی کار خریدی ہے، شمسہ عموماً انہی کی کار میں آتی اور جاتی ہے۔''

''اوہ میں نے غور نہیں کیا اس بات پر.....'' میں نے جواب دیا۔

''غور کرنا نوشابہ۔ غور کرنا، تم کیا سمجھتی ہو کیا اسے ہزاروں روپے تنخواہ ملتی ہے، لباس نہیں دیکھتیں، ایک سے ایک جدید ایک سے ایک شاندار ایسی لڑکیاں معاشرے کا ناسور ہوتی ہیں۔''

شمسہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔

''بی نزہت آج کل تو قیر صاحب کے گرد زیادہ چکراتی نظر آتی ہیں، غور کیا تم نے نوشابہ۔'' تو قیر صاحب وہی اکاؤنٹنٹ تھے۔

میں نے معجبانہ انداز میں کہا۔ ''میں نے تو نہیں

دیکھا۔''

''دیکھنا چاہتی ہو تو آج شام کو پانچ بجے دیکھ لینا۔'' شمسہ بولی۔

میں نے اس بات پر بہت زیادہ غور نہیں کیا۔ کچھ ہی چند ہی روز قبل کی بات تو ہے کہ نزہت نے مجھ سے شمسہ کے بارے میں کہا تھا۔ بہرطور شام پانچ بجے جب ہم لوگ دفتر کے باہر نکلے تو شمسہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک طرف لے گئی، ہم لوگ بس اسٹاپ کی طرف جانے کے بجائے وہاں سے تھوڑے آگے چل کر ایک درخت کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔

تو قیر صاحب باہر نکلے اور اپنی کار میں بیٹھ کر چل پڑے۔ لیکن کار تھوڑی دور جانے کے بعد رک گئی تھی اس کے بعد نزہت آئی، وہ پرس جھلاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ بس اسٹاپ کی طرف رخ کرنے کے بجائے وہ اسی سمت چل پڑی۔ جدھر تو قیر کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اور چند لمحات کے بعد وہ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ میں ششدر رہ گئی تھی۔ دل چاہا کہ شمسہ سے نزہت کی کہی ہوئی بات دہراؤں، لیکن پھر وہ چپ خاموش ہو گئی۔ میں نے سوچا خواہ مخواہ ہنگامہ ہو گا اور میرا نام آئے گا لیکن ان لڑکیوں کی زندگی دیکھ کر مجھے خوف محسوس ہوا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ انسان اور بگڑتا ہے۔ اسے بگاڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

میں نے اپنے آپ کو اور زیادہ محتاط کرلیا تھا۔ پھر ایک دن عائشہ نے مجھے اپنے ہاں دعوت دی۔ عائشہ ان تمام لڑکیوں میں وہ واحد لڑکی تھی، جو خاموش طبع اور کسی قدر سنجیدہ نظر آئی تھی، ہمیشہ سادہ لباس پہنا کرتی تھی اور کوئی چٹک مٹک اس میں نظر نہیں آتی تھی۔ امی سے پوچھا تو امی نے اجازت دے دی اور کہا کہ تمہارے دفتر کے لوگ ہیں گھلے ملے رہنا اچھی بات ہے اور میں عائشہ کے گھر پہنچ گئی!''

چھٹی کا دن تھا، عائشہ نے مجھے دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا، بے چاری نے بڑا اہتمام کیا چھوٹا سا گھر تھا، اس کے ضعیف والد تھے والدہ تھیں اور اس کے چھوٹے بہن بھائی تھے گھریلو حالات کسی حد تک ہم سے ملتے جلتے ہی تھے۔ چنانچہ میں عائشہ سے متاثر ہوئی۔ کھانے پینے کے بعد ہم ایک کمرے میں جا بیٹھے اور عائشہ کہنے لگی۔

''دفتر کے معاملات پر تم نے کبھی غور کیا نوشابہ!''

''کس سلسلے میں!''

''یہ لڑکیاں جہاں پہنچتی ہیں کچھ نہ کچھ خرابیاں کر دیتی ہیں یہاں اس سے پہلے دو لڑکیاں اسی چکر میں نکالی گئی ہیں۔ تنویر صاحب بہت سخت آدمی ہیں حالانکہ عام معاملات میں وہ کتنے نرم اور خلیق ہیں، تم نے غور کیا ہو گا لیکن دفتری معاملات میں وہ کسی قسم کی گڑبڑ نہیں چاہتے۔''

''ہاں وہ دو لڑکیاں کیوں نکال دی گئی تھیں۔''

''بس یہ ہمارے اکاؤنٹنٹ تو قیر صاحب جو ہیں یہ دفتر کی لڑکیوں پر خاص طور پر مہربان رہتے ہیں۔ ان دنوں نزہت کو بڑے بڑے ایڈوانس مل رہے ہیں اور یہ ایڈوانس تو قیر صاحب اپنی ذمہ داری پر دیتے ہیں، ان کی واپسی کا کیا ہو گا، اس کا کسی کو کوئی اندازہ نہیں۔''

''چھوڑو ہمیں ان باتوں سے کیا لینا۔''

''نہیں میں تمہیں حالات بتا رہی ہوں، تم ذرا محتاط رہنا۔''

''عائشہ۔ یہ نادر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔''

''تو بہ توبہ بڑا خوف ناک آدمی ہے، کسی کی عزت ہی نہیں کرتا ہم لوگوں کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتا رہتا ہے، سچ جانو اس سے تو وحشت ہوتی ہے، تم سے تو کبھی کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''نہیں، لیکن بس مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے ذہن میں لاوا پک رہا ہے، کچھ کرنا چاہتا ہے، سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس کے سوا کسی سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔''

''اپنے آپ کو سنبھالے رکھو۔ خوف زدہ ہونے

کی ضرورت نہیں۔'' عائشہ نے کہا اور اس کے بعد میں وہاں سے چلی آئی۔ لیکن کچھ معاملات میں، میں مزید محتاط ہوگئی تھی۔

اس دن صبح سے بارش ہو رہی تھی لیکن آٹھ بجے کے قریب بارش رک گئی، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ دفتر جاؤں یا نہ جاؤں۔ امی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جانا تو چاہیے امی میرا نام، ایک ریکارڈ ہے جسے میں خراب کرنا نہیں چاہتی۔''

''مگر بیٹی اگر بارش تیز ہوگئی، تو پھر واپسی کا کیا ہوگا۔''

''جو ہوگا دیکھا جائے گا اللہ مالک ہے۔'' میں نے کہا اور چل پڑی۔ اس وقت بارش بھی رکی ہوئی تھی بس بھی فوراً ہی مل گئی۔ بس میں بیٹھ کر میں دفتر کے سامنے اتر گئی اور پھر دفتر میں داخل ہوگئی۔

آج دفتر میں حاضری نہ ہونے کے برابر تھی۔ عائشہ اور نزہت نہیں آئی تھیں، صرف شمسہ تھی، روزی تھی اور میں تھی۔ ہم تینوں لڑکیاں اپنے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ مرد بھی نہیں آئے تھے۔ تو قیر بھی نہیں تھا۔ نادر بھی نہیں آیا تھا اور چند اور کلرک بھی نہیں آئے اس لیے کام کچھ زیادہ ہوگیا۔

تنویر صاحب اپنے کمرے سے باہر نکلے اور باہر کے ماحول کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''بھئی ان لوگوں نے بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ بارش ہی ہے کوئی طوفان تو نہیں۔ دفتری معاملات میں یہ غیر ذمہ داریاں مجھے پسند نہیں ہیں۔'' اس کے بعد انہوں نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا کہ کل ان سب سے جواب طلبی کی جائے اور انہیں ان کے سامنے پیش کیا جائے، جونہیں آئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ میں کم از کم ان حالات سے متاثر نہیں ہوئی اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے پہنچ گئی۔ تنویر صاحب چلے گئے تو شمسہ مجھ سے کہنے لگی۔

''نوشابہ اس تنویر پر غور کیا تم نے۔''

''کون تنویر؟''

''ارے یہی اپنے تنویر صاحب۔'' شمسہ ہنس کر بولی۔

''ہاں کئی بار غور کیا ہے میں نے ان پر۔''

''کیسے انسان لگتے ہیں۔''

''یہ سوال پوچھنے کے لائق ہے۔'' میں نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔

''بی بی دنیا کو دیکھتے ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے تمہیں۔'' شمسہ بولی۔

''بہت عرصہ گزر گیا۔ مقصد کیا ہے آپ کا مس شمسہ۔''

''رنگے سیار دیکھے ہیں تم نے۔''

''اگر آپ یہ بات تنویر صاحب کے بارے میں کہہ رہی ہیں تو براہ کرم مجھ سے نہ کہیں، آپ کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے یہاں اور بھی لوگ مل جائیں گے۔'' میں نے کہا اور شمسہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

تنویر صاحب کے لیے فضول باتیں کرنا مجھے بے حد برا لگا تھا، بحیثیت مجموعی طور پر وہ نیک نفس آدمی تھا۔ اس کا غصہ فوراً ہی ختم ہوجاتا تھا۔ مہینہ ہی بارشوں کا تھا۔ تین چار دن کے بعد پھر بارش شروع ہوگئی، لیکن اس دن حاضری معمول کے مطابق رہی۔ البتہ شام کو پانچ بجے جب چھٹی ہوئی تو بارش خاصی تیز ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر بارش کی وجہ سے ٹریفک بھی کم ہوگیا تھا۔ ہم لوگ باہر نکل آئے اور لباس بھیگ رہا تھا، لیکن گھر جانا بھی ضروری تھا۔ تھوڑی ہی دور اکاؤنٹنٹ صاحب کی کار کھڑی ہوئی تھی، نزہت اس میں بیٹھی، چلی گئی، شمسہ کا کھیل شاید ختم ہوگیا تھا، کیونکہ اکاؤنٹنٹ صاحب نے شمسہ کو لفٹ نہیں دی تھی۔

بہر طور شمسہ نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔ رہ گئی روزی، تو اسے لینے کے لیے ہمیشہ ایک نوجوان آتا تھا۔ اور وہ روزی کو لے گیا، عائشہ اور میں رہ گئے۔ عائشہ کی بس آگئی اور وہ اس میں بیٹھ کر چلی گئی اب بس اسٹاپ پر صرف میں رہ گئی تھی اسٹاف کے دوسرے لوگ بھی جا چکے تھے۔ بارش

اس وقت بہت زیادہ تیز نہیں تھی۔ دفعتاً ایک موٹر سائیکل میرے نزدیک آکر رک گئی۔ نادر اس پر بیٹھا ہوا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے لڑکی آجاؤ۔ آجاؤ تکلف کی ضرورت نہیں۔''

میں نے اس کو گھور کر دیکھا اور وہ اسکوٹر کو موڑ کر تھوڑا سا آگے لے آیا۔

''میں کہہ رہا ہوں بے وقوفی مت کرو، بس اول تو کم آرہی ہیں اور جو آئیں گی ان میں بے پناہ رش ہوگا، کیا بارش میں سڑک پر تماشا بنو گی۔''

''براہ کرم آپ تشریف لے جائیں، جو ہوگا میں خود نمٹ لوں گی۔'' میں نے غرائے ہوئے انداز میں کہا اور نادر شانے ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ کم بخت نے خواہ مخواہ ذہن خراب کر کے رکھ دیا تھا۔

بس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کافی دیر ہوگئی تھی قرب و جوار میں سائے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ پھر اسی وقت دفتر کی عمارت میں سے تنویر صاحب کی کار نکلی اور وہ میرے سامنے سے گزرے آگے بڑھے اور پھر کار ریورس کر کے میرے پاس آئے اور گردن نکال کر بولے۔

''ادھر آؤ۔'' میں بے اختیارانہ انداز میں آگے بڑھی تھی۔ انہوں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بولے۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

''وہ سر..... سر میں!''

''بیٹھ جاؤ۔'' تنویر صاحب بھاری آواز میں بولے اور نہ جانے ان کی آواز میں کیا سحر تھا کہ میں دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

''کہاں رہتی ہو تم!'' تنویر صاحب نے پوچھا اور میں نے اپنے علاقے کا پتا بتا دیا۔ تنویر صاحب نے کار آگے بڑھا دی تھی! کچھ ایسی ساحرانہ قوت تھی ان کے لہجے ان کی آواز میں کہ میں نہ چاہنے کے باوجود بیٹھ گئی۔ جب میں تھوڑی سی آگے بڑھی تو میں نے نادر کو دیکھا جو موٹر سائیکل ایک سائبان کے نیچے سے نکال رہا تھا۔ اس نے عجب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا۔ تنویر صاحب بھی خاموش بیٹھے رہے۔ راستے میں انہوں نے مجھ سے کوئی گفتگو نہیں کی اور میری مطلوبہ جگہ انہوں نے مجھے اتار دیا۔

''سر میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ آپ کی کار کی پچھلی سیٹ۔'' میں نے کہنا چاہا لیکن تنویر صاحب نے گردن ہلا کر کار آگے بڑھا دی تھی۔ اس نیک نفس انسان کی عزت میرے دل میں کچھ اور بڑھ گئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو امی بے حد پریشان تھیں۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے تولیا لائیں اور میرا سر خشک کرنے لگیں پھر میرے کپڑے حوالے کرتے ہوئے بولیں۔

''جلدی سے کپڑے بدل لو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں کہیں نزلہ نہ ہوجائے۔''

''امی موم کی بنی ہوئی نہیں ہوں میں اتنی فکر نہ کیا کریں۔'' میں نے کہا۔ اور امی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔ میں ان کی ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ چائے پینے کے بعد میں تنویر صاحب کے بارے میں سوچتی رہی پھر بچوں کو پڑھانے میں مصروف ہوگئی۔ دوسرے دن مطلع صاف تھا دفتر آئی۔ تمام لوگ موجود تھے کوئی خاص بات نہ ہوئی کسی نے کچھ نہ کہا تھا۔ نادر بھی خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہا تھا معاملات یوں ہی چلتے رہے، پھر دو تین دن کے بعد میں ایک شام بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھی کہ تنویر صاحب کی کار وہاں سے گزری اور انہوں نے حسب معمول کار روک لی۔ انہوں نے مجھے اشارہ کیا اور میں اسی طرح آگے بڑھ گئی جیسے ان کی آواز کے جواب میں مجھے صرف وہی کرنا ہو جو انہوں نے کہا ہے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے پھر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

''میں چلی جاؤں گی سر آپ ناحق زحمت کرتے ہیں۔''

''میرا وہی راستہ ہے، مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ہاں تم جو احمقانہ تکلف کر رہی ہو، اس پر مجھے افسوس ضرور ہوتا ہے۔''

"میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا تنویر صاحب نے کار آگے بڑھا دی تھی دوسرے لوگوں نے ہمیں دیکھ کر نجانے کیا سوچا ہوگا، لیکن مجھے یہ سب کچھ بہت زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔

تنویر صاحب آج کچھ خوش نظر آتے تھے، کہنے لگے۔ "نوشابہ تم بے حد شریف لڑکی معلوم ہوتی ہو، میں اپنے اسٹاف کے ایک ایک شخص پر نگاہ رکھتا ہوں، میرے لیے یہ ضروری ہے میں نے تمہیں ان سب میں منفرد پایا ہے۔ مجھے اپنے گھر کے بارے میں بتاؤ۔"

"بس جناب ماں ہیں اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔"

"والد......!" تنویر صاحب نے سوال کیا۔

"اور میں نے ان کے بارے میں بتا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلسلے میں مجھے جھوٹ بولنا پڑا تھا۔

تنویر صاحب مجھ سے کافی باتیں کرتے رہے، پھر بولے "کل سے تم روزانہ میرے ساتھ واپس جایا کرو۔ صبح کو ساتھ لینے کی تو ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ مجھے کچھ دوسرے معاملات بھی نمٹانے ہوتے ہیں لیکن شام کو تم۔"

"سر میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ زحمت نہ کریں۔"

"اور میں چاہتا ہوں کہ یہ زحمت ضرور کروں۔"

تنویر صاحب نے کچھ اتنی اپنائیت سے کہا کہ میں خاموش ہو گئی۔ گو ذہن الجھا ہوا تھا۔ امی سے اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ان کے دل میں وسوسے جاگ اٹھتے۔ ظاہر ہے باہر کے حالات کو وہ نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ تنویر صاحب کیا ہیں وہ یہ تو نہیں جان سکتی تھیں۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، تنویر صاحب نے مجھے کار میں بٹھایا اور شرافت سے لا چھوڑا۔ دفتر میں بھی ان کا رویہ بے حد نرم تھا۔ اور میں نے ان کے رویے میں کوئی ایسی بات نہ پائی جو میرے لیے پریشانی کا باعث ہوتی۔ نادر حسب معمول تھا۔ دوسری لڑکیوں کے ساتھ اس کا مذاق جاری رہتا تھا لیکن کوئی لڑکی اسے منہ نہ لگاتی تھی سب ہی اس سے نفرت کرتی تھیں کیونکہ وہ تھا ہی غنڈا۔ روزی شمسہ، نزہت، تینوں ہی مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھتی تھیں اور آپس میں کھسر پھسر کرتی رہتی تھیں۔ میں جانتی تھی ان کی آنکھوں میں کیا ہے لیکن دنیا والوں کی زبان کس نے بند کی ہے جو میں کر سکتی۔ جب یہ لوگ اپنی روش نہیں چھوڑ سکتے تو پھر میں کسی شریف آدمی پر صرف اس بنیاد پر کہ لوگ مجھ پر اور اس پر انگلیاں اٹھاتے ہیں کیوں چھوڑ دیتی۔

تنویر صاحب کے تمام جذبوں میں مجھے ایک شفقت نظر آتی تھی انسان تھے انسانیت کے ناتے مجھ پر احسانات کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے کہنے سے یہ سب کچھ کیوں چھوڑ دیتی چنانچہ میں نے پوری مضبوطی سے ان حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

بات چیت معمولی سی تھی میں اگر چاہتی تو تنویر صاحب کو سختی سے منع کر سکتی تھی کہ میں ان کے ساتھ آنے جانے پر تیار نہیں ہوں اور پھر مسئلہ ہی کیا تھا صرف اتنا کہ شام کو واپسی پر وہ مجھے چھوڑ دیتے تھے کبھی جو ایک بات شرافت کے معیار سے گری ہوئی کی ہو کوئی تو ایسی بات پاتی میں جس سے مجھے یہ احساس ہوتا کہ ان کے ذہن میں میرے لیے کوئی برائی ہے۔

کافی دن گزر گئے صرف عائشہ ایسی تھی جس نے مجھ سے اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی وہ ان لوگوں کے ساتھ ان کی گفتگو میں شریک ہوئی۔

اکاؤنٹنٹ توقیر صاحب ان نزہت سے بھی اکتا گئے تھے۔ چنانچہ آج کل ان کی کار خالی ہی واپس جاتی تھی، البتہ ایک دن جب میں کسی کام سے ان کے پاس گئی تو توقیر صاحب کہنے لگے۔

"بھئی نوشابہ آپ تو بے حد مصروف خاتون ہیں۔ دفتر میں اپنے آپ کو لیے دیے رہتی ہیں۔ دراصل دفتر کے ساتھی ایک خاندان کی مانند ہوتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ درد کے شریک مجھے آپ کے بارے میں کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں، اتفاق سے مجھے کچھ پتا چل گیا آپ کے والد جیل میں ہیں نا۔"

"جی ہاں توقیر صاحب اور یہ بات میں نے کسی سے چھپائی نہیں ہے نہ ہی اس بات کو پس پردہ رکھ کر یہ نوکری حاصل کی ہے۔"

"ارے ارے یہ آپ گفتگو کو کس رخ پر لے گئیں میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ان دنوں جو جیلر ہے وہ میرا دور کا ایک رشتہ دار ہے، ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں جیل کی زندگی میں اچھی کارکردگی کے مالک قیدی کی سزا کچھ کم ہو جاتی ہے اور جیلر کو اس سلسلے میں کافی اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں اگر آپ مجھ سے کچھ مدد چاہتی ہیں تو حاضر ہوں۔" ایک لمحے کے لیے میرے دل میں ہوک سی اٹھی اور ابو یاد آ گئے ہم انہیں سینے میں چھپائے خاموش بیٹھے وقت کا انتظار کر رہے تھے توقیر صاحب کی بات میں بہت دلکشی تھی، میں انہیں تکتی رہ گئی۔ توقیر صاحب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہو سکتا ہے اتنا کچھ ہو سکتا ہے کہ آپ تصور نہیں کر سکتیں مس نوشابہ۔ جتنا عرصہ آپ کے والد جیل میں گزار چکے ہیں اس میں مزید ایک دو مہینے کا اضافہ اور کر لیجیے اور اس کے بعد وہ رہا ہو جائیں گے۔"

"توقیر صاحب۔ میں، میں آپ سے کہیں تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں، ہاں یقیناً کیا یہ مناسب ہوگا کہ آج ہی شام ہم ڈنر ساتھ ساتھ کریں۔" میں نے چند لمحات کے لیے کچھ سوچا، ابو کی سزا معاف کرانے کے لیے میں سب کچھ کر سکتی تھی چنانچہ میں نے توقیر صاحب سے حامی بھر لی اور توقیر صاحب نے مجھے ایک ہوٹل کا نام بتا دیا پھر واپسی تنویر صاحب کے ساتھ ہی ہوئی تھی لیکن ظاہر ہے اس سلسلے میں کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتی تھی، امی کو بھی میں نے کچھ نہیں بتایا البتہ یہ کہا کہ میری ایک ساتھی دوست کے ساتھ آج شام کو اس کے گھر پر کھانا کھاؤں گی مجبوری ہے کیونکہ پروگرام ہی بنا ہے۔

امی نے مجھے گھر سے باہر جانے کی اجازت دے دی تھی تو اب ان باتوں پر پابندیاں کیا معنی رکھتی ہیں۔ چنانچہ میں شام کو تیار ہو کر میں توقیر صاحب کے متعین کردہ ہوٹل کی جانب چل پڑی۔ کسی ہوٹل میں اکیلے داخل ہونے کا موقعہ میری زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔

سہمی سہمی سی توقیر صاحب کو تلاش کرتی ہوئی اندر پہنچی تو وہ میرے منتظر ملے بڑے خوب صورت لباس میں ملبوس تھے ان کی شخصیت کا اندازہ مجھے کسی حد تک تھا لیکن ابو کی سزا کم ہونے کے تصور نے بہت کچھ بھلا دیا تھا انہوں نے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا اور میں ان کے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔

"ہاں مس نوشابہ میں نے کام کیا ہے دفتر سے واپسی کے بعد میں نے اپنے دوست جیلر سے ملاقات کی تھی اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں غور کرے گا اس کے اس وعدے کو پورا کرانے کے لیے میری جدوجہد بہت ضروری ہے۔"

"توقیر صاحب میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

"ہاں مس۔ نوشابہ دراصل آپ سے گفتگو کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے اس لیے کہ آپ کسی اور کی منظور نظر ہیں۔ ہم تو بھائی سادہ سے آدمی ہیں کسی سے جھگڑا مول نہیں لے سکتے اور پھر خاص طور سے تنویر صاحب، مس نوشابہ، یہ دور سودے بازی کا ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے اب یہ فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے کہ کس طرح تنویر صاحب کی نگاہ سے بچ کر ہمارے اور آپ کے درمیان ملاقاتیں ہو سکتی ہیں۔"

"میں، میں سمجھی نہیں۔"

"دیکھو نوشابہ، بے شک تم معصوم ہو لیکن جن راستوں پر قدم اٹھا چکی ہو اب ان سے ناواقف نہ ہو گی، میں بھی تم سے دوستی چاہتا ہوں میری بھی خواہش ہے کہ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزاروں اس کا آغاز چاہو تو آج ہی سے کر دو بلکہ ضروری ہے جو کچھ

میں تمہارے لیے کروں گا اس کا بدلہ مجھے فوراً ملنا چاہیے۔" میں نے توقیر کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی ہوس دیکھی اور میرا دل غم و غصے میں ڈوب گیا میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"توقیر صاحب آپ مجھ سے بھی وہی فلرٹ کرنا چاہتے ہیں جو آج تک دوسری لڑکیوں سے کرتے رہے ہیں میرے ابو کی سزا اس شرط پر معاف ہوگی۔"

"فلرٹ نہ کہو دوستی کہو، چاہت کہو نوشابہ ہر انسان کو اس کی محنت کا صلہ درکار ہوتا ہے۔"

"اگر یہ بھری پری جگہ نہ ہوتی اگر مجھے اپنی عزت کا پاس نہ ہوتا تو میں جوتا اتار کر اتنا مارتی تمہیں کہ تمہارا چہرہ لہولہان ہو جاتا، تھوکتی ہوں میں تمہاری شکل پر توقیر، ذلیل ہو تم اتنے نیچ ہو اور ناپاک ہو کر تمہارا نام تک میں اپنی زبان سے لینا پسند نہیں کرتی لعنت ہے تم پر۔ میرے ابو واپس آ جائیں گے کچھ وقت اور گزار لیں گے وہ، لیکن وہ جب آئیں گے تو اپنی عزت کی دھجیاں تو نہ اڑتی دیکھیں گے۔ تم جیسے ناپاک کتے تو قدم قدم پر مل جاتے ہیں۔ عزت کہیں پر نہیں ملتی سمجھے۔ اگر تمہاری اپنی کوئی بہن بیٹی یا ماں ہو تو اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر لینا مجھ سے یہ توقع تم نے کیوں قائم کی۔" میں نے کہا اور اٹھ کر تیز قدموں سے وہاں سے نکل آئی۔

ساری رات دکھ میں ڈوبی رہی تھی اس کم بخت نے جو کچھ کہا تھا میرے کانوں میں اس وقت بھی پگھلے سیسے کی مانند گھولتا رہا، رات بھر سوچتی رہی کئی بار جی چاہا کہ تنویر صاحب سے یہ بات کہہ دوں لیکن پھر اپنی عزت ہی کا خیال آیا۔ خاموشی ہی مناسب ہے ہمارا کوئی سہارا نہیں ہے۔ سر جھکا کر وقت گزار لینا ہی مناسب ہے۔ چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

دوسرے دن دفتر میں توقیر موجود تھا کم بخت کے چہرے پر ایک شکن جو ہو۔ پتا نہیں کس بات پر اتنا مضبوط تھا۔ دن بھر گزر گیا۔ توقیر میرے دل پر ایک داغ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ سوچتی رہی کبھی دن بھر اس کے بارے میں، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے اپنی بے عزتی کا انتقام کس طرح لوں۔

کئی دن گزر گئے اور پھر آہستہ آہستہ سکون آ گیا۔ توقیر نے اس کے بعد مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی پھر ایک دن تنویر صاحب دفتر نہیں آئے تھے مجھے تنہا ہی جانا پڑا۔ نادر دفتر سے نکلتے ہی میرے نزدیک پہنچ گیا۔

"سنو۔ آج تم بس میں جاؤ گی مجھے تم سے کچھ گفتگو کرنی ہے یہ گفتگو ضروری ہے نوشابہ، میں تمہارے ساتھ زبردستی بھی کر سکتا ہوں سمجھیں تمہارے اہل خاندان سے بات کروں گا اس موضوع پر۔"

اس کا لہجہ اتنا سرد اور اتنا خوف ناک تھا کہ میں سہم سی گئی۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"بس تھوڑی دیر بات چیت کہیں بھی کسی بھی جگہ اس کے لیے کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہے۔" نادر نے کرخت لہجے میں کہا۔

"تو پھر جہاں تم کہو۔" میں نے جواب دیا۔

"ادھر سامنے اس طرف کی پچھلی سمت ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے وہاں تم میرے ساتھ ایک کپ چائے پیو۔" اور بولا۔

"میں وہاں پہنچ جاتی ہوں۔ تم آؤ۔" نادر نے گھر پہنچنے کی دھمکی ایسی دی تھی کہ میں واقعی سہم گئی تھی اگر اس نے امی سے کچھ الٹی سیدھی باتیں کر دیں تو ایک بار پھر ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ مصیبتیں میری گردن دبوچ لیں گی۔ یہ کہنا کیا چاہتا ہے سن تو لوں۔

ہوٹل کے چھوٹے سے ہال میں ایک سمت کیبن بنے ہوئے تھے نادر مجھے وہیں مل گیا۔ وہ موٹر سائیکل پر آیا تھا میں اس کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گئی۔

"میں بہت برا ہوں بے بی بہت برا انسان ہوں میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں صرف چند جملے اس کے بعد چائے پیو اور یہاں سے اٹھ جاؤ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم۔"

"تنویر کے ساتھ آنا جانا چھوڑ دو، وہ اچھا انسان نہیں ہے نقصان اٹھاؤ گی کسی وقت سمجھیں، نقصان اٹھاؤ گی۔"

"پتا نہیں تم لوگ تنویر صاحب کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ وہ اتنا شریف آدمی ہے کہ میں اس کے لیے تم سب کی فضول باتیں بھی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ میں اسے منع نہیں کر سکتی سمجھے جو کچھ میں کر رہی ہوں اس کا مجھے اختیار ہے اور تم نادر، تم کچھ بھی ہو لیکن اتنا سوچ لو کہ مجھ سے فضول باتیں کیں تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے بی بی تمہاری مرضی۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں چائے نہیں پینا چاہتی تمہاری باتیں سن لی ہیں۔ میں نے، اب مجھے اجازت دو۔" نادر نے مجھے نہیں روکا تھا میں کافی الجھی ہوئی گھر پہنچی تھی۔ کیا کرنا چاہیے میں تنویر صاحب سے کہہ دوں تو اچھا ہے۔

دوسرے دن میں دس بجے ان کے آفس میں داخل ہو گئی کوئی کام نہیں تھا مجھے ان سے تنویر صاحب بھی فارغ ہی بیٹھے ہوئے تھے ان کے چہرے پر اداسی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔

"اوہ۔ نوشابہ آؤ بیٹھو۔" انہوں نے کہا اور میں بیٹھ گئی۔

"کہو کیسے آئیں؟"

"سر کچھ عرض کرنا تھا آپ سے۔"

"ہاں کہو۔"

"سر آپ کی عنایت مجھ پر بے شک میری زندگی کے لیے بہت بڑا سہارا ہیں لیکن دنیا کا ماحول بہت عجیب ہے میں شام کو آپ کے ساتھ جاتی ہوں تو لوگوں کی نگاہوں میں عجیب سے احساسات ابھر آئے ہیں۔ سر میں برے حالات کا شکار ایک مظلوم لڑکی ہوں میں نہیں چاہتی کہ میرا مستقبل تباہ ہو جائے۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو آج سے میری اوپر عنایات کا یہ سلسلہ بند کر دیں۔" تنویر صاحب کے چہرے پر اداسی مزید گہری ہو گئی۔ انہوں نے متورم آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر بولے۔

"میں تم سے کسی بات پر اصرار نہیں کروں گا نوشابہ، دراصل زندگی میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی خوشیاں بڑی اہمیت اختیار کر جاتی ہیں، میں ایک تباہ حال انسان ہوں اپنی کہانی سنانا چاہتا تھا تمہیں، یوں کرو آج شام تھوڑا سا وقت میرے ساتھ گزارو، جس طرح بھی بن پڑے میرے لیے تھوڑا سا وقت نکالو، تمہیں اپنی داستان سنا دوں گا اور اس کے بعد وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کبھی مجبور نہیں کروں گا کہ تم مجھ سے کوئی ربط رکھو۔"

"سر شام، شام کو کس وقت؟"

"میرے ساتھ ہی چلنا آخری بار۔ صرف آخری بار۔ اس کے بعد میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں نوشابہ کہ کبھی تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔"

"مجھے کتنی دیر میں گھر واپسی کی اجازت مل جائے گی دراصل امی۔"

"زیادہ نہیں، بس تھوڑا سا وقت، بہت تھوڑا سا وقت۔" تنویر صاحب نے اس طرح کہا کہ میں تیار ہو گئی اور پھر شام کو میں ان کی کار میں بیٹھ کر ان کے ساتھ چل پڑی چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ تھا جس میں کوئی ملازم وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مسز تنویر کے بارے میں، میں نے اندر داخل ہو کر پوچھا تو تنویر صاحب نے بتایا کہ وہ گئی ہوئی ہیں۔

میں ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ "گھر میں کوئی نہیں ہے۔ میں تنویر صاحب کے ساتھ تنہا ہوں۔ یہ بہت زیادہ ہے تنویر صاحب مجھے ایک اندرونی کمرے میں لے گئے اور پھر محبت بھرے لہجے میں بولے۔

"بیٹھو بیٹھو نوشابہ تمہیں یہاں دیکھ کر نجانے میرے دل میں کیسے کیسے احساسات جاگ رہے ہیں۔ وہ خود بھی میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔"

"یہاں اور کوئی نہیں ہے۔"

''میں ہوں نوشابہ۔ جب میں ہوں تو کسی اور کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں نوشابہ تو میں تمہیں اپنی زندگی کی کہانی سنانے یہاں لایا تھا میں عجیب وغریب حالات میں پروان چڑھا ہوں، والدین بچپن ہی میں مر گئے تھے ایک چچا نے پرورش کی، رشتہ کے دور کے چچا تھے لیکن اس پرورش میں ان کی اپنی غرض شامل تھی۔ انہوں نے مجھے تعلیم دلائی میری زندگی بنائی اور اس کے ساتھ ہی میری زندگی بگاڑ دی، ان کی بیٹی تسنیم ایک انتہائی پھوہڑ، بدمزاج اور بدتمیز لڑکی ہے جو اب میری بیوی بن چکی ہے۔ میرے دو بچوں کی ماں۔ تسنیم نے میری زندگی میں جو زہر گھولا ہے۔ نوشابہ وہ میرے پورے وجود میں سرایت کر چکا ہے۔ میں زندگی سے فرار چاہتا ہوں اور زندگی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی نوشابہ۔ میں بہت دکھی انسان ہوں میرے دل میں ہمیشہ یہ خواہش ابھرتی ہے کہ کوئی مجھے خود میں سمیٹ لے، نوشابہ جب سے تمہیں دیکھا ہے وجود کی تپتی آنچ پر نمی کی کچھ بوندیں محسوس ہوتی ہیں میں تم میں گم ہو جانا چاہتا ہوں نوشابہ، میں تمہیں اپنا لینا چاہتا ہوں۔ نوشابہ میری زندگی سے میرے دکھ دور کردو۔ مجھے تمہارا سہارا چاہیے۔'' تنویر صاحب بری طرح جذباتی ہو گئے۔ وہ آگے بڑھے اور میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''مم، میں کیا کر سکتی ہوں تنویر صاحب۔''

''میرے ذہن میری دل ودماغ سے دکھوں کے تمام نقش مٹا دو مجھے اپنے وجود کی پرادا سونپ دو نوشابہ، میں تم سے اپنے تپتے وجود کی تسکین چاہتا ہوں۔'' تنویر صاحب کی آنکھوں میں جو کچھ میں نے دیکھا اس نے میرے حواس چھین لیے۔ گویا سب سچ کہتے تھے کوئی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ یہ مرد صرف درندے ہی ہوتے ہیں۔ مختلف شکلوں میں مختلف روپ میں۔ میں نے انہیں بری طرح پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔

''تنویر صاحب، تنویر صاحب یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ، میں نے تو ہمیشہ آپ کو اپنے بزرگ اپنے باپ کی جگہ دی ہے۔''

''بکواس مت کرو نہ میں تمہارا بزرگ ہوں نہ تمہارا باپ میں ایک مرد ہوں ایک دیوانہ ہوں، پاگل ہوں مجھے اپنے پاگل پن کی تسکین چاہیے سمجھیں تم۔'' تنویر صاحب نے میرے بازو کو اتنی زور سے پکڑا کہ میرے حلق سے چیخ نکل گئی اب ان کی اصل شکل نمایاں ہو گئی تھی اور میں محسوس کر رہی تھی کہ میں نے بے حد خوف ناک دھوکا کھایا ہے۔ میری چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھی لیکن تنویر صاحب کے کان بند ہو گئے تھے اس وقت بند دروازے پر ایک زوردار دستک ہوئی جسے تنویر صاحب نے اس دوران بند کر دیا تھا دوسری ٹھوکر اور تیسری ٹھوکر نے تنویر صاحب کے حواس بحال کر دیے وہ شدید دیوانگی کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھے اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

دروازے میں نادر کھڑا تھا نادر کو دیکھ کر تنویر صاحب بھونچکے رہ گئے اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔

''تم، تم.....''

''سر کون چیخ رہا تھا یہاں میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ باہر کوئی نہ ملا تو مجھے کچھ شبہ سا ہوا میں اندر آ گیا۔ اور میں نے چیخیں سنیں۔ تو میں اس طرف آ گیا۔ کک، کیا بات ہے؟'' نادر نے کہا اور پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔

''ارے تم، نوشابہ تم.....''

''بچاؤ نادر، بچاؤ مجھے اس بھیڑیے سے بچاؤ۔'' میں آگے بڑھی اور نادر کے نزدیک پہنچ گئی۔ نادر کی آنکھوں میں جنون کے آثار نظر آنے لگے۔

''ہوں۔ تو تنویر صاحب یہ کھیل کھیل رہے ہیں آپ۔'' اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم یہاں سے دفان ہو جاؤ نادر۔ ورنہ ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''ہوش میں آ جاؤ تنویر صاحب، نادر کو گولی مارنا آسان نہیں ہوگا۔ بے عزت آدمی ہو عزت کا نام نہیں

جانتے۔ چلو کوشش کرو۔ گولی مارو مجھے۔ تم بے غیرت انسان ہو تم گھاٹ کے کتے ہو سمجھے۔ تنویر صاحب اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی پر دست درازی کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔ کیا دھوکا دے کر بلایا تھا اسے۔ اس لیے اس پر، مہربانیاں کر رہے تھے، سنو تنویر صاحب، میں زبان بند رکھوں گا اس لیے کہ مجھے اس لڑکی کی عزت عزیز ہے، بات باہر نکلی تو، تو تم سمجھ لینا، آؤ نوشابہ۔'' اس نے کہا تنویر صاحب سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے تھے میری سسکیاں بلند ہو رہی تھیں۔ نادر نے نرم لہجے میں کہا۔

''تمہیں اس کے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا بے بی تمہیں سمجھایا تھا میں نے۔ غنڈہ ہوں میں سمجھیں۔ میں غنڈہ ہوں۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا آؤ..... آ جاؤ میرے ساتھ۔'' باہر نکل کر وہ اپنی موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا۔

''تم، تم یہاں کیسے آ گئے نادر؟''

''بس غنڈہ ہوں نا مگر کیا کروں دل میں جذبہ جاگ اٹھا تھا ہر وقت تم پر نگاہ رکھتا تھا آج معمول میں کچھ تبدیلی دیکھی تو ماتھا ٹھنکا اور خدا کا شکر ہے وقت پر پہنچ گیا بے وقوف لڑکی تم سب ایک جیسی ہوتی ہو۔ آؤ بیٹھو موٹر سائیکل پر۔''

''نہیں، میں بس سے جاؤں گی۔''

''آ جاؤ مردمت۔ بس اسٹاپ پر چھوڑ دوں گا تمہیں۔''

''نہیں اب میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی نادر اس دنیا سے میرا بھروسا اٹھ گیا ہے۔''

''ایک غنڈے پر بھروسا کر کے اور دیکھ لو ایک شریف آدمی پر تو بھروسا کر کے دیکھ چکی ہو۔''

''تم تم مرد ہو۔ تم بھی مرد ہو۔''

''ہاں، میں مرد ہوں لیکن مردوں کی قسمیں ہوتی ہیں اپنے اس باپ کے بارے میں کیا کہو گی جو جیل میں بند ہے کیا وہ بھی مرد ہے تمہارے لیے نوشابہ بھائی ہوں میں تیرا سمجھی نا بہن کہہ رہا ہوں اپنے منہ سے۔ چل آ بیٹھ جا، غنڈے جب کچھ کہتے ہیں تو اسے پورا کر دیتے ہیں۔ ارے، ہم سینہ تان کر بدمعاشی کرتے ہیں اور سینہ تان کر ہی، ہمیں شرافت کا مظاہرہ بھی کرنا ہوتا ہے چل آ جا۔'' میں سکتے میں رہ گئی تھی ایک شریف انسان تھا اور ایک غنڈا۔ دونوں سے کس کی بات زیادہ وزنی تھی اور دل نے زیادہ فیصلہ کر لیا۔ میں نادر کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ رخ میرے گھر ہی کی طرف تھا پھر اس نے کہا۔

''ماں سے نہ کہنا۔ کچھ بھی نہ کہنا یہ جگہ اب تمہاری نوکری کے لیے ٹھیک نہیں رہی ہے بہن۔ میں بہت جلد کوشش کر کے تمہیں کوئی نوکری دلا دوں گا۔ فکر مت کرنا تیرا بھائی یہ بات کہہ رہا ہے سمجھی۔ تیرا بھائی۔'' اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

جب اس نے مجھے میرے گھر کے قریب چھوڑا تو میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''آؤ نادر اندر آ جاؤ۔ تمہیں امی سے ملاؤں گی۔'' نادر نے درحقیقت ہماری زندگی کو بہت بڑا سہارا دیا۔ ہم اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اپنی پریشانیوں کا سفر کرتے رہے۔ مجھے نادر نے ایک دوسری نوکری دلوادی جو ایک اسکول میں تھی اور اس کے بعد خدا نے ہماری مصیبتوں کے دن ختم کر دیے۔ میری والدہ کو ان کی ہوس کی سزا مل گئی ابو جیل سے واپس آ گئے اور اس کے بعد انہوں نے گھر کا انتظام پھر اسی طرح سنبھال لیا۔

نادر نے کبھی ہمارے گھر کے کسی فرد کو کوئی بات نہ بتائی یہاں تک کہ میرے لیے رشتہ تلاش کرنے میں اس کا ہاتھ تھا۔

اور اب توصیف میری زندگی کے ساتھی ہیں چھوٹے بہن بھائی بڑے ہو چکے تھے دو بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں بھائی پڑھ رہا اور ہم سکون کی زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے انسان کو کہ کون سا غنڈہ کتنا شریف ہے اور کون سا شریف کمینہ صفت۔

☆☆

مرجان

مس صبا بہار

جہاں دنیا معاشرتی ترقی کے عروج کو چھو رہی ہے وہاں دوسری جانب کچھ معاشرے ایسے ہیں جو اپنے آباؤ اجداد کی چند جاہلانہ رسم و رواج کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ونی بھی اس قسم کی ہی ایک لعنت ہے جو ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔ یہ وہ رسم ہے کہ جس میں عورت ذات کی بطور سزا شادی کردی جاتی ہے۔ یہ سزا اس کو اپنے بھائی، باپ یا خاندان کے کسی اور مرد کے جرم کرنے کی صورت میں ملتی ہے۔ اس سزا کا فیصلہ علاقے کے مقتدر لوگ اپنی خود ساختہ عدالت میں کرتے ہیں۔

ایک معصوم بچی جسے اس ظالمانہ رسم کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اس کی ماں اپنی معصوم بچی کو اس ظلم سے بچانے کی کوشش کرتی ہے لیکن اسے بے دردی سے قتل کردیا جاتا ہے۔ پھر مردوں کے اس بے رحم معاشرے میں ایک کمزور، اکیلی اور تنہا عورت کی جنگ شروع ہوتی ہے جو وہ جیتتی ہے یا ہارتی ہے اس کا فیصلہ آپ کہانی پڑھ کر خود ہی کریں گے۔

"مرجان" اس انمول نگینہ، معصومیت کے نام جو ہر انسان کے پاس ہوتا ہے۔
مگر یہ بے رحم راہزن دنیا اسے بے دردی سے چھین لیتی ہے

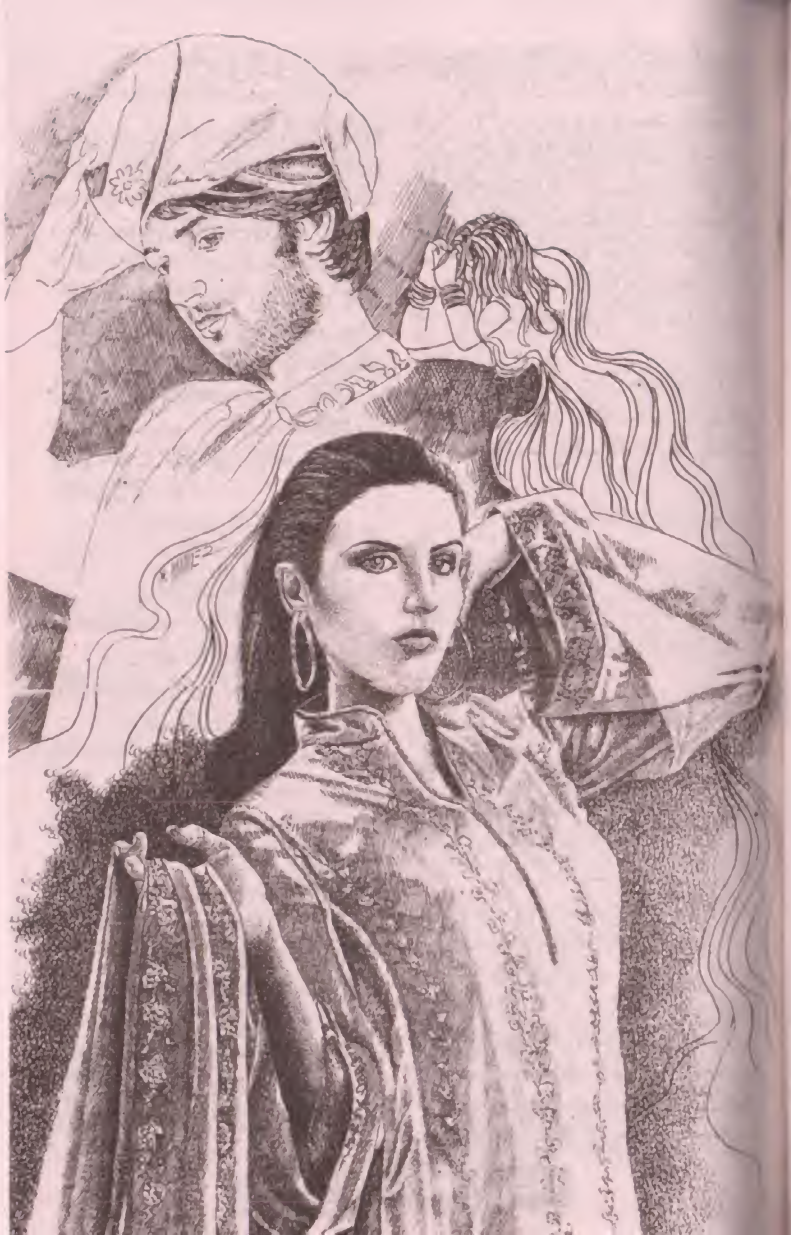

تیسری قسط

مرجان کی جو ابھی ذرا آنکھ لگی تھی۔ گرمیوں کا موسم ..... اسے لگا وہ اپنے گھر کے صحن میں کھڑی ہے۔ ہلکی، ٹھنڈی ہوا اور نرم گرم دھوپ اور نیم کے درخت سے وہ بارش کے قطروں کی طرح گرتے..... وہ کچھ سبز، کچھ زرد..... وہ پتے، درخت کے نیچے کھڑی وہ، جانی پہچانی سی وہ تو مورے تھی، میری اپنی مورے..... وہ مسکرا رہی تھی یا شاید حوصلہ دے رہی تھی۔ ماں کی مسکراہٹ..... اسے عالم خواب میں لگایا شاید نیند یا شاید شدید تھکان و تھکاوٹ کے غشی..... ماں کی مسکراہٹ یاد وہ..... ہوا کا نرم گرم جھونکا اس کی پیشانی کو ہوا نے کس قدر نرمی سے چھوا۔ ابھی وہ اسی کیفیت میں تھی کہ.....

"مرجان اٹھو، اسٹاپ آ گیا، ابھی اترنا ہے یہاں۔"

مرجان کی جو ابھی آنکھ لگی تھی خلیل اللہ، کی آواز نے اسے جگا دیا۔ وہ سرخ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟ یہاں تو بہت بھیڑ ہے۔"

وہ پہلی دفعہ اتنی ساری بھیڑ دیکھ کر کچھ ہڑبڑا گئی۔

"خلیل اللہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس اس کا ہاتھ پکڑ کر بھیڑ میں اس کی بس سے نیچے اترنے میں مدد کی۔ بس کے دروازے پہ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگی تھی بس مشکل سے سنبھلی۔"

"سنبھل کر۔" خلیل اللہ نے ایک ہاتھ سے اسے، سہارا دیا اور دوسرے ہاتھ سے سر کی ٹوپی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"وہ برقعہ ذرا بڑا ہے، پاؤں کے نیچے آ گیا تھا۔" مرجان نے دونوں ہاتھوں سے برقعے کو بمشکل اوپر اٹھایا۔ پٹھانوں کا گول ٹوپی والا برقعہ، پتا نہیں خلیل اللہ کہاں سے اٹھا لیا تھا۔ وہ برقعہ تو ہمیشہ سے اوڑھتی تھی مگر یہ کچھ زیادہ ہی بڑا اور کھلا تھا۔ بس سے باہر نکل کر اس کا دماغ ذرا جگہ پہ آیا تو اس نے سر اٹھا کر اپنے اردگرد دیکھا تو بس..... دیکھتی ہی رہ گئی۔

شام ہو رہی تھی۔ بازار میں ڈھیروں روشنیاں، بلب طرح طرح کی چیزیں، رنگ رنگ کے لوگ، اس قدر بھیڑ، لگتا تھا کل مخلوق خدا یہیں آ گئی ہے۔ کوئی موچھوں کو تاؤ دیتا ہوا نواب زادہ بن کر چل رہا تھا۔ کوئی ہاتھ پھیلا کر ایک سکے کا سوال کر رہا تھا۔ کوئی چیز بیچ رہا تھا، کوئی خرید رہا تھا، کس قدر مختلف تھے سب، بس ایک ہی چیز مشترک تھی ہر کوئی جلدی میں تھا..... بہت جلدی میں، جانے کس بات کی جلدی تھی۔

"تمہیں بھوک لگی ہے۔" خلیل اللہ کو (مکئی) چھلیوں کے بھٹے کی ریڑھی دیکھ کر یاد آیا۔ کہ پچھلے کئی گھنٹے سے۔ اس نے صرف تھوڑے سے چنے ہی کھائے تھے۔

"نہیں۔" مرجان نے نفی میں سر ہلایا۔ "پیاس لگی ہے۔"

"پیاس..... اچھا ہم تمہیں ابھی پانی پلاتا ہے۔" اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اسے سڑک کے ایک طرف بنی دکان میں لے گیا جہاں بھیڑ ذرا کم تھی۔ کچھ پرسکون جگہ تھی۔

"ہم تمہیں گنے کا شربت پلاتا ہے۔" اور پھر اس نے ایک لڑکے کو دو گلاس، گنے کے شربت کا کہا، لمبے سفر سے خلیل اللہ بھی ذرا تھک گیا تھا اس کے ساتھ ہی پڑے لکڑی کے سٹول پہ بیٹھتے ہوئے۔ اس نے بھی اپنی سانسیں درست کیں۔

"تمہیں شہر دیکھنے کا بہت شوق تھا ناں۔"

"ہاں۔" مرجان نے بس سر ہلا دیا۔

"تو دیکھ لو، یہی ہے شہر، ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"کیا سارا شہر ایسا ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کہیں، نہیں مختلف ہے..... کہیں چھوٹا بازار، کہیں بڑا، کہیں لوگ رہتا ہے، کہیں رہائشی علاقہ ہے، کہیں کاروباری علاقہ ہے، کہیں درس و مدرسہ وغیرہ۔ کہیں زیادہ امیر اور پڑھا لکھا لوگ رہتا ہے، کہیں غریبوں کے محلے ہیں۔ ایک جیسا تھوڑا ہی

ہے یہاں تو ہر قدم، دو قدم پہ لوگ اور جگہ بدل جاتے ہیں۔"

"کیا یہ سب سے بڑا، بازار ہے؟"

"کیا، نہیں یہ تو بس ایک چھوٹا سا بازار ہے۔" خلیل اللہ کے غیر متوقع جواب پر مرجان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ابھی یہ صرف ایک چھوٹا سا بازار ہے۔" مرجان زیر لب بڑبڑائی۔

"ہاں، تم پہلی دفعہ شہر آیا ہے ناں، پہلی دفعہ گھر سے باہر نکلا ہے۔ آہستہ، آہستہ تمہیں سمجھ آ جائے گا ہر چیز کا۔" وہ مسکرایا۔

"تم مسکرا کیوں رہے ہو؟" مرجان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ویسے ہی، تم پہ ہنس رہا تھا۔"

"مجھ پہ، کیوں؟"

"تمہارا حال تو اس شتر مرغ جیسا ہے جو انڈے سے نکلتا ہے تو ایک پنجرہ دیکھتا ہے، پوری زندگی اسے پنجرے کو کل دنیا سمجھتا ہے، اک دنیا غلطی سے اس پنجرے سے باہر، لوگوں کی بھیڑ میں آ نکلتا ہے۔"

"پھر.....؟"

"پھر کیا پھر تمہیں دیکھ لو یا اس شتر مرغ کو۔"

"تم امارا مذاق اڑا رہا ہے۔"

"نہیں، نہیں تم برا مت مناؤ، ہم تو بس یونہی..... تم بہت اداس ہو رہا تھا، اس لیے کہہ دیا۔ وقت کے ساتھ تمہیں عادت ہو جائے گا اس سب کا، کوئی بڑی بات نہیں۔"

"خلیل اللہ۔"

"ہوں۔"

"شکریہ۔"

"اس لطف کے لیے۔"

"نہیں، تمہیں اس جہنم سے نکالنے کے لیے..... تم نے بہت احسان کیا۔"

"احسان تم پہ نہیں، ہم نے خود پہ کیا ہے۔"

"اگر ماں کی قبر پہ تم اس دن نہ آتا تو، یا تو وہ لوگ ہمیں واپس لے جاتا، یا ہم وہیں مر جاتا۔"

"ایسے، کیسے مرنے دیتا اپنی مرجان کو، آخر محبت کیا تھا تم سے۔"

"سچ میں..... ہم تو اس وقت بالکل ہمت ہار گیا تھا، ایک بھی قدم اٹھانے کی طاقت نہیں تھی۔"

"ہم تمہارا، طاقت ہے مرجان۔"

"اسی لیے تو شکریہ، کہہ رہا ہے۔" ایک، ڈیڑھ گھنٹے کے مزید سفر کے بعد، خلیل اللہ، اسے ایک کچے سے گھر میں لے آیا۔ پشاور کے ایک گنجان آباد علاقے کا ایک کچا محلہ، دیکھنے میں گھر خاصا پرانا لگ رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، مختصر سے سامان کے ساتھ۔

"یہ میرے بھائی کے سسرالی رشتہ دار کا گھر ہے۔ گھر میں تین عورتیں، تین چار بچے اور دو مرد ہیں۔ مرجان، اماری بات دھیان سے سنو، اگر یہ عورتیں تم سے ملیں اور تم سے پوچھیں تو انہیں بس یہی بتانا کہ ہم تمہارا شوہر ہے اور تم امارا بیوی۔"

"لیکن یہ تو جھوٹ ہے۔" ابھی تو امارا نکاح ہی نہیں ہوا، ہم تمہارا بیوی کیسے ہو سکتا ہے۔

"دیکھو مرجان! اگر تمہیں یہاں چلنا ہے تو تھوڑا بہت جھوٹ بولنے کا عادت ڈال لو۔"

"ہم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔" ہمیں نہیں بولنا آتا۔

"تو ٹھیک ہے، تم ان کو سب سچ بتا دو۔ ابھی نکال باہر کرے گا یہ ہمیں یہاں سے ..... بیوقوف عورت۔" خلیل اللہ کے اس روپے اور باتوں سے اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ خلیل اللہ نے اس کی طرف دیکھا تو ذرا نرم لہجے میں بولا۔

"دیکھو مرجان، ہم جانتا ہے کہ تم اک سیدھا سادہ سا لڑکی ہے۔ جس نے نہ کبھی جھوٹ بولا، نہ کسی کو تکلیف دیا، مگر..... اب زندگی کچھ بدل گئی ہے اور..... حالات کی ساتھ انسان کو بدلنا پڑتا ہے۔ بہتر ہے تم بھی حالات کے ساتھ خود کو خود ہی بدل لو، ورنہ یہ دنیا، بہت بے رحم ہے جب یہ انسان کو توڑ کر بناتی

ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اس دنیا کا ایک روپ تو تم دیکھ ہی چکی ہو۔"

"مگر۔"

"اگر، مگر کچھ نہیں۔"

"تم نکاح کے لیے فکر مند نہ ہو، وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم بس اپنا خیال رکھو۔"

"نکاح صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم سچ میں بہت پریشان ہے..... پتا نہیں کب ہوگا؟"

"نکاح بھی کر لے گا، ذرا حالات برابر آجائیں، تو سب سے پہلے یہی کام کرے گا، تم ان لوگوں کے سامنے اپنی زبان ذرا دھیان اور سوچ سمجھ کر چلانا، خواہ مخواہ، کوئی مصیبت نہ کھڑی کر لینا اپنے لیے۔"

"اگر ان عورتوں نے ہم سے ہمارے متعلق کچھ پوچھا تو، ہم کیا بتائے؟"

"بس کوشش کرنا، اپنے متعلق کم سے کم بتاؤ، اپنا نام بھی مرجان کی جگہ کچھ اور بتا دینا۔"

"کچھ اور....."

"ہاں، کچھ اور....."

"کچھ اور کیا بتائے؟"

"اب وہ بھی ہم تمہیں بتائے، لڑکی تھوڑا دماغ تو تم اپنا استعمال کر لو، اچھا ایسا کرو اپنا نام، گل بکئی بتا دینا..... ٹھیک ہے!"

"ہاں! ٹھیک ہے۔"

"تم خود کوشش کرنا، ان لوگوں کے پاس کم بیٹھو، اور کم بولو، وہ حضرت لقمان کی نصیحت ہے ناں، کہ بولنے پہ پریشانی ہو سکتا ہے، خاموش رہنے پہ نہیں۔"

"ہمیں تو ویسے بھی زیادہ بولنے کی عادت نہیں۔"

"اچھی عادت ہے۔" خلیل اللہ نے کہا اور ایک چارپائی پہ آنکھیں موندھ کر لیٹ گیا۔ سفر کی شدید تھکاوٹ تھی، پورا بدن درد سے چور، چور تھا، تقریباً تین، چار دن اسی بھاگم بھاگ میں گزر گئے وہ ٹھیک طرح سو بھی نہیں سکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر کے اندر کی طرف بنے دروازے پہ دستک ہوئی۔ ایک مرد کی آواز تھی اس نے خلیل اللہ کو کچھ کہا، خلیل اللہ تھوڑی دیر بعد اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ ایک پلیٹ چنے کی دال۔ چار روٹیاں، قہوے کی چینک اور دو چھوٹی پیالیاں کھانا، کھا کر دونوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور سو گئے۔

آہٹ سے مرجان کی آنکھ کھلی۔ جو ایک کونے میں پڑی چارپائی پہ بے سدھ سو رہی تھی۔

"تم کہاں جا رہا ہے؟" اس نے خلیل اللہ کو سر پہ ٹوپی اور چادر کندھوں پہ رکھے دیکھا تو پوچھا۔

"وہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے، ہم یہاں قریب مسجد میں جا رہا ہے، تم اٹھ گیا ہے تو تم بھی فرض ادا کر لو، اللہ کو یاد کرو تو وہ بھی یاد رکھتا ہے۔"

"غسل خانہ کہاں ہے۔" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"کمرے کے دروازے کے دائیں جانب۔" خلیل اللہ نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"گھر کی عورتوں کی آوازیں آ رہا ہے، لگتا ہے وہ بھی نماز کے لیے اٹھ گیا ہے۔ یہاں کی عورتیں پردہ دار ہیں، غیر مرد کے سامنے نہیں ہوتیں۔ تم خود اندر جا کر دیکھ لو، ہم رحیم بھائی کے ساتھ مسجد تک جا رہا ہے۔" خلیل اللہ اتنا کہہ کر کمرے کا باہر والا دروازہ جو گلی میں کھلتا تھا، تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"ہم اور کتنے دن یہاں رہے گا؟" مرجان نے قہوہ پیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"بس ایک دو دن ہم کرائے کا ایک کمرہ دیکھ رہا ہے وہ مالک مکان پیسے ذرا زیادہ بتا رہا ہے، بس تم دعا کرو، وہ ذرا کم پہ مان جائے۔ ہماری جیب میں تو اتنا پیسہ نہیں۔ ایک، ایک روپیہ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرنا ہوگا۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔" مرجان نے اسے روایتی سے تسلی دی اور پھر کسی سوچ میں سر جھکا لیا۔

"خیریت ہے، کیا سوچ رہا ہے؟"

"بس ویسے ہی، زیادہ دیر کسی کے گھر رکنا مناسب نہیں لگتا۔"

"کیوں، کوئی بات ہوا ہے؟"

"بات، وات تو نہیں ہوا، بس یہاں کی عورتوں کو زیادہ کریدنے کی عادت ہے، بہت سوال کرتی ہیں۔"

"کیا پوچھ رہی تھیں؟"

"پوچھ تو بہت کچھ رہی تھیں، ہم نے بس اتنا بتایا کہ..... ہمارا نیا نیا شادی ہوا ہے، تم یہاں شہر میں کاروبار کی خاطر آیا ہے۔ ہم اکیلا تھا اس لیے مجبوراً ہمیں بھی ساتھ لے آیا۔"

"کیا کرے، اگر ہمارے پاس کچھ پونجی ہوتا تو کب کا یہ شہر بھی چھوڑ دیتا، ہاتھ بالکل خالی ہے..... سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اچانک ہی گھر سے نکلنا پڑا۔"

"تم کوئی کام وام دیکھوناں، اپنے لیے۔"

"اور تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم سارا دن باہر جھک مارتا ہے۔ سیر کرتا پھرتا ہے۔ کام ہی دیکھ رہا ہے اپنے لیے۔"

"ہم نے یہ تو نہیں کہا۔" خلیل اللہ کے اچانک روکھے لہجے سے وہ ششدر رہ گئی۔ اس کے اس لہجے سے واقعی اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔

"وہ ہم سارا دن کام کی خاطر خوار ہوتا رہتا ہے، ذرا تھک گیا ہے....." وہ شرمندگی نہ چھپا سکا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم جانتا ہے تم اس وقت مشکل میں ہے اور وہ بھی..... ہماری وجہ سے۔"

"نہیں، تمہاری وجہ سے کیا؟ تمہاری وجہ سے نہیں..... دراصل تم جانتا ہی نہیں ہے۔ اس دنیا میں باہر نکل کر سب سے مشکل کام ہی یہی ہے..... حلال رزق کمانا، یونہی تو نہیں اللہ نے اسے عین عبادت کہا۔ عبادت تو ہے مگر..... ہم جیسے غریب، کمزور لوگوں کے لیے کچھ زیادہ ہی مشکل عبادت ہے۔"

"تم بس کوشش اور محنت کرو۔ وہ آسمان والا ہے ناں، وہ محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ بہت مہربان ہے۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں، وہ مہربان ہے، مگر ان زمین والوں کا کیا کرے، جو بہت بے رحم اور نا مہربان ہے۔ دھکا دینے کے لیے تیار کھڑا رہتا ہے۔" خلیل اللہ چند دنوں کی خواری سے ہی تنگ آ گیا تھا۔

"ہمارا تو اس علاقے میں رہنا بھی..... خطرے سے خالی نہیں، ہمارا علاقہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ چوبیس گھنٹے کانوں میں خطرے کا گھنٹی بجتا رہتا ہے۔ بے شک منزل خان مر گیا ہے مگر وہ کم بخت لوگ اس کی بیوہ سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں، پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔"

"کیا؟"

"مرجان نے پریشانی سے سر پکڑ لیا۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا۔"

"بس پتا چل گیا۔ اپنے ہی اک بندے سے خبر ملا، پہلے تو ہمیں صرف اندازہ ہی تھا کہ وہ اس قدر آسانی سے جان نہیں چھوڑے گا، مگر ہاتھ دھو کر ہی پیچھے پڑے گا۔ اس کا اندازہ نہیں تھا ہمیں۔"

"اب ہم کیا کرے، اگر وہ لوگ یہاں پہنچ گیا تو.....؟"

"تم اس کی فکر نہ کرو، ہم تین چار جگہ بدل کر یہاں آیا ہے۔ یہ جگہ نسبتاً زیادہ محفوظ ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کبھی یہاں تک کبھی پہنچ آئے مگر اس میں انہیں وقت لگے گا، اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتا۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے؟"

"کیونکہ وہ لوگ سمجھتا ہے کہ تم اکیلا کہیں نکل گیا ہے۔" خلیل اللہ نے سر سے ٹوپی اتار کر چارپائی کے تکیے پر رکھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"انہیں تو اندازہ ہی نہیں کہ تم ہمارے ساتھ ہے، ورنہ وہ کب کا یہاں پہنچ چکا ہوتا۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" مرجان کو بھی کچھ تسلی ہوئی۔

"وہ لوگ یہی سمجھتا ہے کہ ہم کاروبار کے سلسلے میں شہر میں ہے اسی لیے کسی کو ہمارے پیچھے شک نہیں ہوا، لیکن اس بات پہ ہم مطمئن بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ عقل مند لوگ کہتے ہیں، دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہلکی

سی لاپروائی امارے گلے کا پھندہ بن سکتی ہے۔ ویسے بھی ایک نہ ایک دن تو یہ بات کھلے گی اور اس دن وہ صرف تمہیں نہیں، ہمیں بھی ڈھونڈے گا۔" ہمیں بس جلد از جلد کچھ پیسے جمع کر کے یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔

☆☆☆

"تم تو کہہ رہا تھا، بس ایک دو، دن میں ہم یہاں سے چلا جائے گا۔"

"ہاں، کہا تو تھا، کیا کرے، مالک مکان کم پہ رضامند ہی نہیں ہوا۔ اس نے کمرہ کسی اور کو کرائے پہ دے دیا۔"

"تو کوئی اور ٹھکانا دیکھوناں۔"

"دیکھ تو رہا ہے، ہم تم سے زیادہ فکر مند ہے۔"

"فکر مند تو ہے، مگر تم سارا دن باہر رہتا ہے، ہم اور ان عورتوں سے مغز ماری نہیں کر سکتا۔ امارا دماغ پک گیا ہے۔"

"کیوں، کیا کہتا ہے تمہیں۔"

"وہ جاننا چاہتا ہے کہ ہم اور کتنے دن یہاں رہے گا۔"

"کیوں کچھ کہا انہوں نے تم سے۔"

"غیرت مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔"

"غیرت مند نہیں، عقل مند....."

"اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، یہاں غیرت کا ہی معاملہ سمجھو۔"

"دیکھو، مجھے بھی ان لوگوں کو تنگ کرنا اچھا نہیں لگ رہا، یہ بھی ان کا احسان ہے کہ اتنے دن انہوں نے برداشت کیا ہمیں۔"

"تھوڑے دنوں میں بندوبست ہو جائے گا، تم صبر کرو۔"

"یہاں بات امارے صبر کا نہیں ہے۔ وہ رحیم اللہ کا ماں بتا رہا تھا، انہیں خود جگہ کا بہت تنگی ہے۔ کمرہ انہیں چاہیے اگر ذرا جلدی.....خالی کر کے دے دو تو مہربانی ہوگا۔"

"ہم کون سا کھا جائے گا اس کا کمرہ، خوشی سے تھوڑا ہی بیٹھا ہے ادھر ان سے بولو، کوئی جگہ ملتے ہی شکریہ ادا کر کے چلا جائے گا۔"

"کمرہ تو نہیں، ان کا آٹا تو کھا رہا ہے ناں، مرجان نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا، دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھتے ہوئے ذرا مدھم آواز میں کہا۔"

"کتنا سا آٹا ہم کھا گیا ہے ان کا، اب وہ عورت امارا روٹی بھی گنتا ہے۔"

"گنا نہیں ہے ان لوگوں نے.....دیکھو وہ امارا کوئی پھوپھی بھی نہیں ہے جو امارا بوجھ اٹھائے، ہمیں خود بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"ضرور اس عورت نے کوئی بات کیا ہے جو تمہارا دل اتنا برا ہو رہا ہے۔"

"چلو اچھا، کھانا کھاؤ، جلدی ہی کوئی بندوبست کرے گا۔ ہم بھی کیا کرے؟ کام ڈھونڈے یا گھر؟ روزی روٹی کی فکر کرے یا چھت کی؟ باہر تو لگتا ہے آگ لگا ہوا ہے ہر چیز کو، اتنا مہنگائی، لگتا ہے اب تو اس دنیا میں مٹی بھی تولے کے حساب میں بکے گا۔ ہم لوگوں کے لیے تو ویسے ہی یہ زمین تنگ ہوتا ہے۔ بیروزگاری بھی اتنی ہے۔ مزدوری ڈھونڈنا بھی یہاں جوئے شیر نکالنے کے برابر ہے۔ ہم جانتا ہے یہاں کوئی کام آسان نہیں پہلے ایک مستقل کاروبار تھا اب نئے سرے سے قدم جمانا.....کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔"

"اللہ کوئی سبب بنا ہی دے گا، تم فکر نہ کرو۔"

"تم بھی فکر مت کرو۔ جلد ہی کوئی انتظام ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔"

"ان شاء اللہ۔"

"اچھا، اب روٹی کھاؤ، خلیل اللہ نے اس کے ہاتھ میں آدھی روٹی توڑ کر پکڑاتے ہوئے کہا۔"

"امارا جی نہیں چاہا رہا، ہمیں بھوک نہیں ہے، تم کھاؤ۔"

"اگر تمہیں کام نہیں مل رہا تو تم رحیم بھائی کی طرح کوئی مزدوری، وزدوری ڈھونڈ لو، وہ عورت کہہ رہا تھا ان کا بیٹا بھی مزدوری کرتا ہے، بہت محنت سے

اپنے بچوں کے لیے رزق کما کر لاتا ہے۔"

"اچھا، تو یہ بات ہے، اس لیے تم کھانا نہیں کھا رہا، یہ رحیم اللہ کی ماں بھی بڑا عجیب عورت ہے، یہاں پورے محلے میں درس و تدریس کرتا پھرتا ہے۔ دوسروں کو اخلاقیات، انسانیت اور احسانات کا سبق پڑھاتا ہے اور اپنا اخلاق دودن میں بہہ گیا۔"

"دیکھو، وہ واقعی دین دار عورت ہے۔"

"رہنے دو، ان کو تو دین کا پتا ہی نہیں ورنہ آپ کے صحابیوں نے خود بھوکا رہ کر بھی دوسروں کو کھانا کھلایا ہے۔"

☆☆☆

"ایک کمرہ تو ملا ہے، کرایہ بھی تھوڑا ہے۔"

"شکر ہے اللہ کا۔" مرجان نے فوراً کہا۔

"شکر تو ہے مگر....."

"مگر کیا؟"

"تم وہاں پہ نہیں رہ سکے گا۔"

"کیوں؟"

"وہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں، میرا مطلب ہے، ذرا، اچھی نہیں ہے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا، جگہ تو ہے۔"

"جگہ تو ہے۔" خلیل اللہ نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

"وہ کھلے نالے کے قریب جگہ ہے، بہت بدبو ہے۔"

"فرق نہیں پڑتا، وہاں اور بھی تو لوگ رہتا ہوگا۔"

"ہاں، آبادی تو بہت ہے، وہاں۔"

"مگر، ہمیں تو فرق پڑتا ہے ناں، ہم ایسی جگہ پہ نہیں رہ سکتا۔"

"دیکھو، خلیل اللہ، ہم کون سا اس جگہ ساری زندگی رہے گا اور تم ویسے بھی کون سا گھر پہ ہوگا، سارا دن کمائی کے لیے گھر سے باہر ہی رہنا پڑے گا۔ گھر میں تو ہم ہوگا نا.....جب ہم راضی ہے تو تم بھی اراہمت کرو۔"

"لگتا ہے تم اس دین دار عورت سے سخت تنگ ہے، بس یہاں سے نکلنا چاہتا ہے، چاہے نالے پہ رہنا پڑے۔"

"ایسی بات نہیں ہے، ہم تو صرف اتنا سوچتا ہے کہ ہمیں کوئی حق نہیں ہے کسی کو تکلیف دینے کا۔"

"اچھا ٹھیک ہے اگر تم وہاں رہنے پہ راضی ہے تو ہم کل صبح ہی یہاں سے نکل جائے گا۔"

مرجان، جب خلیل اللہ کے ساتھ وہاں پہنچی، تو برقعے کا کونا اٹھا کر منہ پہ رکھ لیا۔

"استغفار، کس قدر بدبو ہے یہاں۔"

"ہم نے تو تمہیں بتایا تھا۔" کمرہ کی حالت بہت خستہ تھی۔ لگتا تھا عرصے سے کسی بندہ، بشر نے اس کمرے کا رخ نہیں کیا تھا۔

مرجان کا دل گھبرا گیا یہاں پہ کیسے رہے گا، یہاں رہنا تو بہت مشکل ہے، اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا مگر خلیل اللہ پہ اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دی۔ اسے حوصلہ دینے کے لیے حوصلہ کرنا ضروری تھا۔

شام کو خلیل اللہ کچھ برتن گھر کے لیے چند ضروری چیزیں اور دو بستر لے آیا۔ مرجان، جتنی اچھی صفائی ستھرائی کر سکتی تھی اس نے کی۔ تھک ہار کر جب بیٹھی تو اسے لگا کہ کمرے کی دیواریں اس کا منہ چڑا رہی ہیں۔ اتنی زیادہ محنت اور صفائی ستھرائی کے بعد بھی اس کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ جانے کیوں اس کا دل کچھ اداس ہو گیا، اتنے میں خلیل اللہ دو نان اور ایک پلیٹ سالن لے آیا۔

"بسم اللہ کر کے کھاؤ، ان شاء اللہ کل سودا سلف بھی لے آئے گا تو گھر میں ہی پکا لینا۔"

"او نہوں، اس قدر بدذائقہ سالن، ہم سے تو نہیں کھایا جائے گا۔" خلیل اللہ نے پلیٹ ایک طرف دھکیل دی۔

"دیکھو، اللہ کی ناشکری مت کرو، کتنے ہی لوگ ہوں گے جنہیں یہ بھی نصیب نہیں، تم خود ہی تو نبیوں، پیغمبروں کی مثالیں دے رہا تھا۔ اب اپنی دفعہ ساری

مثالیں بھول گیا۔"

"اچھا، اچھا دکھانا، کھالیتا ہے۔" اس نے چار و ناچار، نوالہ توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔

"تمہارے کام کا کیا ہے؟"

"کیا کام کرے..... پہلے تو اپنی زمین کے میوے لاکر یہاں بیچتا تھا اور یہاں سے نیاری کا سامان اور مصالحے وہاں، دکانوں پہ دیتا تھا، اب یہ کام تو نہیں رہا۔"

"ہاں، مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ ایک کام تو ملا ہے وہ کپڑے کی دکان پر تو کرلو۔"

"تم صحیح کہہ رہا ہے، فی الحال یہی کام کرلیتا ہے، پھر کہیں اور ہاتھ لگا تو کوئی اور اس سے بہتر کام پکڑ لے گا، دراصل وہ بڈھا..... دکان کا مالک، وہ ایک بندے سے دو بندوں کا کام لینا چاہتا ہے۔"

"اب خرچے کے لیے کام تو کرنا پڑے گا۔"

"چلو، کوئی بات نہیں مجبوری ہے، کیا کرسکتا ہے؟"

"اب گھر کا کرایہ بھی تو دینا ہے، زیادہ یا کم، وقت پہ مالک مکان کو پیسے تو دینے پڑیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے، کوئی ہاتھ پاؤں مارے گا تو کچھ ہاتھ آئے گا ناں۔"

☆☆☆

"گھر کو چھوڑے ہوئے ایک ڈیڑھ ماہ ہوا ہے لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے کئی سالوں سے گھر کا شکل نہ دیکھا ہو۔ اب اپنا گھر اور علاقہ یاد آتا ہے، تمہیں یاد نہیں آتا؟" خلیل اللہ گھر کو یاد کر کے اداس ہو رہا تھا۔

"نہیں..... ہم تو دعا کرتا ہے اللہ کچھ ایسا کرے کہ ہمیں وہ گھر، وہ لوگ، ہمیشہ کے لیے بھول جائے۔ چھوڑو، ذکر ہی مت کرو، ہم یاد ہی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ہاں۔" تمہارا بھولنا تو بنتا ہے، مگر ہم کیا کرے، ہمیں تو گھر اور گھر والوں کا یاد بہت ستا رہا ہے۔" خلیل اللہ نے اک سرد آہ بھری۔ "اچھا چھوڑو، میں بھی بھول جاتا ہوں، ویسے بھی وہ کہتے ہیں ناں، کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ تمہیں پانے کے لیے جانے کیا، کیا کھویا ہے میں نے۔"

"اگر زندگی میں کسی دن بیٹھ کر تمہیں اس بات کا حساب لگانا پڑا تو کیا، تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہو گا؟"

"نہیں، پچھتاوا کیسا؟ ہم بہت محبت کرتا ہے تم سے..... اب ویسے بھی حالات ویسا نہ رہا تھا کہ ہم رشتہ بھیجتا اور وہ خوشی خوشی تمہارا نکاح امارے ساتھ کر دیتا۔ اگر اس دن ہم تمہیں وہاں سے بھگانے میں ذرا سا بھی دیر کر دیتا تو آج جانے کہاں تم ہوتا..... اور جانے کہاں ہم..... میرے دل نے کہا کہ فوراً تمہیں یہاں سے دور لے جاؤں، ورنہ..... کبھی اپنی مرجان کی شکل دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا۔"

تشکر و محبت کے جذبات سے بھرے، مرجان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ خلیل اللہ کے لیے کچھ خاص محسوس کرنے لگی ہے..... جو..... جو اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا..... عزت، اعتبار، بھروسا، مان، لفظ واحد یعنی محبت؟" بہت خاص، بہت عجیب، بہت معتبر سا احساس تھا۔ یہ محبت چیز ہی ایسی ہے خود ہی انسان کے دل، روح اور وجود کے اندر اپنی جگہ بنا لیتی ہے یا کسی خوشبودار ہوا کی طرح..... انسان کے انگ، انگ کے اندر پھیل جاتی ہے۔ صرف ایک یہی احساس، زندگی کی ہر کمی پوری کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ ابھی اسی کیفیت میں تھی اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ خلیل اللہ کی آواز نے اسے دوبارہ متوجہ کیا۔

"تم تو اس دن ماں کی قبر پہ سر رکھ کر سو گیا تھا، اس ڈیڑھ گھنٹے میں ہم نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا، ان حالات کا بھی تقریباً اندازہ تھا ہمیں۔"

"ویسے تم اس دن قبرستان پہنچا کیسے؟ تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ ہم وہاں ہے۔" مرجان نے پوچھا۔

"جب، زینب صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھا تو

اسے تمہارے گھر سے شور کا آواز سنائی دیا تو اس نے گھبرا کر ہمیں بھی اٹھا دیا۔ پھر تمہارا بھی آواز آیا۔ تھوڑی دیر بعد تمہیں، دلاور خان کی ساتھ باہر نکلتے دیکھا تو ہم بھی پیچھے نکل آیا۔ ہم نے تمہارا اور دلاور خان کا ساری باتیں سن لیا تھا۔"

"پھر تو تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ہم نے پتھر مارا تھا اس کی ناک پر۔"

"ہاں، بہت زور سے، جب ہم اس کے پاس پہنچا تو، وہ بالکل بے ہوش پڑا تھا ناک اور منہ سے خون بھی نکل رہا تھا۔"

"تو تم نے اس کی مدد کا نہیں سوچا۔ آخر وہ تمہارا بچپن کا دوست تھا۔"

"سوچا تھا، مگر ہمیں اس وقت صرف تمہاری فکر تھا اس لیے تمہارے پیچھے چلا آیا۔"

"شکریہ۔"

"کس بات کا؟"

"ہماری فکر کرنے کا۔" وہ مسکرائی۔ "تو جانے کتنے دنوں بعد، وہ بھی مسکرا دیا۔

"ماشاء اللہ، کس قدر خوب صورت لگتی ہے وہ مسکراتے ہوئے۔" اس کے دل نے اس سے گویا سرگوشی کی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں....." خلیل اللہ نے اس سے نظریں چرالیں۔ ذرا دیر کچھ اور جو اسے نظر بھر کر دیکھ لیتا تو جانے کیا ہو جاتا..... اس کا دل کچھ بے ترتیب سا دھڑکنے لگا۔ دل کی دھڑکن درست کرنے کے لیے نظریں چرا لینا بہتر تھا۔

☆☆☆

رات کو سوتے ہوئے اسے لگا، جیسے اس کے گال کو کسی نے چھوا، وہ گھبرا کر اٹھی، یہ کوئی اور نہیں..... خلیل اللہ ہی تھا۔

"تم اس وقت..... میرا مطلب ہے..... ادھر کیا کر رہے ہو؟" وہ اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر تھوڑا گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں..... تمہیں دیکھ رہا تھا۔"

"یہ کون سا وقت ہے؟..... جاؤ، جا کر سو جاؤ۔"

"سو، تو جاؤ نیند نہیں آ رہا۔"

"تو آیت الکرسی پڑھو، کوئی قل، درود پاک پڑھ لو۔ نیند آ جائے گا۔"

"تم اماری، دادی ماں نہ بنو۔" اس نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے کہا ہو۔ "جان بوجھ کے سمجھنا نہیں چاہتی مجھے۔"

مرجان نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال پیچھے کیے۔ وہ سچ میں گھبرا رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی خلیل اللہ کو کیسے سنبھالے۔ ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

"تم جاؤ، جا کر اپنے بستر پر لیٹو، نیند آ جائے گا۔"

"کیوں جائے؟ ہم تمہارے پاس آنا چاہتا ہے۔" آخر، اس نے کہہ ہی دیا۔

"دیکھو خلیل اللہ، یہ صحیح نہیں ہے۔"

"کیا، صحیح نہیں ہے؟" خلیل اللہ ڈھیٹ بن گیا۔

"ہم تمہیں بہت پسند کرتا ہے تم سے محبت کرتا ہے۔ اس میں کیا صحیح نہیں ہے۔ تم بتاؤ، کیا تم ہمیں پسند نہیں کرتا؟"

"ہاں..... کرتا ہے۔" مرجان نے رک رک کر کہا۔

"لیکن..... تم بھی جانتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ امارا ابھی نکاح نہیں ہوا۔ ہم ابھی تمہارا بیوی نہیں ہے۔ ابھی بھی ہم منزل خان کا بیوہ ہی ہے۔"

"لعنت بھیجو، تم اس وقت، اس بندے کا ذکر کیوں کر رہا ہے؟"

"لعنت بے شک بھیجے، مگر یہ سچ ہے کہ، جیسا بھی امارا نکاح اس کے ساتھ ہوا۔ وہ امارا شوہر تھا اور اب، ہم اس کا بیوہ ہے۔ امارا عدت بھی پوری نہیں ہوئی۔ تمہارے ساتھ نکاح بھی نہیں ہوا۔"

"نکاح اتنا آسان نہیں ہے۔" خلیل اللہ نے غصے سے دونوں ہاتھ اپنے دونوں بازوؤں پہ رکھ لیے،

یہاں صرف نکاح کرنا ہی نہیں ہوتا اسے رجسٹر بھی کروانا ہوتا ہے اس کے لیے کاغذات چاہیے ہوتے ہیں امارا تو شناختی کارڈ ہے تم تو ابھی پورے پندرہ سال کا بھی نہیں ہوا۔ تمہارا تو نہ شناختی کارڈ ہے امارے پاس، نہ ب فارم، نہ کوئی اور کاغذ، نہ ہی یہاں امارا کوئی رشتہ دار ہے..... بہت لمبا کام ہے۔"

"دیکھو، خلیل اللہ، اچھے کی نیت کرو تو کام ہو ہی جاتا ہے۔" مرجان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کچھ بھی ہو جائے ہم گناہ نہیں کرے گا۔ جائز طریقے سے اپنا رشتہ بنائے گا۔ ہم مانتا ہے ہماری نہ اتنی عمر ہے، نہ تجربہ، نہ اتنا علم ہے ہمیں..... لیکن عدت، نکاح، حلال، حرام، ثواب، گناہ اس کا کافی سمجھ آ گیا ہے ہمیں۔"

"ہاں، واقعی تم اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار ہو گیا ہے۔" معلوم نہیں خلیل اللہ نے اس پہ طنز کیا تھا یا اس کی تعریف کی تھی۔

"دیکھو، ہم نے معلمہ کے پاس قرآن کے ساتھ فقہ کے مسائل بھی پڑھے ہیں۔"

"ان پڑھ، ناسمجھ، ہم بھی نہیں ہے، ہم نے بھی پڑھے ہیں..... مگر اب ہم ان حالات میں ہے کہ جلدی نکاح نہیں کر سکتا۔"

"دیکھو صبر کرو جلدی کا کام شیطان کا ہے۔ ایسے نہ ہو کہ شیطان تمہیں بہکا دے، خود کو سنبھالو۔"

"ہم تو سنبھال کے بیٹھا تھا مگر کیا کرے، تمہارا حسن ہی اتنا کافی ہے۔ امارا ایمان کمزور کر دیا۔"

"توبہ کرو..... استغفار پڑھو، تمہارے سر پر واقعی شیطان سوار ہو گیا ہے۔ خود پہ اس کا غلبہ نہ آنے دو..... تم بھی حافظ قرآن ہے۔ اچھی طرح جانتا ہے ایک لمحے کی غلطی سے دنیا اور آخرت دونوں خراب ہو سکتا ہے۔"

"اچھا، اچھا مولانا صاحب، سمجھ آ گیا ہمیں۔"

"مولانا سے یاد آیا، تم کل مسجد کے مولانا کے پاس جاؤ، ان سے عدت کی مدت اور احکامات کے متعلق ذرا تفصیل سے پوچھ لینا۔ اور اس کے بعد نکاح کا کوئی انتظام کرو۔ جب ہم قانونی اور شرعی طور پر تمہاری منکوحہ بن جائے پھر امارے پاس آنا اس سے پہلے سوچنا بھی مت ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ، ہم تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کرے گا، تمہیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

"کہاں جائے گا؟"

"جہاں بھی جائے تم نے ہی تو کہا تھا۔ خدا کا بستی بہت بڑا ہے۔ کہیں پہ بھی جائے، تمہارے ساتھ نہیں رہے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ زیادہ دھمکی مت دو۔"

"جاؤ، جا کر سو جاؤ۔"

"کیسے سو جائے، اتنا مچھر ہے، کاٹ، کاٹ کے ہاتھ پاؤں سوجھا دیا امارا۔ نیند آ ہی نہیں رہا۔"

"اف خدایا! تمہیں مچھر کاٹ رہا ہے تو ہمیں کوئی دلاسے نہیں دے رہا۔ ہمیں بھی کاٹ رہا ہے۔ ہم بھی تو سونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جاؤ، جا کر تم بھی سونے کی کوشش کرو۔"

☆☆☆

اللہ، اللہ کر کے رات کٹی، اگلی صبح مرجان نے اٹھ کر معمول کے مطابق قہوہ بنایا اور دو روٹیاں اور رات کا بچا ہوا تھوڑا سا سالن لے کر اس کے پاس آئی۔ سب کچھ ہی معمول کے مطابق تھا سوائے..... خلیل اللہ کے رویے کے۔

"ہمیں دیر ہو رہا ہے، ہم کام پہ نکل رہا ہے۔"

"پہلے کچھ، کھا تو لو۔"

"اس قدر بدبو ہے یہاں، یہاں بیٹھ کر کچھ کھانے کا دل بھی ہوتا ہے؟" اس نے غصے اور ناگواری سے اپنی چادر جھاڑی۔

"تم غصہ کیوں ہوتا ہے۔ جو باقی اتنے سارے لوگ یہاں رہ رہے ہیں، وہ بھی تو انسان ہیں، کوئی جانور تو نہیں، کیا ان کا ناک نہیں ہے یا انہیں بدبو نہیں آتا یا انہیں مچھر نہیں کاٹتا، یہاں چھوٹا، چھوٹا بچہ ہے، بوڑھا، بیمار لوگ بھی، وہ بھی تو گزارا کر رہا ہے۔"

مرجان کو بھی غصہ آ گیا۔

"سوچا نہیں تھا، زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا، عجب نحوست چھا گیا ہے زندگی پر ..... استغفار اللہ، جہاں سے ہم گزرنا پسند نہیں کرتا تھا آج وہاں رہ رہا ہے۔" وہ غصے میں بڑبڑاتا رہا اور باہر نکل گیا۔

اگلے کچھ دن ایسے ہی گزرے۔ وہ رات کو گھر دیر سے واپس آتا، صبح جلدی نکل جاتا۔ گھر پہ کھانا بھی چھوڑ دیا تھا اس سے بات کرنا کم کر دیا حتی کہ اس کی طرف دیکھنا بھی۔ وہ اس کے رویے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ اس کے رویے کی وجہ کوئی شرمندگی تھی یا ناراضی۔

"پورا ایک ہفتہ ہو گیا تم ہم سے نہ تو صحیح بات کرتا ہے نہ گھر پہ کھانا کھاتا ہے۔ صبح جلدی نکل جاتا ہے، رات کو ہم انتظار کر کر کے تھک جاتا ہے پھر کہیں تمہارا شکل نظر آتا ہے۔"

"کیوں، تمہیں امارا شکل میں کیا دلچسپی۔"

"یعنی تم ناراض ہے ہم سے ....." اس نے حیران ہو کر کہا۔ "ناراض تو ہمیں ہونا چاہیے تھا۔"

"تو ہو جاؤ..... تم بھی ناراض۔" اس نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

"ہو تو جائے مگر..... خلیل اللہ دیکھو، پہلے ہی امارا زندگی میں بہت تنگی اور پریشانیاں ہیں..... خدا کے لیے انہیں اور مت بڑھاؤ۔"

"اب ہم نے کیا کیا ہے۔"

"تم ہمیں تکلیف دے رہا ہے۔"

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ، تمہارے قریب آؤ تو غلط اور اگر دور جاؤ تو مصیبت۔"

"اب ہم کیا بات کرے۔ بات کرنے کا ادھر کوئی فائدہ ہی نہیں۔" وہ تھک ہار کر ایک پرانی چارپائی پہ بیٹھ گئی جو خلیل اللہ ایک کباڑ خانے سے سستے داموں خرید کر لایا تھا۔ "جب ایک انسان بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا تو مغز ماری کا کیا فائدہ۔"

"ہاں، مت کرو امارے ساتھ مغز ماری۔"

"اچھا بتاؤ، مسجد کے مولوی سے بات کی۔"

"ہاں کی۔"

"کیا کہا۔"

"وہ تو چار، پانچ ماہ کا بتا رہا ہے۔" خلیل اللہ نے منہ بنا کر کہا یعنی ابھی امارا نکاح کم از کم دو ماہ تک تو مزید نہیں ہو سکتا۔"

"دو ماہ تو اتنا لمبا عرصہ نہیں، تم تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے دو سال کے انتظار کا کہا ہو۔"

"نکاح کون سا آسان ہے یہاں ..... یہاں جرگے کا کالا قانون تو نہیں کہ چھوٹی سی بچی کو پکڑ کر بڈھے کے حوالے کر دو۔ یہ شہر ہے۔ یہاں ہر کام قانون اور طور طریقے سے ہوتا ہے۔ یہاں نکاح کے لیے لڑکی کا بالغ ہونا ضروری ہے اور اس کا شناختی کارڈ بھی، جو کم از کم 18 سال کی عمر میں ہی بنتا ہے۔ نکاح نامہ فارم پہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن تمہارے پاس تو وہ بھی نہیں۔

"یعنی امارا نکاح نہیں ہو پائے گا۔"

"نہیں، ہو جائے گا۔ گواہوں کا بندوبست بھی وہی کر لے گا، بس نکاح کے لیے مولوی کے ہاتھ پہ کچھ نہ کچھ رکھنا پڑے گا۔" وہ کہہ کر باہر کام پہ نکل گیا۔

"مرجان سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دو ماہ یعنی 60 دن۔"

ویسے پریشانی تو کچھ نہ تھی مگر اس طرح رہنا ذرا مشکل تھا۔ جب تک خلیل اللہ نے ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ ذرا بے فکری میں تھی، اب ذرا فکر لگ گئی تھی، اگر..... اللہ نہ کرے اس نے پھر ایسی کوئی حرکت کی تو ..... وہ کیا کرے گی۔

دو ڈھائی ہفتے ایسے ہی گزر گئے۔ خلیل اللہ کے رویے میں کچھ بہتری آئی۔ کپڑے کی دکان پہ اس پہ کام کا بوجھ تو زیادہ تھا۔ لیکن ایک چیز ہوئی بڈھے مالک کا رویہ اس سے خاصا اچھا تھا۔ اسے اس کی تنخواہ کے اوپر بھی کچھ دے دیتا تھا اور جس دن کچھ زیادہ نفع ہوتا اس دن خلیل اللہ کے ہاتھ پہ بھی کچھ نہ کچھ رکھ دیتا۔ ایک دن وہ مرجان کے لیے دو خوب صورت کپڑوں کے جوڑے لے آیا۔

"یہ تو بہت خوب صورت ہیں۔" اس نے خوش ہو کر کپڑوں کو دیکھا۔

"مگر یہ تو مہنگا بھی ہوگا۔ کتنے کا لایا۔"

"بس مفت۔"

"مفت کیا مطلب؟"

"ہم نے مالک سے بولا کہ ہمیں اماری بیوی کے لیے دو سوٹ خریدنا ہے۔"

"اسے کہا خریدنے کی کیا ضرورت ہے دکان بھری ہوئی ہے تم دو سوٹ لے جاؤ، اماری بیٹی کے لیے۔"

"کیا واقعی وہ اتنا اچھا ہے۔"

"ہاں بہت اچھا ہے، حاجی نمازی بندہ ہے۔ اللہ نے جتنا بڑا کاروبار اسے دیا اتنا بڑا اس کا دل بھی ہے۔ صدقہ خیرات پہ بہت یقین رکھتا ہے۔ فقیروں اور مانگنے والوں کو کبھی خالی ہاتھ نہیں جانے دیتا، کہتا ہے ان کی بہت دعائیں لگتی ہیں۔ لیکن بے چارے کی صرف دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹا تھا، پولیو کا مریض بہت علاج کروایا مگر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ مگر صبر دیکھا ہے تو اس بندے کا، کہتا ہے ہمیں کوئی غم نہیں، کون سا اماری چیز تھا، اللہ کا چیز تھا، اللہ نے دیا، اللہ نے واپس لے لیا۔ بہت نیک انسان ہے۔"

"چلو شکر ہے اللہ کا، اس دنیا میں کچھ نیک لوگ بھی ہے۔ دنیا انہی اچھے لوگوں کی وجہ سے چل رہا ہے ورنہ کب کا تباہ ہو گیا ہوتا۔"

"تم آج بہت خوش لگ رہا ہے۔"

"ہاں، امارے پاس اب کافی رقم جمع ہو گیا ہے۔ رحیم اللہ سے بھی امارا کچھ لین دین تھا۔ اس نے وہ حساب بھی آج چکتا کر دیا۔ ہم تو سمجھا تھا وہ بھول گیا ہے، شکر ہے کہ وہ بھولا نہیں تھا۔ اب ہماری جیب میں رقم ہے تم بتاؤ تمہیں کچھ چاہیے۔"

"ہمیں نہیں..... کچھ نہیں..... دو وقت کا روٹی عزت سے مل جاتا ہے۔ شکر ہے اس کی ذات کا جو خالق بھی ہے اور رازق بھی۔"

"پھر بھی کچھ تو مانگو۔"

"وہ امارا اس گھر میں..... میرا مطلب ہے اس گھر میں رہنا بہت مشکل ہے اب اگر تمہارے پاس رقم ہے تو گھر بدل دو میرا مطلب ہے کوئی اور جگہ، کوئی مناسب جگہ پہ اگر ایک کمرہ مل جائے تو..... بہتر ہو گا۔"

"ہم بھی پہلی فرصت میں اس گھر سے جان چھڑوانا چاہتا ہے۔ مگر کیا کرے، اتنا اچھا نوکری پھر جانے کسی اور جگہ ملے یا نہیں، تم تھوڑا صبر کرو، تھوڑا سا اور رقم اکٹھی ہو جائے تو..... ہم یہ گھر، یہ علاقہ تو کیا یہ شہر ہی چھوڑ جائے گا۔"

"تو، کس شہر جائے گا؟"

"لاہور۔"

"لاہور؟"

"ہاں، وہاں رحیم اللہ کا ایک جاننے والا بندہ ہے، بس تھوڑا رقم جمع کرے گا۔ نکاح کرے گا اور یہ جگہ چھوڑ کر چلا جائے گا۔"

دوسرے دن خلیل اللہ اس کے لیے چوڑیاں، مہندی، سرمہ، عطر کی شیشی، خوشبو والا صابن اور بالیاں لے کر آیا۔ وہ بہت خوش تھی، کتنی ہی خوش جیسے کسی نے اس کے لیے قارون کا خزانہ کھول دیا ہو۔

"یہ سب امارے لیے۔"

"ہاں، تمہارے لیے۔"

"اور، یہ بالیاں، اسے سب سے اچھی بالیاں ہی لگی تھیں۔"

"یاد ہے تم نے ایک دفعہ مجھے بالیاں لانے کو کہا تھا۔" خلیل اللہ مرجان کو گہری نظر سے دیکھ رہا تھا، مرجان کا چہرہ خوشی سے لال ہو رہا تھا، آنکھوں میں اب بھی چمک تھی واہ کس قدر دلکش چمک جیسے رات کے آسمان پہ روشن تاروں کی چمک..... اچانک وہ ہڑبڑا کر باہر نکل گیا جیسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔

وہ تسلی سے نہا کر باہر نکلی۔ اپنے سیاہ لمبے بال وہ ٹوٹے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی کر رہی تھی۔ ہاتھ پہ نظر پڑتے ہی اس نے اپنی ہتھیلیوں

کو سامنے پھیلایا۔ کتنے دنوں بعد اس نے ہاتھ پہ مہندی لگائی تھی۔ جب اس کی ماں زندہ تھی تو ہر وقت اس کے بال سنوار کر رکھتی تھی کیا مجال تھی جو ایک بال بھی الٹا سیدھا ہو جائے، آنکھوں میں سرمے کے لمبے ڈورے..... غزالی آنکھوں پہ جیسے سرمئی بادل چھائے ہوئے اور اس پہ لمبی گھنی پلکیں سفید گلاب جیسا چہرہ گویا صبح کی دھوپ میں چمک رہا ہو اور اس پہ قیامت خیز وہ گلابی گال، بالکل ایسے ہی جیسے صبح کی پہلی کرنوں کی لالی گلاب کی پتیوں کو قدرت کے انمول شاہکار میں ڈھال رہی ہوں، گوری چٹی ہتھیلیوں پہ سرخ مہندی وہ یہ تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ تو ان ہتھیلیوں کی لکیروں سے الجھ رہی تھی۔ جانے لکھنے والے نے کیا لکھا تھا اور کتنے ہی غموں کی سیاہی انڈیلی تھی نصیب میں اس کے یا کہیں..... خوشی اور سکون کے پل دو پل..... انہی پل دو پل کو ڈھونڈنے کی وہ اٹک کوشش کر رہی تھی۔ آخر تھک ہار کر ہتھیلیاں بند کر لیں..... پھر سرمے پہ نظر پڑی تو سرمے دانی اٹھائی، تھوڑی دیر اسے دیکھا اور پھر آنکھوں میں ویسے ہی سرمہ لگا لیا، جیسے اس کی بہتری ماں لگاتی تھی۔ اور پھر عطر کی شیشی اٹھائی، اسے عطر کی شیشیاں بچپن سے ہی بہت پسند تھیں، کھلونوں میں اس نے جانے کتنی ہی جمع کر کے رکھی تھیں۔ شیشے کی رنگین، چھوٹی، چھوٹی، کوئی گول، کوئی صراحی کی طرح بنی، کوئی بیضوی، کوئی چکور اور ان کے اوپر بنے ہوئے وہ خوب صورت نقش و نگار، یہ شیشی بھی بہت خوب صورت بنی تھی، نیلے شیشے کی چھوٹی سی صراحی۔ عطر کی شیشی ہاتھ میں اٹھائی تو اسے عطر کی وہ شیشی یاد آ گئی۔ اس نے صرف اک سرسری سی نظر ہی دیکھا تھا اسے، مگر پھر بھی اسے اچھی طرح یاد تھی۔ وہ شیشی بھی بالکل ایسی ہی بنی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی نیلی صراحی۔

آہ، عطر کی شیشی..... وہ عطر کی شیشی جو وہ مر کر بھی نہیں بھول سکتی تھی۔ کیونکہ وہ بھی چکنا چور ہو گئی تھی۔ بالکل اس کے دل کی طرح..... اسے لگا یہ دل بھی عطر کی شیشی کی طرح ہی ہوتا ہے کانچ کا..... نازک سا اور محبت، گویا اس نازک کانچ کی شیشی میں بند خوشبو۔

"اے دل والو! تمہارے دل کی خیر ہو۔" اس کے دل سے بے اختیار دعا نکلی اور شفاف، چمکتے آنسو، اس کانچ کی شیشی پہ آ گرے۔

یہ عطر کی شیشی بھی کیا چیز ہے، ذرا سی غفلت، ذرا سی لاپروائی ہلکی سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے ٹوٹتے ہی خوشبو بھی بکھر جاتی ہے، یہی حال تو دل کا ہوتا ہے محبت میں بس ذرا سی غفلت اور..... جس طرح کانچ کے ٹکڑے جوڑ کر بھری خوشبو کو دوبارہ اس میں بند کرنا، ممکن نہیں..... ناممکن ہوتا ہے اتنا ہی ناممکن دل اور محبت کا معاملہ ہے۔ اگر ایک دفعہ دل ٹوٹ جائے تو..... پھر سب پہلے جیسا..... نہیں..... کبھی ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔

اس نے اک سرد آہ بھری، حسرت و ملال سے جیسے دل ہی کانپ گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے خوشبو کھولی اور اپنی کلائیوں اور بالوں پہ لگائی۔ الامان، دلاور خان اور خلیل اللہ کی پسند تو واقعی ایک ہی جیسی..... یہ خوشبو بھی بالکل ویسی ہی تھی۔ کس قدر دلفریب خوشبو تھی۔ یہ خوشبو..... تو اس پہ ایسے حاوی تھی جیسے پورے علاقے کی بدبو ہی ختم ہو گئی ہو۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو حیران رہ گئی، کتنی مختلف سی لگ رہی تھی وہ خود کو پہچان ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسے عائشہ کی مہندی والا دن یاد آ گیا اس دن بھی وہ اتنی ہی خوب صورت لگ رہی تھی۔ "شکر ہے اس پاک ذات کا۔" دماغ کو تھوڑا سا سکون ہوا، روح کو ذرا سی تسلی۔ آج اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے مردہ جسم میں پھر روح ڈال دی ہو۔ وہ واقعی خوش تھی، بہت خوش..... آج آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے محسوس کیا کہ وہ غموں اور تکلیفوں کو پیچھے چھوڑ آئی ہو۔

یوں تو ہر غم ہی تکلیف دہ ہوتا ہے مگر اپنوں کے دیے ہوئے غم تو ان کانٹوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں جتنا نکالنے کی کوشش کرو اتنا ہی اندر ہی اندر دھنستے جاتے ہیں اور انسان مرتے دم تک ان کی

اذیت میں مبتلا رہتا ہے..... مگر پھر بھی..... اس لمحے اسے ایسا لگا جیسے وہ سخت پتھریلے راستے سے گزر آئی ہو اور بالآخر اس کے پاؤں نے کسی نرم گھاس کو چھوا ہو..... وہ سرخ موتیوں سے بھری سنہری بالیوں کو اٹھانے کے لیے جھکی اور پھر انہیں اپنے کانوں میں سجالیا، اب اس کا حسن مکمل لگ رہا تھا۔ آئینے میں خود کو نظر بھر کر دیکھنے ہی لگی تھی کہ..... آئینے میں اپنے عقب میں اسے اس کا عکس بھی نظر آیا۔

''تم..... تم کب آئے؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

خلیل اللہ مسلسل ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑا ٹھٹک گئی۔

''آج تم جانتی ہو، تم کیسی لگ رہی ہو؟''

''کیسی؟''

''کبھی تم نے پورا چاند دیکھا ہے چودھویں کا۔''

''ہاں!''

''بالکل ویسی ہی..... خوب صورت، مکمل، روشن کہ پورے آسمان کو چھوڑ کر نظر بس اس پر ہی ٹھہر جاتی ہے۔''

''اب ہم اتنا بھی خوب صورت نہیں۔'' اس نے جان چھڑوانا چاہی۔

''ہیرے کو کب پتا ہوتا ہے کہ وہ قیمتی ہے یا پھول کو، کہ وہ خوشبودار اور خوب صورت..... یہ تو بس جوہری جانے یا بلبل۔''

''بس اب یہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔''

''زیادہ ہی تو ہے۔''

''بس، ہمیں اچھا نہیں لگ رہا، ہماری اتنی بھی تعریف مت کرو۔''

''تعریف تو اس خدا کی۔'' خلیل اللہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اسے نظر بھر کر دیکھا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ ''جس نے تمہیں بنایا۔''

''امارا ہاتھ چھوڑو۔''

''مرجان، تم تو پہلے ہی اس جگہ ایسے تھا جیسے جوہڑ میں، کنول کا پھول، آج تو تم پورا گلشن لگ رہا ہے۔''

''امارا ہاتھ چھوڑو۔'' مرجان اپنے ہاتھ پہ اس کی مضبوط ہوتی گرفت سے پریشان تھی۔

''چھوڑو۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی آہ، وہ کمزور تھی اور کس قدر کمزور۔ پتا نہیں اس کی خوشی کی وجہ اتنی کم کیوں تھی یا شاید اسے کوئی خوشی راس ہی نہیں آتی تھی، رات گزری..... اس پہ ایک اور قیامت گزر گئی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کتنی خوش تھی، خلیل اللہ نے اس کی خوشی پہ گھڑوں پانی ڈال دیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے بال سمیٹے کیے چوڑیوں کی آواز ایسے اس کے کانوں میں گونجی جیسے کوئی اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ آواز سے گھبرا کر جلدی سے اپنی کلائی سے چوڑیاں اتار دیں۔ پھر کان کی بالیاں بھی..... ایک کان زرا زخمی ہو گیا تھا۔ پھر اس کی نظریں ہاتھوں کی مہندی پہ پڑی تو اسے وہ رات یاد آ گئی جب پلوشہ چچی نے اس کے ہاتھوں پہ مہندی کو کچھ اور سرخ کر دیا تھا۔ وہ واقعی گھبرا گئی۔ اور رگڑ، رگڑ کر اپنے ہاتھوں سے مہندی اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر بے سود، اس نے سامنے خلیل اللہ کو آنکھوں سے دیکھا جس نے ایک نظر اسے دیکھ پھر آنکھیں چرالیں اور باہر چلا گیا۔

☆☆☆

''دو ڈھائی مہینے گزرے۔ اس کے دل میں خلیل اللہ کے لیے نہ وہ احساسات رہے نہ وہ جذبات..... نہ وہ عزت، نہ اعتبار، وہ بات ہی نہ رہی۔ بس ایک سرد لہر تھی..... جیسے فلک بوس پہاڑوں پہ پڑی سالا سال کی برف، بس خاموشی تھی، گہری خاموشی، اس کی عدت کے دن کب پورے ہوئے اس کو خبر نہیں، پہلے تو وہ انگلیوں پہ ایک، ایک دن گن رہی تھی۔ اب عدت پوری ہو نہ ہو، فرق بھی کیسے پڑتا تھا۔ ایک دن خلیل اللہ، دو چار بندے، رحیم اللہ کے ساتھ لے کر آیا، کچھ چھوارے، مٹھائی، گلاب کے پھولوں کے دو چار ہار، موتیے کے گجرے اور پھر مولوی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔''

''تم خوش ہے۔'' خلیل اللہ نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار، اتارتے ہوئے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم جواب کیوں نہیں دے رہا۔''

''کیا جواب دے، تم جواب جانتا ہے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

''اب یہ نکاح ہمیں وہ خوشی نہیں دے سکتا، جس پہ امارا حق تھا۔'' اس نے موتیے کے گجرے ہاتھوں سے اتارنے چاہے تو خلیل اللہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چھوڑا مارا ہاتھ۔''

''کیوں؟'' کیوں چھوڑے؟ اب تم امارا بیوی ہے، قانونی اور شرعی۔''

''تم نے امارا دل توڑا ہے خلیل اللہ، ہم تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا، امارا خدا بھی تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' اس رات کے بعد وہ آج روئی، پھوٹ، پھوٹ کر روئی۔

☆☆☆

گھر کے حالات کافی بہتر ہو گئے تھے، اب کافی پیسے جمع ہو گئے تھے۔ خلیل اللہ چاہتا تو کب کا یہ گھر اور علاقہ چھوڑ سکتا تھا۔ مگر اسے اور پیسے جمع کرنے کا خبط تھا۔ اس گھر سے تو وہ کبھی جان چھڑوانا چاہتا تھا مگر کچھ اچھی نوکری کے لالچ کی وجہ سے ڈھیٹ ہو کر بیٹھ گیا تھا اور کچھ اس قیمت میں اور گھر ملنا ممکن نہ تھا۔ دو، تین ماہ اسی طرح گزر گئے۔ مرجان کی تو خبر نہیں البتہ خلیل اللہ اسے پا کر بہت خوش تھا۔ روز اس کے لیے کوئی نہ کوئی چیز لے کر آتا، کبھی کھانے کے لیے ٹافیاں، جلیبی، مٹھائی، سنگھی، چرخہ اور پہننے کے لیے کبھی جوتے، کپڑے، چادر، پراندے، مرجان کے دل کا کیا حال تھا یا وہ جانتی تھی یا اس کا خدا۔

ایک دن مرجان کی طبیعت خراب ہو گئی، پیٹ کا درد، کمزوری، کمر کا درد گھر کے ٹوٹکے اور نسخے چلتے رہے۔ ایک دن تنگ آ کر خلیل اللہ کو قریبی سرکاری ہسپتال لے گیا۔ عجب حالت تھی، خلیل اللہ کو اس کی صحت کی سخت پریشانی تھی۔

''اللہ خیر کرے۔'' وہ ابھی دعا کر ہی رہا تھا کہ نرس نے خوشخبری سنا دی۔ ''پریشانی کی بات نہیں، آپ کا بیوی تو ماں بننے والا ہے۔ چار ماہ کا حمل ہے، بس ذرا کمزوری ہے۔ اس کی صحت کا خیال رکھیں۔''

''خلیل اللہ کو تو اپنے کانوں پہ یقین ہی نہیں آیا، کس قدر خوش تھا وہ، ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، ہم باپ بننے والا ہے۔ شکر ہے میرے اللہ کا۔'' وہ خوشی سے نہال تھا، مرجان کو گھر لے کر آیا۔ اب وہ اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا۔

''اب ہم جلد از جلد، یہ گھر چھوڑ دے گا۔ تمہارے اور اپنے بچے کے لیے کوئی بہتر گھر دیکھے گا۔ یہ جگہ امارے بچے کے لیے مناسب نہیں بالکل بھی مناسب نہیں۔''

ایک ڈیڑھ ماہ ایسے گزرا، خلیل اللہ کام کرتا اور وقت ملتے ہی کوئی، مناسب گھر ڈھونڈنے نکل جاتا۔ مرجان کا زیادہ وقت ارد گرد محلے کی عورتوں کے ساتھ گزر جاتا، جن کا اب خاصا آنا جانا شروع ہو گیا تھا، کوئی عورت اسے ناریل کھانے کا مشورہ دیتی، کوئی الائچی چبانے کا، اور کوئی سونف کا قہوہ پینے کا، ان سے بات کر کے اس کا وقت بھی اچھا گزر جاتا۔

اب زندگی میں کچھ سکون اور ٹھہراؤ آ گیا تھا وہ گھر کی صفائی کرتے ہوئے سوچ رہی تھی آخر کہیں تو اس طوفان نے رکنا ہی تھا۔ رات کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو گزر ہی جاتی ہے۔ شکر ہے صبح کا سورج دیکھنا نصیب ہوا اور وہ بھی اس قدر روشن اور خوب صورت۔'' وہ ماں بننے سے خوش تھی اور مطمئن بھی اب اسے اس دنیا میں اکیلا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی اپنا تھا جو اس کے قریب تھا بہت قریب وہ دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات کا شکر ادا کرنے لگی، بے شک اللہ کی ذات بہت مہربان اور رحیم ہے..... پہلے وہ اکثر سوچتی تھی، اتنی بڑی دنیا، اتنی زیادہ مخلوق، اللہ اسے اس دنیا کی بھیڑ میں پھینک کر بھول گیا ہے۔ اسے اپنی ہستی بہت چھوٹی، فضول اور معمولی سی لگتی، لگتا ہے امارا کوئی

اوقات نہیں، اسی لیے اماری دعا بھی سننے کا وقت نہیں، وہ دعا سنے تو پوری ہو..... اب وہ اپنی سوچ پہ شرمندہ ہو رہی تھی اور استغفار پڑھ رہی تھی..... ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مایوسی تو گناہ ہے۔ اللہ کی پناہ ہم نے تو ان جانے میں اتنا بڑا گناہ کر دیا۔ یا اللہ تو غفور و رحیم ہے۔ ہم پہ رحم فرما، تو التواب ہے میری توبہ قبول فرما۔ یا اللہ تو واقعی نوازنے والا ہے۔ تو نے اماری خالی گود اور دامن کو بھر دیا..... جو بھی تھا، ماں بننے کا احساس بہت خوب صورت اور خوشگوار تھا۔

☆☆☆

شام ڈھل گئی وہ خلیل اللہ کا انتظار کرتی رہی۔ آدھی رات آ گئی مگر، وہ نہ آیا۔ مرجان کی طبیعت پریشانی سے خراب ہونے لگی، نہیں جانتی تھی، کہاں جائے۔ کہاں ڈھونڈے، کس سے اس کے متعلق پوچھے۔ انتظار مشکل سے مشکل ترین ہوتا گیا۔ رات کے دو بجے، تین بجے، اللہ اس انتظار اور پریشانی میں کسی کو نہ ڈالے۔

خلیل اللہ تو ہمیشہ وقت پہ گھر آ جاتا تھا، کبھی ذرا سی بھی دیر نہیں لگائی، خاص طور پر جب سے اس نے باپ بننے کی خبر سنی تھی۔ کام ختم ہوتے ہی گھر کو بھاگتا تھا۔

"اللہ خیر کرے، یا اللہ اسے اپنے حفظ و ایمان میں رکھ۔" وہ دعا کرتی رہی اور دعا کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ فجر ہونے کے قریب تھی اسے آہٹ سنائی دی، تیز قدموں کی آواز..... شکر ہے، یہ خلیل اللہ تھا۔ مگر وہ بہت گھبرایا ہوا تھا..... بہت پریشان ماتھے پہ زخم کا نشان تھا، کچھ خون بھی بہہ رہا تھا، آنکھ پہ ہلکا سا نیل..... وہ اسے اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا؟ تم کہاں تھا؟"

"مرجان، جلدی کرو، ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔"

"مگر ہوا کیا؟"

"بعد میں پوچھ لینا۔" اس نے تیزی سے دروازے کے پیچھے لگی واسکٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکالا جس میں کچھ کاغذ اور جمع کیے ہوئے پیسے تھے۔ "چلو۔" اس نے مرجان کا ہاتھ پکڑا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"لاہور۔"

"کیا؟"

"اچھا سامان تو اٹھانے دو، یہ کپڑے، یہ برتن۔"

"بھاڑ میں جائیں یہ کپڑے، برتن اگر زندگی رہا تو اور بن جائیں گے۔"

"اچھا ہمیں چھوڑ تو۔" مرجان نے تیزی سے ایک ٹوٹے صندوق سے ایک چادر نکالی اس میں اپنے کچھ کپڑے، چیزیں اور ایک چھوٹی سی پوٹلی رکھی اور تیزی سے اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔ صبح 7 بجے یہاں سے ایک بڑی بس لاہور کے لیے جائے گی۔ ہمیں اس کے دو ٹکٹ لینے ہیں۔

"لاہور میں ہم کہاں جائیں گے؟"

"رحیم اللہ کے بتائے ہوئے پتے پر۔" وہ صبح 7 بجے بس پہ سوار ہو گئے۔ مرجان بس کو دیکھ کر حیران تھی۔ اس قدر خوب صورت، صاف ستھری، آرام دہ سیٹیں، اسے لگا جیسے یہ کوئی بس نہیں، چلتا پھرتا محل ہو، رحیم اللہ نے ٹکٹ کے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے لیا تھا، سوفٹ، سپاریاں، دو برگر، اور جوس۔ اس نے پہلے برگر کھول کر مرجان کو پکڑایا۔

"پہلے یہ کھاؤ، ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"یہ کیا ہے؟"

"بے وقوف، یہ برگر ہے۔ اب کھاؤ۔"

اور مرجان سر جھکا کر برگر کھانے لگی۔ مرجان نے خلیل اللہ کی طرف دیکھا۔ جس نے چھوٹا سا، رومال اپنے سر پہ باندھا ہوا تھا اور اوپر ٹیڑھی ٹوپی۔ کافی کے بعد وہ اب ذرا پرسکون لگ رہا تھا۔

"ہوا کیا تھا؟" مرجان نے برگر کھاتے اس نے پوچھا۔

"ہم تو سمجھا تھا صرف منزل خان کا بھائی، سالار خان ہی اماری پیچھے ہو گا، مگر.....

"مگر کیا؟"

"وہ تمہارے تایا کا بڑا لڑکا، دلاور خان، وہ تو پاگل کتے کی طرح ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"بتایا.....! اس نے اور اس کے بندوں نے گھر آتے ہوئے راستے میں دیکھ لیا اور پکڑ کر ایک پرانے کباڑ خانے میں بند کر دیا تھا ہمیں، وہ تو اماری قسمت اچھا تھا۔ ایک ٹوٹے ہوئے شیشے کا ٹکڑا ہاتھ آ گیا، بہت مشکل سے رسی کاٹ کر بھاگا وہاں سے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "وہ تو ہمیں دیکھتے ہی مار دیتا مگر وہ، تمہارا پتا جاننا چاہتا تھا۔ پہلے تو ہم اسے پہچان ہی نہ سکا، اللہ معاف کرے، اس قدر بدصورت شکل ہو گیا ہے اس کا۔"

"وہ کیسے؟"

"تم بھول گیا، تم نے اس کی ناک پہ پتھر مارا تھا۔"

"ہاں....."

"اس کا ناک اور جبڑے کا ہڈی ٹوٹ گیا۔ اب تو اس کا منہ بالکل ٹیڑھا ہو گیا ہے۔"

"کیا ہم نے اتنے زور سے مارا تھا؟"

"اس کا حالت اور مزاج اس قدر خراب تھا کہ پوچھو مت..... ہم نے دیکھا ہے اس کی آنکھوں میں، اس قدر غصہ اور نفرت کا آگ، کہہ رہا تھا بالکل نہیں چھوڑے گا تمہیں۔"

"اب کیا ہو گا؟" وہ شدید پریشان ہو گئی۔

"تم ڈر رہا ہے۔" اس نے مرجان کو انتہائی متفکر حالت میں دیکھ کر پوچھا۔

"اپنے لیے نہیں، اماری ساتھ جو بھی ہو، اپنے اس معصوم بچے کے لیے۔ جب سے ماں بننے کا خوشخبری ملا ہے۔ دل چاہتا ہے کچھ برا نہ ہو۔"

"تم فکر نہ کرو، تمہاری اور اپنے بچے کی ہر صورت حفاظت کرے گا، مارے ہوتے ہوئے کوئی تم دونوں کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا۔"

"آخر، یہ دلاور، یہ کیوں پیچھے پڑا ہے اماری، اسے کیا مسئلہ ہے اماری ساتھ؟"

"مسئلہ؟" اسے تو سارے مسئلے ہی تمہارے ساتھ ہیں..... تمہارے بھاگنے کی وجہ سے انہیں اچھا خاصا پیسہ بھرنا پڑا، زمین سے ہاتھ بھی دھونا پڑا۔ وہ کسی نے جرگے میں گواہی دے دیا تھا، تم قتل کے بعد ادھر ان ہی کے پاس تھا۔ ان پہ تمہیں چھپانے کا الزام لگ گیا تھا۔ دیت میں زرمینے کا نکاح بھی منزل خان کے بھائی سالار خان سے کرنا پڑا۔"

"کیا؟" مرجان نے یہ بات سن کر دونوں ہاتھ بے اختیار اپنے منہ پہ رکھ لیے۔

"یہ تو واقعی بہت برا ہوا، خدائے پاماں، وہ تو بالکل مناسب نہیں تھا زرمینے کے لیے۔"

"تم افسوس کر رہا ہے، تو منزل خان کون سا مناسب تھا تمہارے لیے۔"

سنا ہے تمہارے بھاگنے کے بعد جرگے نے سات دن کا مہلت دیا تھا انہیں یا تو تمہیں منزل خان کے ورثاء کے حوالے کریں یا زرمینے کا نکاح سالار خان سے..... ان دنوں میں انہوں نے تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈا۔ اماری قسمت اچھا تھا کہ وہ نوشہرہ والا ٹھکانا اسی رات چھوڑ دیا ورنہ..... تم اس وقت سالار خان کی بیوی ہوتا اور ہمیں یہ تمہیں بھگانے کے جرم میں گولی مار کر کھائی میں پھینک دیا ہوتا۔

"اماری وجہ سے زرمینے کے ساتھ بہت برا ہوا۔"

"تمہاری وجہ سے نہیں ہوا..... لالا گل خان اور اس کی بیوی نے جو بویا وہی کاٹا۔"

"ہائے، بے چاری زرمینے۔" یہ خبر سن کر وہ واقعی پریشان ہو گئی۔ کافی دیر یونہی خاموش بیٹھ رہی۔

"تم کیا سوچ رہا ہے، اتنی دیر سے۔"

"ہم، گلشن تائی کے بارے میں سوچ رہا ہے، آج ہمیں اندازہ ہوا انسان جتنا بھی عقل اور طاقت استعمال کر لے۔ کمزور اور بے بس ہی رہتا ہے۔ جتنا بھی بھاگے، بس ایک حد ہوتا ہے۔ اس حد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ تو اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے، انسان بے

چارا اپنی چال چلتا ہے اور..... قدرت اپنی ہی چال چل جاتا ہے۔"

"یہ بھی سچ ہے، مرجان برا کرنے والے کی ساتھ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو یہ دنیا گول ہے۔ سب کچھ گھوم کے منہ کے آگے آجاتا ہے۔"

"استغفار، استغفار پڑھنا چاہیے، انسان کو توبہ کرنی چاہیے، کبھی بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔ بعض دفعہ انسان اپنے ہی لفظوں کی پکڑ میں آجاتا ہے۔"

"ہم تو سوچ رہا ہے بے چاری تائی گلشن کا کیا حال ہو رہا ہوگا، اس کا مثال تو اس چڑیا جیسا ہے جس نے بڑی محنت سے مضبوط گھونسلا بنایا اور ہنی ٹوٹ گیا۔ اس نے ہم پہ رحم نہیں کیا تو قسمت نے اس پہ بھی رحم نہیں کیا۔ جو کچھ مارے ساتھ ہوا، اسے کچھ فرق نہیں پڑا مگر جو کچھ اس کی بیٹی کے ساتھ ہوا اس کے لیے وہ ضرور تڑپا ہوگا۔ ہمیں بھی زرمینے کا دکھ ہے..... پر امارا دکھ اس کے کس کام کا؟"

"سچ کہتا ہے۔"

"ویسے ..... دلاور خان کو پتا کیسے چلا کہ ہم تمہارے ساتھ ہے؟"

"تم بھی کمال کرتا ہے، ظاہر ہے ہم اتنا عرصہ واپس اپنے گھر، اپنے علاقے نہیں گیا، اور سب تمہیں بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اکیلے تو تم کہیں جا نہیں سکتا۔ شک پڑ گیا ہوگا۔ ویسے بھی جب چاند چڑھتا ہے تو دنیا دیکھتا ہے۔ یہ بات ویسے بھی زیادہ دن تو چھپ نہیں سکتا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو سب کو اندازہ ہونی جانا تھا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

"ہوا تو..... مگر کوئی بات نہیں، ان کا فرشتہ بھی نہیں جان سکتا کہ ہم اب کہاں ہے۔ لاہور میں تو وہ کبھی امارے پیچھے آ ہی نہیں سکتا۔"

"تم اس قدر مطمئن کیوں ہے؟"

"ہم جانتا ہے وہ ہمیں زیادہ پشاور میں ہی ڈھونڈ، ڈھونڈ کر خوار ہوگا کیونکہ اس کو خوش فہمی ہے کہ امارا، جاننے والا صرف پشاور میں ہے اور ہم پشاور سے آگے نہیں جا سکتا۔"

خلیل اللہ نے سیٹ کی بیک پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے یہ زندگی واقعی گھن چکر ہے کب کون، کس جگہ کھڑا ہوگا کوئی نہیں جان سکتا۔" اس نے ماتھے کے زخم کو چھوتے ہوئے کہا۔

"کبھی دلاور خان اور خلیل اللہ جگری یار تھے۔ سارا بچپن ساتھ گزارا، ساتھ کھیلے، ساتھ پڑھا، دونوں کا عادت بھی ایک جیسا تھا، پسند بھی ایک جیسا، جو گھوڑا مجھے پسند تھا اس نے وہی خریدا، ساتھ میں کھایا، ساتھ میں گھڑ سواری کی، جو چیز مجھے پسند آئی اسے بھی وہی اچھی لگتی، کمبخت کو لڑکی بھی وہی پسند آئی جو..... اس نے گہری سانس لی، کبھی ہم ایک دوسرے کے لیے جان دینے کے واسطے ہر وقت تیار رہتا تھا اور آج..... اس نے ماتھے کے زخم کو ہلکا سا دبایا تو جیسے آہ ہی نکل گئی۔" "کبھی سوچا نہیں تھا جان کا بیری ہو جائے گا، منزل خان کے بیٹے کے ساتھ اس کا منہ ماری بھی اماری وجہ سے ہی ہوا تھا۔ میلے میں اس کی جگہ پر اپنا گھوڑا باندھنے کا غلطی ہم نے کیا تھا، اس نے غصے میں امارا گریبان پکڑا اور دلاور خان کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ اس کی ناک تک تو زہر بھرا رہتا ہے۔ دلاور خان اور اس کا غصہ..... دونوں کو سنبھالنا کوئی آسان کام تو نہیں، ہاتھا پائی شروع کر دیا اور اس بے چارے کے سر پہ اتنی زور سے اینٹ مارا کہ وہ وہیں مر گیا۔

"اچھا، تو اس سارے فساد کی جڑ تم تھا۔"

"میں..... نہیں اس سارے فساد کی جڑ دلاور خان کا بیکار کا غصہ تھا سچ کہتے ہیں غصہ ایک شیطانی فعل ہے اور شیطانی فعل کا کبھی کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا۔ ہم نے تو اسے نہیں کہا تھا کہ زبردستی لڑائی میں کودے، جھگڑے کو بڑھائے، اینٹ مار کر اسے زخمی کرے اور حلق پہ پاؤں رکھ کر اس بے چارے کی جان لے لے۔ بچپن سے ہی بہت عجیب تھا یہ دلاور....." "اچھا ایک بات تو بتاؤ۔"

"کیا؟"

دلاور خان تم سے شادی کرنا چاہتا تھا ہم نے اس دن تمہارا اور اس کا ساری بات سن لیا تھا وہ ایسا ہی کچھ کہہ رہا تھا ناں....."

"پتا نہیں۔" وہ خلیل اللہ کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔

"اور..... تم۔"

"میں..... کیا؟"

"تم بھی..... کیا تم بھی پسند کرتا تھا اسے؟"

"نہیں....." مرجان نے برجستہ جواب تو دیا مگر اسے اپنے جواب پہ کچھ شک تھا۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ پلوشہ چچی کے ماں بننے کی خوشی میں لڈو لے کر بی جان کی طرف برآمدے میں جا رہی تھی اور دلاور خان نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔

"لڈو میٹھا ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں، مگر قسم سے تمہارا ہاتھ لگ جانے سے کچھ زیادہ ہی میٹھا ہو گیا ہے۔"

اب اسے سمجھ میں آیا اسے اس دن وہ انار کا درخت اور وہ دھوپ اور ہر چیز کیوں اتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پہ آتا پسینہ صاف کیا گویا بہانے سے اپنے چہرے پہ ابھرتی شکنوں کو چھپانا چاہتی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ خلیل اللہ اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اور اندازہ لگائے۔

"آہ! دلاور خان ..... اگر واقعی وہ..... اگر وہ اپنے تایا کی بہو بنتی تو آج وہ اپنے گھر میں ہی ہوتی..... شاید مورے بھی ہوتی، سب کتنا اچھا ہوتا، مگر ہائے نصیبا..... اس نے انگلیوں کی کانپتی پوروں سے اپنا ماتھا چھوتے ہوئے سوچا۔

"جب یہاں رل جانا لکھا تھا تو بے چاری مرجان کیسے؟" اتنا سوچ کر ہی اس کا دل بھر آیا۔ دل نے روتے ہوئے ہچکی لی جسے مرجان نے ہونٹوں پہ اپنا ہاتھ رکھ کر جیسے اندر ہی دبا دیا۔

مرجان اور خلیل اللہ لاہور رحیم اللہ کے بتائے ہوئے پتے پہ پہنچ آئے۔ ایک بہت عجیب سا علاقہ تھا۔ تنگ گلیاں، کچے پکے ایک دوسرے پہ چڑھے ہوئے مکان، گلیوں میں سیٹیاں بجاتے، غباروں سے کھیلتے، بھاگتے بچے، ریڑھی اور چھابے والے ہر گلی میں آواز لگاتے ہوئے۔ چھتوں پہ کچھ لوگ پتنگ اڑا رہے تھے۔ عورتیں شتر بے مہار کی طرح، بے فکر چلتی جاتیں، خوش گپیوں میں مصروف، قہقہے لگاتیں، مختلف چیزیں کھاتیں، ہاتھوں میں چوڑیاں، اونچی آوازیں۔ ایک نظر سے ہی لگ رہا تھا یہاں کا ماحول، طرز زندگی اور عورتیں ..... پشاور سے مختلف ہی تھا سب کچھ۔

خلیل اللہ نے دروازہ کھٹکھٹایا یہ کسی جاوید بھائی کا گھر تھا۔ رحیم اللہ کا کام کے سلسلے میں لاہور آنا جانا تھا جہاں اس کی جان پہچان ان لوگوں سے ہوئی۔ وہ تین چار دن اس گھر میں رہے۔ اس گھر کے لوگ ان پہلے والے لوگوں کی نسبت زیادہ مہمان نواز، ملنسار اور خوش مزاج تھے۔ جو خود کھاتے انہیں بھی خوش دلی سے پیش کرتے، بات، بات پہ مذاق کرتے۔ دل کھول کے ہنستے، یہ بھی تنگ دست اور غریب سے تھے۔ گھر تنگ تھے مگر دل کھلے تھے۔ یہ لوگ ذرا کھلے ماحول کے اور کم پردہ دار تھے، خلیل اللہ نے جلد ہی دو کمروں کا ایک گھر دیکھ لیا۔ جب وہ اس گھر سے رخصت ہوئے۔ تو گھر کی عورتوں نے اس کے ساتھ خلیل اللہ کو بھی خوشگوار انداز میں خدا حافظ کہا۔ وہ اس گھر سے آ تو گئی مگر..... کئی دن انہی خوش گوار یادوں میں محو رہی۔

☆☆☆

ایک تنگ سی گلی میں کچا پکا مکان..... دو چھوٹے چھوٹے کمرے جیسا بھی تھا اس پہلے والے گھر سے ہزار درجے بہتر تھا کم از کم نالے کی بدبو نہیں تھی مرجان کو بس اسی بات کی خوشی تھی۔

"کتنا کرایہ ہے؟"

"اتنا نہیں ہے مناسب قیمت پہ مل گیا ہے۔"

"پھر بھی۔"

"2000۔"

"ہر ماہ 2000 ساتھ میں بجلی اور گیس کا بل کا الگ خرچا....." وہ متفکر ہوگئی۔

"تم فکر نہ کرو، امارے پاس ابھی کافی رقم ہے، جلد ہی ہم یہاں کوئی کام دام بھی ڈھونڈ لے گا۔ تم بس اپنی صحت کا خیال رکھو۔"

گھر کے ایک کونے میں دو پرانی چارپائیاں، ٹوٹی ہوئی کرسیاں، ایک تین ٹانگوں والا ٹیبل اور کچھ الٹے سیدھے گملے پڑے تھے لگتا تھا جو پہلے والے کرائے دار تھے، اپنا فالتو سامان یہیں پھینک کر چلے گئے تھے۔ جوان کے لیے مال غنیمت سے کم نہ تھا۔ وہ اگلے تین چار دن میں گھر کا ضروری سامان اور بستر لے آیا اور پھر ایک دن لنڈا بازار سے پردے، چادریں اور کمبل وغیرہ اس نے انتہائی کفایت شعاری سے خریداری کی تھی اور مرجان نے بھی انتہائی نفاست سے گھر کو ترتیب دیا تھا۔ اس نے اور خلیل اللہ نے پہلے کرسیوں کی مرمت کی پھر ٹیبل کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ جوڑی۔ مرجان نے ہاتھوں سے کرسیوں کے کور بنائے۔ ٹیبل کا کور بنایا۔ پرانے رنگین کپڑوں کو کاٹ کر انتہائی محنت سے شیشے لگا کر کمرے بنائے۔ جن سے کمرے کی دیواریں کچھ بھلی معلوم ہونے لگیں۔ پھر مرجان نے گملے دروازے کے پاس سیدھے کر کے رکھے۔ خلیل اللہ کہیں سے کچھ پھولوں کے پودے توڑ کر لایا۔ جنہیں مرجان نے گملوں میں لگا دیا۔ پردے، پرانے تو تھے مگر بہت خوب صورت بیلوں والے۔ ان سے تو گھر کی رونق ہی بڑھ گئی تھی۔ دوسرے گملوں میں اس نے دھنیا، پودینہ، تلسی اور ٹماٹر بھی لے آیا۔ گھر کا ماحول تو بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ وہ دونوں خوش رہتے، ٹی وی دیکھتے، مل کر کھاتے پیتے، وقت گزارتے۔ سب کچھ اچھا تھا بس کام کا مسئلہ تھا۔ خلیل اللہ کو کوئی مناسب کام نہیں مل رہا تھا۔

جاوید بھائی نے ایک دو جگہ پہ لگوایا تو، مگر بات نہیں بنی، جمع پونجی بھی آہستہ، آہستہ ختم ہونے لگی۔ اب مرجان کی انتہائی، کفایت شعاری بھی کام نہیں آ رہی تھی۔ اگر اسی طرح خرچ ہوتا رہے تو، قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جائے۔ یہ رقم ہی کتنی تھی۔

ایک دن مرجان کی طبیعت خراب ہوئی تو ساتھ کی ہمسائی نے دائی اماں کا بتایا۔ جنہوں نے آ کر مالش والش کی اور کچھ ٹوٹکے بتائے۔ جان پہچان ہوئی تو وہ اکثر۔ اس کے پاس آ جاتیں۔ بہت ہی اچھے مزاج کی عورت تھیں، ویسے تو یہاں اکثر لوگ ہی خوش مزاج اور جلدی گھل مل جانے والے تھے۔ مگر پتا نہیں کیوں دائی اماں سے کچھ خاص لگاؤ ہو گیا۔ اگر کسی دن وہ نہ آتیں تو مرجان پریشان ہو جاتی۔

دائی اماں کے چار بیٹے تھے۔ چاروں شادی شدہ، بال بچے دار۔ کوئی بیٹی نہ تھی۔ بے چاری دائی اماں بھی بہوؤں کے رحم و کرم پہ تھیں۔ یہ اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنے میں ہی عافیت سمجھتی تھیں۔ ان کی بڑی دونوں بہوئیں تو ان کے سر کا عذاب تھیں، گھر کا سودا سلف لانا، بچوں کو سکول چھوڑنا، کھانا بنانا، بے چاری دائی اماں کے سر ہی ڈالا ہوا تھا۔ وہ جتنے وقت گھر میں ہوتیں۔ سر کام میں ہی ہوتا۔ غرض عمر اور صحت اتنی نہیں تھی جتنی کام اور ذمہ داریاں۔

"بہوئیں کب احساس کرتی ہیں اگر بیٹے نہ کریں۔" وہ اکثر کہتیں۔ "میں سوچتی ہوں کاش اللہ مجھے ان چار بیٹوں کی بجائے ایک بیٹی ہی دے دیتا، کم از کم میرا احساس تو کرتی۔ پھر استغفار پڑھتی ہوں، کہیں میں اللہ کی ناشکری تو نہیں کر جاتی شاید اسی وجہ سے پکڑ میں ہوں۔" وہ بیٹوں کی کوئی بات کرتیں، پھر خود پہ ناشکری کا الزام لگاتیں اور پھر خود ہی استغفار پڑھتی جاتیں۔

ادھر خلیل اللہ کے کسی کام میں پاؤں جم ہی نہیں رہے تھے۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اب تو مرجان کو بھی فکر ہونے لگی تھی۔ بچے کی پیدائش کا وقت نزدیک آ رہا تھا اور یہاں ہاتھ میں جو دو، چار پیسے تھے وہ بھی نکلتے جا رہے تھے۔

"آخر تم کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔"

"ڈھونڈ تو رہا ہے۔" خلیل اللہ نے تنگ آ

کر کہا۔

"ضروری تو نہیں ہے کسی دکان پہ ہی کام ملے تم کوئی اور کام دام کیوں نہیں دیکھتے۔"

"کوئی اور کام....."

"ہاں جب تک کام نہیں ملتا، کوئی مزدوری، وزدوری کر لو۔"

"اب ہم مزدوری کرے، تم کیا چاہتا ہے ہم اینٹیں اٹھائے، مٹی اٹھائے بوجھ اٹھائے۔"

"تو اس میں کیا قباحت ہے، کیا نبیوں، پیغمبروں نے نہیں محنت مزدوری کی حلال رزق کمانا تو اللہ کے نزدیک عبادت ہے چاہے وہ کتنے ہی معمولی اور چھوٹے کام سے کیوں نہ کمایا گیا ہو۔"

"بات یہ نہیں ہے۔ آخر اتنی محنت، خواری اور جان مارنے کے بعد بھی کچھ خاص اجرت نہ ملے تو کیا فائدہ۔"

"زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی کما کر لے آؤ۔ اللہ برکت ڈال دے گا۔"

"خلیل اللہ نے ایک تعمیر ہوتے مکان میں مزدوری ڈھونڈ لی۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ اینٹیں اور ریت اٹھانے کا کام کیا تھا۔ اس کا ایک فائدہ تو ہوا کچھ نہ کچھ پیسے گھر آ رہے تھے مگر خلیل اللہ شام کو اتنا تھک جاتا کہ کوئی اور ڈھنگ کا کام ڈھونڈنے کا نہ تو وقت ملتا اور نہ اس میں جگہ جگہ مارے مارے پھرنے کی ہمت بچتی۔ گھر میں اتنے ہی پیسے رہ گئے کہ مشکل سے دو وقت کی روٹی پوری ہوتی۔ اس نے بجلی کے بل دیئے اور کھانے پینے کا تھوڑا سا سامان لایا تو گھر کے کرائے کے لیے پیسے ہی نہیں بچے۔ مالک مکان گھر کے دروازے تک آ گیا۔ خلیل اللہ نے اسے اگلے مہینے کا کہہ کر ٹال تو دیا مگر دل ہی دل میں بہت پریشان تھا صبح سے شام تک اتنی زیادہ جان مارنے کے بعد بھی عزت کی زندگی گزارنا ناممکن لگ رہا تھا۔

خلیل اللہ کو اندازہ ہی نہیں تھا۔ یہ حالات کی چکی اسے کسی آسیب کی طرح چٹ جائے گی۔ اس تنگ دستی میں ایک، ایک دن کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ غربت و تنگ دستی بھی کیا بلا ہے۔ یہ تو وہ عذاب ہے جس میں کوئی دن مختلف اور خاص نہیں ہوتا۔ سارے دن ایک ہی جیسے بدرنگ..... بدمزا..... بیکار، جہاں پر چڑھنے والا دن، چڑھتی آزمائش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان غریبوں کے محلے میں..... نیا دن، گویا نئی مصیبت۔

"اٹھو خلیل اللہ۔"

"کیوں؟"

"کیوں، کیا مطلب ہے، ہمیں تم پہ حیرت ہوتا ہے۔ تم تو حافظ قرآن..... پانچ وقت کا نمازی تھا۔ یہ اب کیا ہو گیا ہے تمہیں..... نماز میں بھی ڈنڈی مار جاتا ہے۔ کوئی خوف خدا نہیں۔"

"کیا کرے، خوف دنیا نے خوف خدا بھلا دیا۔"

"اب تم کفر بھی بکنے لگا، کچھ ایمان کی فکر کرو۔"

"کس، کس کی فکر کرے۔" تمہاری..... آنے والے بچے کی..... گھر کے خرچے کی..... مالک مکان کے غصے کی یا اپنی بے روزگاری کی۔"

"اچھا، آج نماز پڑھ لو، جلدی کرو، وقت نکل جائے گا۔"

"کیوں، آج کیا خاص ہے؟"

"آج عید ہے..... تمہیں خبر نہیں.....!"

"واہ، کیا زبردست خبر ہے۔" خلیل اللہ نے بے زاری سے کہا اور منہ پہ دوبارہ چادر کر کے لیٹ گیا۔

"اٹھو، خلیل اللہ۔" مرجان نے دوبارہ چادر ہٹائی۔

"عید کا دن ہے، تم عید کی نماز نہیں پڑھے گا۔ سال بعد تو عید آتا ہے۔"

"تو ہم کیا کرے؟ ہمارے پاس کون سا نیا کپڑا ہے جو پہنے..... یا تمہارے باپ نے دنبہ بھیجا ہے جس کی اٹھ کر قربانی کرے، یا یہاں کوئی دوست یار ہے جسے گلے سے لگائے اگر دل پہ پتھر رکھ کر لیٹا ہی

ہے تو ہمیں تنگ مت کرو خدا کے لیے ہمیں اور اذیت مت دو۔'' مرجان آنسو پونچھتے وہاں سے چلی گئی۔

اف کیوں آئی تھی یہ عید...... غربت اور تنہائی کی اذیت کو اور بڑھانے کے لیے...... عید کا دن گزرا، یادوں، آنسوؤں، حسرتوں کا ایک پہاڑ سر ہوا۔ نہ کوئی آیا نہ کوئی گیا۔ خاموشی، بے زاری، بکرا عید تھی اور بیگن کا باسی سالن۔''

☆☆☆

ایک صبح مرجان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ خلیل اللہ بھی کام پہ جا چکا تھا۔ شکر ہے تھوڑی دیر بعد دائی اماں، خود ہی حال احوال، پوچھنے کی خاطر آ گئیں۔ مرجان کی طبیعت دیکھ کر، متفکر ہو گئیں۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت کی خرابی میں اور شدت آتی جاتی۔ اللہ، اللہ کر کے خلیل اللہ شام کو گھر آیا خلیل اللہ اسے کسی ہسپتال لے جاؤ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

''دائی اماں، گھر کی چار دیواری میں ہی کچھ کرلو، اماری جیب میں تو اتنا پیسہ نہیں ہے، ہسپتال کیسے لے جائے اسے۔ آخر تم، دائی اماں ہے۔''

''دیکھو مالش والش تو میں کر لیتی ہوں مگر یہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہوتا ہے۔ یہاں ہماری نظر میں کوئی ایسی قابل دائی بھی نہیں ہے۔ جس کے بھروسے اس بچی کو چھوڑ دوں۔''

''پھر بھی...... دائی اماں، کوئی تو عورت ہوگا۔''

''نہیں، کوئی نہیں ہے۔ ہاں، میں ایک لیڈی ڈاکٹر کو جانتی ہوں یہاں تھوڑا آگے ہی کلینک ہے اس کا۔ پانچ، چھ ہزار میں ڈلیوری کر دے گی۔''

''پانچ چھ ہزار، یہ تو امارے دو ماہ کا کرایہ ہے۔''

''تم یہاں پیسے کا حساب کتاب کرتے رہو ادھر تمہاری بیوی تکلیف سے مر رہی ہے۔''

''ہم تو سوچ رہا تھا، تم ہو اور کوئی۔ دائی وائی بلا لے گا، پانچ سو ہزار میں کام چل جائے گا۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں ہمت کر کے، کر تو لوں مگر پہلا بچہ ہے اور تمہاری بیوی بہت کمزور بھی ہے زندگی اور موت کا معاملہ ہے تم رسک نہ لو۔ یہاں ساری ہی عورتیں ہسپتال یا کلینک جاتی ہیں۔ یہ گھر دائی والا کام، کہاں رہ گیا۔ یہ تو پرانی بات ہو گئی۔ اگر تمہارے پاس، پیسے نہیں ہیں تو چلو ہم ادھر سرکاری ہسپتال ہے لے جاتے ہیں۔''

''سرکاری ہسپتال؟''

''ہاں، سوچ کیا رہے ہو؟ جلدی کرو۔''

ادھر بھی تو، آنے جانے کا کرایہ، ہسپتال کا خرچہ، دوائیوں کے پیسے، وہاں پر کون سا اللہ نام کا کام ہے۔''

''دوائیوں کا خرچہ تو ہے، وہ بعد میں دیکھا جائے گا، تمہارے پاس کرائے کے پیسے ہیں تو یہاں سے ٹیکسی لے آؤ۔ فی الحال اس بے چاری کو ہسپتال تو پہنچاؤ، چلو، جلدی کرو، کہیں یہ دیر زندگی بھر کا پچھتاوا نہ بن جائے۔'' وہ جلدی سے باہر نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں رکشا پکڑ لایا۔

''یہ کیا؟ رکشا؟'' میں نے تم سے ٹیکسی کا کہا تھا یہ تو بہت ہلکی سواری ہے بہت جھٹکے لگتے ہیں، اوپر سے ٹوٹی پھوٹی گلیاں، اس حالت میں تو بہت غیر مناسب ہے۔''

''وہ ٹیکسی والا، زیادہ مانگ رہا تھا، چلو تم کہتا ہے تو ہم ٹیکسی ہی لے آتا ہے۔''

''رہنے دو، اب یہی ٹھیک ہے، اتنا وقت نہیں امارے پاس...... بٹھاؤ اسے۔'' دائی اماں نے اسے گول برقعہ کروایا۔ ایک طرف سے خود پکڑا اور دوسری طرف سے خلیل اللہ نے، ہمت کرو بچے، ہمت کرو اللہ خیر کرے گا۔'' دائی اماں سارے راستے اسے تسلیاں دیتی رہیں۔ اللہ، اللہ کر کے ہسپتال آیا، دس، پندرہ منٹ مشکل سے چلنے کے بعد گائنی وارڈ کا دروازہ کھلا...... کس قدر تکلیف میں تھی بے چاری ایک، ایک قدم، ایک ایک من کا ہو رہا تھا۔ درد اور تکلیف سے آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے نکل رہے تھے، آخر وہ کتنی ہمت کرے۔ وہیں دروازے

میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''میں اندر جاتی ہوں۔'' دائی اماں اندر نرسوں سے بحث کرنے لگیں۔ پھر ڈاکٹر آ گئی، اچھی خاصی بدمزاج ڈاکٹر تھی۔ ایک نرس نے چوکیدار کو آواز دی۔

''اس اماں کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔'' چوکیدار، اماں کو پکڑ کر باہر گائنی وارڈ کے دروازے پہ لے آیا۔

''ہماری بات تو سنو، یہ بچی بہت تکلیف میں ہے۔''

''اگر زیادہ تکلیف ہے تو اسے فوراً کسی پرائیویٹ ہسپتال پہنچا دو۔'' اس نے بے زاری سے کہا۔

''او، بھائی ہم بہت غریب لوگ ہیں اگر پرائیوٹ علاج کرا سکتے تو اس خواری کی کیا ضرورت تھی۔'' دائی اماں نے منت کی۔

''کیا ہوا، اماں؟'' خلیل اللہ نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہے ہیں اندر داخلہ نہیں مل سکتا، کوئی کارڈ ہوتا ہے جو ہم نے نہیں بنوایا۔ اب وہ مریض نہیں دیکھیں گے کہتے ہیں کسی اور ہسپتال کیس کروا لو۔''

''ہم خود بات کرتا ہے ڈاکٹر سے۔'' مرجان کو دیکھ کر تو خلیل اللہ واقعی بہت گھبرا گیا۔ اس کے بھی ہاتھ پاؤں پریشانی سے پھولنے لگے۔

''تم اندر نہیں جا سکتے۔'' چوکیدار نے وارننگ دی۔

''دیکھو تمہارے سامنے کی بات ہے، اماری بیوی بہت تکلیف میں ہے، ہم اندر نہیں جا سکتا ٹھیک ہے۔ تم اسے ڈاکٹر کے پاس پہنچا دو یا کسی ڈاکٹر کو باہر بلا دو۔ ہم بہت مشکل میں ہے...... ساری زندگی تمہیں دعا دے گا۔''

''او پٹھان بھائی تم نے سنا نہیں یہاں شور مت کرو۔'' ایک موٹی تازی نرس سفید کوٹ پہنے جیب میں ہاتھ ڈالے بے نیازی سے چلتی آئی۔ جیسے ہسپتال کی ایم ایس وہی ہو۔ دیکھو بھائی، یہاں کہ کچھ رولز اینڈ ریگولیشن ہوتے ہیں۔ تم نے اس کا کارڈ کیوں نہیں بنوایا۔ اس کے بغیر انٹری نہیں مل سکتی۔''

''کارڈ؟ کارڈ تو ہمارے پاس ہے۔'' خلیل اللہ نے پریشانی میں جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا شناختی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کیا۔

''ایک تو یہ پٹھان، ہوتے ہی خر دماغ ہیں۔'' اس نے انتہائی بدمزاجی سے کہا۔

''یہ کارڈ نہیں، ہسپتال کا کارڈ...... جس میں ماہانہ چیک اپ ہوتا ہے۔''

''مرجان شدید درد سے چیخنے لگی۔''

''دیکھو بی بی؟ یہاں شور شرابا مت کرو۔ پتا نہیں...... پہلے سو رہے ہوتے ہیں۔ عین ٹائم پہ منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔'' وہ کسی حاکم کی طرح آرڈر دینے لگی۔ ''ابھی بڑے ڈاکٹر صاحب آ گئے تو بہت غصہ کریں گے۔''

''چھوڑو خلیل اللہ، وقت ضائع مت کرو، ہم اسے اسی لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں لے جاتے ہیں...... یہ نہیں مانیں گے، یہاں ان کے اصول اور قانون اہم ہیں کسی انسان کی عزت اور زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔'' دائی اماں کو بھی غصہ آ گیا۔

''یہاں کوئی جلسہ گاہ نہیں ہے، تقریر باہر جا کر کریں۔'' نرس نے منہ بنا کر کہا۔ اور اندر چلی گئی۔ مرجان درد سے دہری ہو گئی۔ سر وہیں ہسپتال کے فرش پہ رکھ دیا۔

''بہت تکلیف میں ہے اماری بیوی، اگر اسے کچھ ہوا، تو اس کا ذمہ دار تم ہی لوگ ہوگا۔'' غصے اور پریشانی سے خلیل اللہ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

''دھمکی کسے دے رہے ہو؟'' چوکیدار نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''چھوڑو اسے، ہم جا رہے ہیں۔'' دائی اماں نے چوکیدار کے ہاتھ سے اس کا گریبان چھڑوایا۔ ''تم دفع کرو انہیں، بہت بدتمیز، خود غرض اور کم ظرف ہیں یہ لوگ...... یہ نہیں سنیں گے۔'' دائی اماں نے مرجان کو سہارا دے کر اٹھایا۔

''جلدی کرو، ہم اسے اسی کلینک پہنچاتے ہیں،

میں اس لیڈی ڈاکٹر سے بات کر کے کچھ پیسے کم کروادوں گی، ہو سکتا ہے ادھار شدھار پہ بھی مان جائے۔"

مرجان تکلیف سے دہری ہو رہی تھی۔

"اف کس قدر، بداخلاق، بدتمیز لوگ ہیں، اس قدر ظالم ذرا انسانیت نہیں، ڈاکٹر تو مسیحا ہوتے ہیں مگر یہ سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹر، اللہ معاف کرے، قصائی..... مسیحائی تو مسیحا کرتے ہیں۔ یہ آج کل کے ڈاکٹر تو، کاروباری ہیں بس، کاروبار کرتے ہیں۔

"یہاں سے کوئی ٹیکسی پکڑو..... جلدی کرو۔"

"سامنے تو کوئی خالی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی، ہم ذرا آگے اسٹاپ پہ جا کر دیکھتا ہے۔" خلیل اللہ، پاگلوں کی طرح سڑک پہ بھاگنے لگا۔

"آہ، اوئی اماں..... یا اللہ میری مدد کر۔" مرجان شدید درد سے چیخی اور وہیں سڑک پہ گر گئی۔ دائی اماں کی بوڑھی ہڈیوں سے سنبھالنا ممکن نہ ہوا۔ آواز سن کر کئی لوگ سڑک پہ کھڑے ہو گئے۔

آنے والے کا وقت طے ہوتا ہے، بس وقت آ گیا مگر..... خلیل اللہ نہ آیا پتا نہیں کہاں رہ گیا۔

"جاؤ یہاں سے، یہاں پہ کوئی تماشا لگا ہے۔" دائی اماں رکنے والے لوگوں کو جب عجیب و غریب نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھتیں تو انہیں یہاں سے جانے کو کہتیں۔ "کچھ تو انسانیت کرو، آنکھ کا پردہ بھی تو کوئی چیز ہے، جاؤ یہاں سے۔" دائی اماں نے اپنے سر کی چادر اتار کر پردہ بنانے کی ناکام سی کوشش تو کی تھی۔ آخر کھلی سڑک کتنا پردہ بن سکتا تھا۔ خلیل اللہ ہانپتا کانپتا، بھیڑ میں پہنچا۔ جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ وہ ایک ایک رک کر دیکھنے والے کو دھکے دینے لگا۔

"دفع کروانہیں خلیل اللہ یہاں آؤ۔" دائی اماں نے چھوٹے سے معصوم بچے کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا اور ٹیکسی میں بٹھا کر انہیں گھر لے آئیں۔ گھر آتے ہی کچھ، جان میں جان آئی..... حواس بحال ہوئے مرجان کی حالت غیر تھی۔

"تمہارے پاس بچے کے کپڑے ہیں۔"

"ہاں بنائے ہیں۔" خلیل اللہ اندر سے کپڑے اور چیزیں لے آیا۔

"میں، مرجان اور بچے کو دیکھتی ہوں، تم ادھم کلینک سے لیڈی ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ ڈلیوری تو ہو چکی ہے۔ وہ زیادہ پیسے نہیں لے گی، ڈاکٹر آئی، اس نے مرجان کو دیکھا، چند دوائیاں لکھ دیں۔ کل ایک ہزار کا خرچا ہوا، جو خلیل اللہ کی جیب سے نکل ہی آیا۔"

"شکر ہے جیب پہ زیادہ بوجھ نہیں پڑا۔"

"شکر کیسا؟" وہ شدید نقاہت سے بولی۔

"آج جو ہمارے ساتھ ہوا، اللہ کسی جانور کو بھی ایسی ذلت نہ دکھائے۔"

"دکھ تو ہمیں بھی بہت ہے، مگر کیا کرے، جو ہو گیا وہ پلٹ تو نہیں سکتا۔"

"دکھ کیوں.....؟ تمہیں تو شرمندگی ہونا چاہیے، تم نے وعدہ کیا تھا، ہمارا خیال رکھو گے، ہمیں عزت دو گے، آج جو ہوا، ہمارے ساتھ..... کیا عزت رہ گیا ہمارا۔"

"خود کو اور تکلیف مت دو مرجان، بھول جاؤ، جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔ اس میں سارا قصور اس کا نہیں، پتا نہیں، یہ سرکاری ہسپتال، غریبوں کی سہولت کے لیے بنائے ہیں یا ان کی خواری کے لیے..... اوپر سے ہمارے یہ منافق حکمران..... خود ہم غریبوں کا خون چوس لیتے ہیں، صحیح کہتے تھے میرے ابو، یہ ہمارے حکمران نہیں، خون چوسنے والی جونکیں ہیں۔" دائی اماں دل کا غبار، اتارنے لگیں۔ "اوپر سے یہ مہنگائی، غریب بیچارا تو، بیمار ہو تو یہی سوچتا رہتا ہے زہر کھائے یا دوائی۔ اللہ بیڑہ غرق، خانہ خراب کرے ان ڈاکٹروں کا۔" نرسوں سے کہتی ہے، چوکیدار بلا کر باہر نکال دو انہیں، اب انٹری نہیں مل سکتی، اللہ توبہ، اللہ معافی، اتنی اکڑ اتنا غرور، خود کو ڈاکٹر نہیں خدا سمجھتے ہیں۔"

دائی اماں آج کی خواری کی وجہ سے سخت تکلیف میں تھیں۔ کوئی اور تو سننے والا تھا نہیں خود کو ہی سنا سنا کر دل ٹھنڈا کرنے لگیں۔ "کارڈ نہیں

بنوایا۔ ہاں ہم ہیں جاہل، ان پڑھ، ہمیں پتا نہیں تھا کارڈ بنوانے کا، مگر تم تو باہر تہذیب، پڑھے لکھے لوگ ہو۔ میں تو کہتی ہوں، ڈاکٹری بعد کی بات ہے پہلے انسان میں انسانیت ہونی چاہیے۔ خیر تم اس بے چارے کی طرف سے دل برا نہ کرو، یہ بھی بہت دکھی اور پریشان ہے۔ آج تو یہ بھی بہت خوار ہوا ہے، بہت بھاگا ہے..... بس یہی سوچ کر خود کو تسلی دو کہ جو لکھا تھا ویسے ہی ہو گیا۔ میں تو یہی کہوں گی آج جو کچھ ہوا تم دونوں اسے بھول جاؤ۔ دیکھو تو، اللہ نے کیسا چاند جیسا بیٹا دیا ہے۔ بس اللہ کے اس تحفے کے قدر کرو۔ اس کا شکر ادا کرو۔ ماشاء اللہ کس قدر خوب صورت چہرہ ہے اس بچے کا، بالکل فرشتوں جیسا..... اسے دیکھو تو سہی، تم دونوں ہر غم بھول جاؤ گے۔"

بی جان، بچہ مرجان کے پاس لٹا کر چلی گئیں۔ واقعی ہی، انہوں نے سچ کہا تھا، ننھا منا سا معصوم وجود..... چھوٹا سا وجود تھا مگر کس قدر بڑی تسکین ساری دنیا کی غم، تکلیفیں ایک طرف اور معصوم سی مسکراہٹ ایک طرف، اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑے پکڑے وہ سو گئی۔ کس قدر پرسکون نیند تھی۔ جیسے اسے ہر تکلیف اٹھانے کا صلہ مل گیا ہو اور صلہ بھی کس قدر خوب صورت، قیمتی، انمول وہ مطمئن تھی۔ گونواز نے والی ذات نے آج آسمانوں کے خزانے اس پر کھول دیے ہوں۔ آج وہ ذات اس پر مہربان ہو گئی ہو بہت مہربان..... یوں تو ماں بننے کی خوشی دنیا کی ہر ہی عورت کو ہوتی ہے۔ مگر مرجان کی خوشی کچھ خاص تھی کیونکہ، اس کی یہ واحد خوشی تھی۔

☆☆☆

خلیل اللہ بے چارا سخت محنت تو کر رہا تھا۔ جو بھی کام ملتا، دو پیسوں کی خاطر کر لیتا۔ ابھی تک اینٹیں، ریت اور سیمنٹ کی بوریاں اٹھانے کا کام کیا۔ ایک دن مزدوری نہیں ملی تو ایک دکان پہ صفائی ستھرائی کا کام تک کر لیا، اسے برا تو بہت محسوس ہوا، مگر مالک مکان کو وقت پہ کرایہ نہ دینے سے زیادہ برا ہو سکتا تھا۔

جاوید بھائی نے ایک دن اس کی حالت دیکھی تو بہت کوشش کر کے اسے ایک بڑی سبزی منڈی میں ایک بندے کے ساتھ کام پہ لگوا دیا۔ ٹرکوں سے سبزیوں، پھلوں کی پیٹیاں اور ٹوکریاں اتارنا..... شروع، شروع میں بس اتنا کام تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ایک مستقل ذریعہ آمدن مل گیا۔ وہ صبح سے شام سخت محنت کر کی اس لوڈنگ کے کام سے پانچ سو سے ہزار کی دیہاڑی لگا لیتا۔ اب مزدوری ڈھونڈنے کے لیے روز سڑکوں پہ مارا، مارا نہیں پھرنا پڑتا تھا۔ وہ روز صبح پانچ بجے اٹھتا اور سیدھا منڈی پہنچ جاتا۔ اب شام کو گھر وہ خالی ہاتھ نہ آتا، کچھ فروٹ اور سبزیاں بھی لے آتا۔ منڈی میں شام کو ویسے بھی ان کی قیمت کم ہو جاتی..... ننھے سے وجود کی برکت تھی۔ گھر میں واقعی ہی رزق اور برکت آ گئی تھی، کھانے پینے کی پریشانی بھی کم ہو گئی تھی۔ آخر خوشحالی نے اس گھر کا بھی رخ کیا، مرجان نے بھی بالآخر کچھ اچھے دنوں کا منہ دیکھا۔ گھر کا کرایہ اور بل ادا کرنے کے بعد بھی دو پیسے ہاتھ میں بچ جاتے۔ وہ کچھ پیسے مشکل حالات کے لیے جمع کرنے لگا۔ اسی دوران دوسری خوشخبری کی آمد متوقع ہوئی۔ ننھا عثمان، تو ابھی صرف پانچ ماہ کا تھا۔ مرجان تو نہیں چاہتی تھی مگر خلیل اللہ کو کون سمجھاتا۔

"یہ تو اللہ کی نعمت ہے..... قدر کرو ورنہ اللہ ناراض ہو جائے گا۔" یہ تو اللہ کا کام ہے، جس روح نے دنیا پہ آنا ہے، بس آنا ہے۔"

"ہاں، تم نہ صبر کرو، نہ احتیاط۔" مرجان کو شدید غصہ تھا۔ "اولاد صرف، پیدا ہی تو نہیں کرنا ہوتا، اسے پالنا بھی ہوتا ہے، کھانا پلانا بھی ہوتا ہے، تربیت کرنا ہوتا ہے، پڑھانا ہوتا ہے، یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ تم بتاؤ، تمہارے ہاتھ میں ہے کیا؟ اپنے کل کی خبر نہیں، ان بچوں کا مستقبل کا کیا ہو گا؟"

"دیکھو مرجان! اللہ کی ناشکری مت کرو، کفر مت کرو، یہ گناہ کبیرہ ہے۔ صرف اللہ پہ توکل کرو۔ ہماری کیا اوقات ہے کہ ہم ایک مرغی کے چوزے کو

بھی پالے۔ پالنے والی تو اللہ کی ذات ہے وہ پوری دنیا کی مخلوق کو پالتا ہے تو کیا ہمیں اور امارے بچوں کو بھول جائے گا۔ ہم بھی تو اسی کا مخلوق ہے۔''

''مگر اس کی ذات نے عقل اور سمجھ بھی تو دیا ہے کہ اپنی زندگی سمجھ داری سے گزارو۔ اپنی عقل استعمال کرو۔ اب کھوپڑی میں رنگ لگانے کے لیے تو نہیں دیا، مگر تم سے کون بحث کرے، کون سمجھائے تمہیں۔''

''دیکھو مرجان، ہم تو اتنا جانتا ہے یہ اللہ کا مخلوق ہے۔ اللہ کا نظام ہے، جیسے اس دنیا میں آتا ہے تو آتا ہے، اماری اتنی اوقات نہیں کہ اس کی ذات پہ سوال کرے نہ ہی اعتراض کر کے ہم اپنا ایمان کمزور کرنا چاہتا ہے۔''

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، کس قدر پختہ اور کامل ایمان ہے۔'' مرجان نے دونوں ہاتھ گال پہ رکھ کر کہا، تو خلیل اللہ نے بھی مونچھوں پر فخر سے ہاتھ پھیرا۔

''اس وقت تمہارا ایمان نالے کے پانی میں بہہ گیا تھا، جب نکاح سے پہلے تم نے ایسا حرکت کیا۔ اس وقت کہاں تھا تمہارا یہ پختہ ایمان، جب ایک بیوہ عورت، جس کا عدت بھی پورا نہیں ہوا تھا، تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا کہ اللہ سے ڈرو، یہ حرکت یہ گناہ نہ کرو، جس اللہ نے تمہیں دھڑا دھڑ اولاد پیدا کرنے کا حکم دیا ہے ہم بھی تو اسی اللہ کا فرمان پڑھ کر سنا رہا تھا کہ شرک اور زنا گناہ کبیرہ ہیں ان سے بچو، سخت سزا ہے مگر، اس رات تو تمہیں نہ اس کے احکام کا پروا تھا نہ سزا کا...... ویسے سات سلام ہے تم جیسوں کے ایمان کو، جب گناہ کرنے کا دل ہوتا ہے تو کسی، دو نمبر، بے وفا محبوبہ کی طرح اس کی ذات اور احکامات سے نظریں پھیر لیتا ہے۔ اور ویسے ایمان کا تمغہ سینے سے لگائے پھرتا رہتا ہے۔''

''بکواس بند کرو مرجان۔'' خلیل اللہ نے پہلی دفعہ اٹھ کر اس کی چٹیا پکڑ لی اور غصے میں اس قدر، زور سے کھینچی کہ وہ پیچھے کی طرف جھک گئی۔

''اب اگر تم نے اس رات کا ذکر کیا تو ہم تمہارا منہ توڑ دے گا۔ تمہاری زبان جلا دے گا۔ کمینہ، گندا عورت، گڑے مردے اکھاڑتا ہے۔'' اس نے نفرت سے جھٹکا دے کر اسے ایک طرف کیا اور تیزی سے اپنی کھیڑیاں پہنیں اور باہر نکل گیا۔

''تم صحیح کہتا ہے خلیل اللہ گڑے مردے اکھاڑنے سے تو صرف بدبو اٹھتا ہے۔ تمہارا، ایمان سے معطر دماغ کہاں اس بدبو کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس نے زمین پہ بیٹھتے ہوئے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے آنسو صاف کیے۔''

''ہم جانتا ہے تم نے امارے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا کیونکہ تم جانتا تھا کہ تم کچھ بھی سلوک ہم سے کرے، ہم تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا، جا ہی نہیں سکتا ہر راستہ جو بند ہو گیا تھا اس کمبخت مرجان پر...... یہ بھی تمہارا مہربانی کہ تم نے نکاح کر لیا، اگر وہ بھی نہ کرتا تو ہم تمہارا کیا بگاڑ سکتا تھا۔'' ہم بی جان، گلشن، لالا گل خان اور اس کم ظرف دلاور خان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تو...... تمہارا کیا بگاڑے گا۔'' وہ چیخ چیخ کر بین کرنے لگی، کوئی انسان کوئی اپنا کوئی ہمدرد نہ تھی، گھر کی خالی دیواریں اور فرش تو تھا لپٹ کر رونے کو اتنے میں معصوم بچہ بھی آواز سے گھبرا کر رونے لگا، اس نے اس کو اٹھایا اور باتھ روم لے گئی دھونے کے لیے۔''

سبزی منڈی میں خلیل اللہ کا کام چل نکلا تھا، گھر کا ماحول خاصا پرسکون ہو چکا تھا۔ وہ صبح کام پہ نکل جاتا، شام کو کچھ نہ کچھ لے کر گھر آتا اور پھر ننھے سے عثمان خان کے ساتھ کھیلتا، اس کے ننھے، ننھے ہاتھ پکڑ کر اسے چلنا سکھاتا۔ گود میں اٹھاتا، ماتھا چومتا، پیار کرتا۔

''اللہ اس دفعہ بھی ہمیں بیٹے سے نوازے گا، عثمان کا ایک اور بھائی آئے گا، ان شاء اللہ، اللہ ہمیں چار بیٹے دے گا۔'' اس نے مرجان کو خوش ہو کر مخاطب کیا۔

''ابوبکر، عمر، عثمان، علی...... اماری ایک ہی خواہش ہے۔ امارے چار بیٹے ہوں اور ہم خلفائے

راشدین کے نام پہ نام رکھے گا ان کا۔''

''اور اگر بیٹی ہوئی تو......؟'' مرجان نے کپڑوں کو تہ لگاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہاری منحوس زبان سے کبھی اچھا بات بھی نکلتا ہے۔ منحوس عورت۔'' مرجان بے چاری خود بھی اپنا اصلی نام جیسے بھول چکی تھی، منحوس، نحس عورت، کمینی، گھٹیا عورت، سست، نکمی عورت، یہی وہ عظیم، محبت بھرے القاب تھے جن سے اس کا شوہر اسے بلاتا تھا۔ کبھی محلے کی عورتیں اسے بلاتی تو اسے یاد آتا کہ اس کا نام تو مرجان بھی ہے۔

''کیوں؟ ہمارے نبی پاک کی بیٹیاں نہیں تھیں، بیٹیاں کیا اللہ کی مخلوق نہیں۔'' خلیل اللہ نے سوچتے، جھجکتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہم تو بیٹے کی ہی خواہش اور دعا کرتا ہے۔''

''خواہش سے کیا ہوتا ہے، ملتا تو وہ ہی ہے جو نصیب میں لکھا ہوتا ہو۔'' مرجان نے کہا اور چولہے پہ رکھی سبزی کو دیکھنے چلی گئی۔

☆☆☆

دائی اماں، اکثر آتی جاتیں، اب یہاں اس گھر میں انہیں رہتے ہوئے دس، گیارہ مہینے ہو گئے تھے۔ محلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ عید میلاد النبیؐ اور شب برات گزری، محلے کے اردگرد کے گھروں سے اس کے لیے بھی حلوہ، سویاں، مٹھائی، جلیبیاں آئیں، مرجان نے بھی میٹھے چاول بنائے تھے، جو بھی برتن آتا، خالی نہ جانے دیتی۔ آہ، رشتہ دار تو کوئی نہ تھا، محلے کے ہی اردگرد کے لوگوں سے جان پہچان بنا کر کسی کو خالہ، کسی کو بہن اور دائی اماں کو ماں بنا لیا۔

اب وہ محلے کی کافی عورتوں کو جاننے لگی تھی، زبیدہ خالہ، راشدہ، نسرین، برکت خالہ، رضوانہ، حمیدہ، کوئی مزدور کی بیوی تھی تو کسی کا شوہر مستری تھا کسی کا باپ کسی فیکٹری کا ملازم...... اس محلے میں تو دو تین، تین چار چار مرلے کے گھر میں رہنے والے، ان جیسے ہی غریب، سفید پوش لوگ تھے۔ مرجان کی سب سے اچھی سلام دعا ناہید سے تھی جو کہ اس کے بالکل ہمسائے میں رہتی تھی۔ ناہید پانچ بچوں کی ماں کوئی بائیس تئیس سالہ لڑکی تھی، اس کی شادی بھی مرجان کی طرح انتہائی کمسنی میں ہوئی تھی مرجان سے چھ، سات سال بڑی تھی، مگر مرجان کی ہم مزاج، ہر کسی کو اہمیت دینا، ہر کسی کی بات سننا، اخلاق اور خندہ پیشانی سے دوسروں کو ملنا۔ اس کا شوہر پرچون فروش تھا۔ گھر کا گزارا مشکل سے ہی ہوتا تھا، ظاہر ہے ایک کرائے کی دکان اس پہ بیوی اور پانچ بچوں کا بوجھ، بوڑھے ماں باپ کی الگ ذمہ داری اور ایک معذور بہن، خواہ مخواہ کا خرچہ؟ دیوار سے دیوار جڑی تھی۔ گھر کی تنگ دستی نے گھر کے ماحول کو بھی تنگ کیا ہوا تھا، اکثر لڑائی جھگڑے اور گالی گلوچ کی آوازیں آتیں۔ گھر میں خاصی بدسکونی تھی۔ مرجان اور اس کی اکثر بات اور لین دین دونوں گھر کے درمیان بنی دیوار سے ہی ہو جاتا تھا۔ اکثر پانی بھرتے، دیوار پہ کپڑے پھیلاتے ان کی آپس میں بات چیت ہوتی رہتی۔ وہ گھر کا کام کرتی، عثمان کو سنبھالتی، محلے کی عورتوں اور ناہید سے بھی بات چیت ہو جاتی اور شام کو خلیل اللہ کے لیے کھانا بناتی۔

زندگی گزر رہی تھی کاش! ایسے ہی گزر جاتی مگر انسان کو تھوڑا ہی پتا ہوتا ہے کہ آنے والے وقت کے ساتھ اور کتنے امتحان، کتنی آزمائشیں منتظر ہیں۔ شاید وہ بھی اسی خوش فہمی میں تھی کہ اس کی باقی کی زندگی یونہی گزر جائے گی۔ اس لیے اسے بھی یہی لگا کہ اب زندگی کی سخت مشکلیں اور آزمائشیں گزر چکی ہیں، اس نے دانستہ غیر دانستہ طور پہ دماغ میں یہ تصور کر لیا تھا کہ ایسے ہی عثمان اور اس کے باقی بچے بڑے ہوں گے اور انہیں پالتے۔ پالتے وہ بوڑھی ہو جائے گی اور جیسی ساری مائیں بڑھاپا گزارتی ہیں وہ بھی اپنا بڑھاپا گزارے گی اور پھر...... اس کی طرف سے بلاوا آتے ہی ایک پرسکون اور باعزت موت کی آغوش میں سر رکھ دے گی۔ کاش! کاتب تقدیر نے کچھ ایسا ہی لکھا

ہوتا۔

☆☆☆

''اب ہم ٹرکوں سے بوجھ اتارنے کا کام نہیں کرے گا۔''

''تو......اور کیا کرتا ہے۔''

''ہم ادھر چوک میں سبزی کا کھوکھا خریدے گا۔ اب اپنی سبزی بیچے گا۔ جتنا ہم دو ہفتے میں کماتا ہے دو دنوں میں کمالے گا۔''

''کھوکھا کہاں سے خریدے گا......؟''

''امارے پاس پیسے ہیں تیس ہزار روپے۔''

''یہی تو امارا کل سرمایہ ہے تم اسے ایسے مت لگاؤ، سنبھال کر رکھو، ورنہ مشکل وقت میں کیا کرے گا۔ ہم تو کہتا ہے فی الحال جیسا نظام چل رہا ہے چلنے دو، زیادہ کی لالچ مت کرو، اگر بالکل خالی ہاتھ ہو گیا تو کیا کرے گا۔''

''ہم بھی تو مشکل وقت کے لیے ہی ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، اماری کمر بوجھ اٹھا اٹھا کر ٹیڑھی ہو گئی ہے اب اور نہیں ہوتا ہم سے یہ کام......اب ہم اپنا کوئی کام کرنا چاہتا ہے اس میں سکون بھی ہے اور عزت بھی۔ ان شاء اللہ اپنا کاروبار کرے گا۔'' اس نے بڑے بااعتماد طریقے سے ٹھوڑی پہ ہاتھ پھیرا۔

''سبزی کے کھوکھے کا پگڑی پچاس ہزار ہے، امارے پاس مر کے یہ تیس ہزار ہوا ہے۔ تمہارے پاس کچھ رقم پیسہ ہے؟''

''امارے پاس کہاں سے آیا؟'' مرجان نے غصے سے کہا۔

''اچھا، اچھا، امارے گلے کیوں پڑتا ہے ام نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔''

''ایسے ہی کیوں پوچھا، کبھی تم ایک روپیہ، ایک ٹکا بھی امارے ہاتھ پہ رکھا نہیں ناں......ہم نے ادھر گملوں میں پودوں کی جگہ پیسہ تو نہیں اگایا کہ توڑ کے دے دے تمہیں۔''

''امارا، ادھر منڈی میں لوگوں سے کچھ جان پہچان ہوا ہے۔ ایک دو بندوں سے ادھار کا بات تو کیا ہے، دیکھو......ہوسکتا ہے مل جائے۔''

''ادھار اور سود میں کبھی برکت نہیں ہوتا۔''

''تم جیسا منحوس عورت زندگی میں آجائے تو ویسے ہی برکت نہیں رہتا۔'' خلیل اللہ کی عادت سخت تو ہوتی جا رہی تھی مگر......اس کا یہ زہریلا لہجہ......اب صبح شام مرجان کا کلیجہ کاٹنے لگا تھا۔

☆☆☆

خلیل اللہ فطرتاً ہی ایسا تھا جو چیز دماغ میں گھس جائے تو بس۔ اس نے بیس ہزار کا قرضہ لے لیا اور اپنی کل جمع پونجی بھی اس کھوکھے میں پھونک دی۔ جتنا یہ کام دیکھنے میں آسان لگتا تھا۔ سر پڑنے پر اتنا ہی مشکل ہو گیا۔ روز صبح منڈی سے سبزی کی بولی سے سبزی لینا ہی ایک بڑا امتحان تھا۔ اس قدر بھیڑ، دھکم پیل افراتفری اور پھر وقت ضائع کیے بغیر کسی چھوٹی موٹی گاڑی کا بندوبست کر کے سبزی کو چوک میں کھوکھے تک لے کر آنا۔ پھر کھوکھے کی صفائی ستھرائی، سبزی کو دھو کر لگانا اور پھر سارا دن چیخ چیخ کر سبزی بیچنا اور گاہکوں سے مغز کھپائی الگ......یا اللہ اس سے تو وہ ٹرکوں سے بوجھ ڈھونے کا کام ہی اچھا تھا۔'' شام کو تھکا ہارا، وہ گھر لوٹتے ہوئے سوچ رہا تھا پیسوں میں کچھ بچت تو ہے مگر کیا فائدہ...... جب تک قرضہ نہیں اترتا اس تھوڑی بہت بچت کا فائدہ ہی کیا۔ وہ کچھ مایوس ہو گیا تھا۔ اب وقت کے ساتھ ہی اپنے کاروبار میں تجربہ ہوگا اور فائدہ بھی......ابھی تو سخت محنت بھی بیکار لگ رہی تھی۔ وہ کچھ مایوس ہو گیا تھا مگر اللہ بھلا کرے۔ اس مرجان کا۔ جو اسے مایوسی کے اندھیرے سے بار، بار پکڑ کر واپس لاتی تھی۔ خالی باتوں سے ہی مگر حوصلہ تو دیتی تھی۔

اللہ رحم کرے گا......اللہ کرم کرے گا......محنت تو نبیوں کی سنت ہے۔ اللہ بھی محنت کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ کوئی بات نہیں قرض بھی اتر جائے گا۔ مایوس نہ ہو اللہ پہ بھروسہ رکھو......یہی جملے تھے جو اس کے کمزور ہوتے ایمان اور ناشکری کو کچا پکا سہارا دیے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ایک دن جاوید بھائی نے خلیل اللہ کو خاص بلوا بھیجا۔

''اتنا کیا ضروری کام پڑ گیا کہ فوراً آنے کو کہا۔'' مرجان نے متفکر ہو کر پوچھا۔

''وہ بتا رہا تھا، شاید پشاور سے کوئی پیغام آیا ہے۔''

''پشاور سے؟''

''ہاں وہ رحیم کی طرف سے کوئی خبر۔''

''اللہ کرے کوئی خیر کی خبر ہو۔''

''خیر کی خبر اور ہم......'' خلیل اللہ نے طنزیہ اس کی طرف دیکھا اور کھیڑیاں پہن کر باہر نکل گیا۔

کافی دیر وہ انتظار کرتی رہی مگر وہ گھر نہ لوٹا۔ شام ہوئی، مرجان کو پریشانی ہونے لگی۔ ابھی اسی فکر میں بیٹھی تھی کہ وہ صافہ کندھے پہ رکھے۔ تھکے ہارے قدموں کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ اس کی عجب حالت دیکھ کر مرجان کی فکر بڑھ گئی۔

''سب ٹھیک تو ہے ناں خلیل اللہ؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس وہیں صحن میں بچھی چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

''کچھ تو بتاؤ ہمیں، بہت پریشانی ہو رہی ہے، کیا ہوا؟ کیا بتایا جاوید بھائی نے؟ اتنا، اتنا پریشان کیوں ہے؟ خلیل اللہ تم کچھ بولتا کیوں نہیں۔ خیر کی خبر تو ہے ناں......'' جتنی اس کی خاموشی طویل ہو رہی تھی مرجان کی پریشانی اتنی ہی بڑھ رہی تھی۔

''خیر کی خبر۔'' خلیل اللہ بڑبڑایا اور بے اختیار رونے لگا۔ اس قدر رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ مرجان نے پہلی دفعہ اسے ایسے روتے دیکھا تھا۔ وہ تو بالکل بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

''اماری......اماری مورے......اماری ماں۔''

''کون؟ بسم اللہ جان؟''

''ہاں؟'' خلیل اللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ اس دنیا میں نہیں رہیں۔''

''کیا؟'' مرجان تو وہیں سکتے میں آ گئی۔

''یا اللہ یہ کیا ہو گیا۔'' مرجان نے دونوں ہاتھوں اپنے گالوں پہ رکھ لیے۔

''کب؟''

''دو دن پہلے۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟''

وہ میرے چچا کے بیٹے نے رحیم اللہ کو خبر بھجوائی۔ دیکھو تو، ام کتنا بدنصیب ہے۔ اپنی ماں کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا اس کے جنازے کو کندھا بھی......وہ پھر بین کر کر کے رونے لگا۔ اماری ماں، کتنا حسرت تھا اسے اماری شادی کا کہتا تھا تمہیں اپنے ہاتھوں سے سہرا بنا کر باندھے گا۔ خلیل اللہ، ہم تو بس اپنے پوتے پوتیوں کی خوشیاں دیکھنے کی آس میں زندہ ہے۔ اپنے پوتے عثمان کو دیکھ بھی نہ سکا۔ اپنی حسرت اپنے دل میں ہی لے کر مر گیا، اماری مورے۔

''صبر کرو خلیل اللہ، جو اللہ کی مرضی، اللہ......اللہ تمہیں صبر دے۔'' مرجان بھی رو، رو کے ہلکان ہو رہی تھی۔ زمانے کی دھوپ جلا دیتی ہے اگر سر پہ ماں باپ کا سایہ نہ ہو۔ مرجان سے بہتر یہ بات کون جان سکتا تھا۔ سکون کے لیے تو صرف ماں کی دعا ہی کافی ہوتی ہے۔ اللہ کسی کو ماں کا غم نہ دکھائے۔''

''پانی پیو خلیل اللہ۔''

''دفع ہو جاؤ، تم یہاں سے۔'' خلیل اللہ نے اس قدر، زور سے پانی کے کٹورے کو تھپڑ مارا کہ مرجان ساری کانپ گئی۔ پانی کے چھینٹے مرجان کے منہ پہ پڑے اور کٹورا بھی ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

''منحوس عورت، جب سے زندگی میں آیا ہے، زندگی کا سکون چلا گیا اور آج اماری مورے بھی چلا گیا، کمینی، رذیل عورت اپنی شکل مت دکھانا مجھے، گم کرو اپنی یہ نحس صورت، چلی جاؤ یہاں سے......''

اور وہ بے چاری روتی کانپتی کمرے میں آ گئی۔ دہرا غم لے کر یہ غم تو جیسے اس کے نکاح ہی میں بندھ گئے تھے، لگتا تھا جان لے کر ہی جان چھوڑیں گے۔ وہ اندر چارپائی پہ گر گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

دو دن یونہی گزر گئی۔ اس نے خلیل اللہ سے کوئی

بات نہیں کی، اس لیے نہیں کہ وہ اس سے خفا تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ اب اس کی مزید خفگی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کیا کرتی، دل غم سہہ، سہ کر تھک سا گیا تھا۔

''یہاں آؤ۔'' خلیل اللہ نے اس کی لٹکی صورت دیکھی تو، اسے اپنے پاس بلا لیا۔

''خفا ہو مجھ سے۔''

''نہیں۔''

''تو، کوئی بات کیوں نہیں کرتی۔''

''ڈرتی ہوں۔''

''کس سے؟''

''خوامخواہ، تمہیں کچھ برا نہ لگ جائے۔'' وہ اس کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

''ہم تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔''

''کیا؟''

''وہ اس دن..... ہم نے تمہیں بلاوجہ ہی.....''

''کوئی بات نہیں۔''

''پھر بھی یوں گالی نہیں دینی چاہیے تھی۔''

''ہم بھی، تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔''

''کیا؟''

''ہمیں تمہاری ماں کا بہت دکھ ہے۔ بسمہ اللہ جان، بہت اچھا عورت تھا۔ کاش! کاش کہ وہ زندہ ہوتا اور ہمارے پاس ہوتا۔ جب ہم نے سڑک پہ اس کے پوتے کو جنم دیا، تب، اس دن وہ ہمیں بہت یاد آیا تھا، اگر وہ ہوتا تو ہمیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیتا۔'' اس کی ہچکی بندھ گئی۔ خلیل اللہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس نے بھی اپنا سر خلیل اللہ کے کندھے پر ٹیک دیا۔

''اللہ کسی کو ماں کا غم نہ دیکھائے۔'' اس نے ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کیے۔

''ہم سمجھا تم ہماری گالی کی وجہ سے خفا ہے اس لیے بات نہیں کر رہا۔''

''نہیں، ہمارا اللہ جانتا ہے، ہم اس دن کے لیے، تم سے بالکل خفا نہیں ہے۔ ہمارا یقین کرو خلیل اللہ، ماں کی خبر سن کر تم جتنا دکھی ہے اور.....'' وہ خاموش ہو گی۔

''اور..... کیا؟''

''اگر ہمیں برا بھلا کہنے سے، گالی دینے سے تمہارا دکھ اور تکلیف کم ہوتا ہے تو مرجان کو یہ گالیاں مہنگی نہیں، ہمیں اور گالی دو۔ خلیل اللہ اگر اس سے تمہیں سکون ملتا ہے تو، ہماری جان بھی لے لو، یہ بیکار جان کسی کے تو کام آئے۔ ہم تمہیں اپنی جان بھی بخشتا ہے خلیل اللہ۔'' اس نے رو، رو کر آنسوؤں سے اس کا کندھا گیلا کر دیا، خلیل اللہ بھی دل برداشتہ ہو کر رو پڑا آہ، کس قدر منحوس تھا وہ دن، ان کے تو گھر پہ قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ کاش، کاش کہ دن کبھی نہ آتا، مگر آتا ہوا برا وقت..... آندھی، طوفان، سیلاب، کون روک سکا ہے اسے جو، یہ بے چاری روک لیتے۔

خلیل اللہ ایک دن کھوکھے پہ معمول کا کام کر رہا تھا، بڑے انہماک سے سبزی چھٹے پہ سجا، سجا کر رکھ رہا تھا۔ خوش تھا آج منڈی سے کافی مناسب قیمت میں سبزی مل گئی تھی، ابھی اپنی ہی خوشی میں مگن تھا کہ..... کرین آ گئے..... پولیس تھی، دکاندار، اردگرد کے کھوکھوں کے مالکان پاگلوں کی طرح اپنی چیزیں سمیٹنے لگے۔ دو ہاتھوں سے جو بچا سکتے تھے، بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کرین، چیزوں، پتھاروں، شیڈوں اور کھوکھوں کو گرانی اسے ایسی لگ رہی تھی، جیسے کوئی بڑی بلا یا موٹا تازہ بدمست ہاتھی، جو گھاس کو روندتے، روندتے اس کے سر پہ آ گیا تھا۔ پولیس ڈنڈے برسا رہی تھی۔ لوگ بھاگ رہے تھے، بس، شور ہی شور تھا، وہ بھی شدید گھبراہٹ میں سامان سمیٹنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ یہ سی ڈی اے..... ایل ڈی اے..... کیا بلا تھی، کچھ قانونی، غیر قانونی اسے کیا خبر تھی..... خبر ہوتی تو اپنا کل اثاثہ اس طرح کیوں آگ میں جھونکتا۔ ذرا سی غلط فہمی نے تو اس کی ساری خوش فہمیاں ہی ختم کر دیں۔ کوئی تجاوزات کے خلاف آپریشن تھا۔

بے چارے خلیل اللہ کو جان بوجھ کر وہ کھوکھا بیچ دیا گیا تھا، جو تجاوزات کی زمین پہ بنا تھا اور ویسے ہی ایل ڈی اے نے کچھ دنوں میں آپریشن کر کے گرا دینا تھا، ذرا سی بیوقوفی اور لالچ میں اس کے ساتھ بڑا ہاتھ ہو گیا

تھا۔ اس قدر بڑا دھوکا..... غم اور غصے سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غربت سے بڑا نہ کوئی عذاب..... نہ کوئی امتحان..... اس نے سنا تو تھا کہ غریب پہ زمین تنگ ہو جاتی ہے، آج دیکھ بھی لیا..... غریب کے لیے تو اللہ کی اتنی بڑی زمین میں کہیں کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی۔ تین چار فٹ کا چھوٹا سا سبزی کا کھوکھا ہی تو تھا..... کیسے بے چاری کے رزق در روزگار کو دو سیکنڈ میں تہس نہس کر دیا تھا صرف یہی تو نہیں، اس کے خواب..... اس کے ارمان، دو پیسے کمانے کا جو وسیلہ تھا آنکھوں کے سامنے زمین بوس ہو گیا۔ بڑے، بڑے مافیا، قبضہ گروپ بڑے، بڑے پہ شریف چور، ڈاکو..... ان کو کہاں نظر آتے ہیں۔ ہر کوئی بس غریب کے پیٹ پہ لات مارنے کو تیار کھڑا ہے۔ اس کے ساتھ جانے اور کتنے ہی غریب بے روزگار ہو گئے۔

☆☆☆

آج وہ شام سے پہلے ہی گھر آیا تو اس کے جلدی آنے پہ مرجان پہلے حیران ہوئی پھر اس کی حالت دیکھ کر شدید پریشان ہو گئی..... چیزیں بچاتے بازو زخمی ہو گیا مگر..... پاؤں کا زخم زیادہ شدید اور گہرا تھا۔ اف خدایا..... خلیل اللہ کی حالت تو بہت ابتر تھی۔

آنے والے دنوں میں گھر کے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

قرضہ کیا اترنا تھا اور چڑھتا جا رہا تھا۔ مالک مکان کے اس مہینے کا کرایہ پندرہ تاریخ گزر گئی مگر ادا نہ ہو سکا۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ صحیح علاج نہ ہونے کی وجہ سے پاؤں کا زخم بھی خراب ہوتا جا رہا تھا۔ درد سے بخار تھا کہ اترتا ہی نہ تھا..... اور اس پہ کھانے پینے کی تنگی..... گھر میں ایک ننھا معصوم بچہ..... اوپر سے بیوی پانچ مہینے کی حاملہ..... ایک دن تنگ آ کر اسی حالت میں مزدوری کے لیے نکل گیا۔ شام کو گھر لوٹا تو گھر پہ تالا تھا، مرجان گھر پہ نہیں تھی۔

''بھائی پریشان نہ ہوں وہ ادھر آگے ہی ایک گھر میں گئی ہے کہہ رہی تھی آپ کو بتا دوں..... ابھی آ جائے گی۔'' ناہید نے بتایا۔

''کتنی دیر میں آئے گی۔'' اس نے فکر اور پریشانی میں پوچھا۔

''ابھی آتی ہی ہو گی آپ فکر نہ کریں۔''

آخر فکر کیسے نہ ہو۔ مرجان تو ان عورتوں میں سے تھی جو باپ کی چار دیواری میں پیدا ہوتی ہیں اور شوہر کی چار دیواری میں مر جاتی ہیں۔ وہ تو دروازے تک مشکل سے آتی تھی۔ پتا نہیں کیا ایسا کام پڑا کہ دروازے سے باہر قدم رکھا اس نے..... وہ بھی اکیلی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ ابھی وہ اسی فکر میں کھڑا تھا کہ وہ عثمان کو گود میں اٹھائے، سامنے گلی میں آتی دکھائی دی۔ وہی بڑا گول برقعہ اور بے چاری سولہ سال کی مرجان۔

''تم کدھر گیا تھا۔'' گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر مرجان سے پوچھا۔

''تسلی رکھو، ابھی بتاتا ہے۔'' مرجان نے ایک ہاتھ سے عثمان کو نیچے چارپائی پہ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے شاپر..... جس میں کچھ چاول اور نان تھے۔

''وہ اگلی، گلی میں شادی تھا ہم وہاں تک گیا تھا۔''

''کیا تمہیں اتنا بھوک لگا تھا؟''

''اپنی بھوک کی پروا نہیں ہے۔'' مرجان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

''ہمیں اپنے معصوم بچے کی قسم۔'' اس نے عثمان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لیے کیا ہم نے..... وہاں جانے کا ہمت..... صرف تمہارے لیے، تم اس حالت میں دو دن سے مزدوری ڈھونڈ رہا ہے اس قدر بخار ہے تمہیں پیٹ میں کچھ جائے گا تو بخار ٹھیک ہو گا ناں..... ایسے تو تم اور بیمار پڑ جائے گا..... ایک یہ پاؤں کا زخم اس پہ بخار، فاقے اور بھوک، تمہاری صحت روز بروز خراب ہو رہا ہے..... آخر ہم اور کیا کرتا۔'' خلیل اللہ کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔

''چھوڑو، اب بیٹھو۔'' اس نے خلیل اللہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس چارپائی پہ بٹھایا۔ اور پھر برتن میں چاول اور نان نکال لائی۔

''لو، کچھ کھا لو۔''

''ہم نہیں کھائے گا۔''

''کیوں؟''

''تم جانتا ہے ہم نہیں کھائے گا۔ امارے حلق سے یہ مانگے کا روٹی نہیں اتر سکتا۔''

''استغفار۔'' مرجان نے زور دے کر کہا۔ ''تم یہ سمجھتا ہے کہ ہم یہ روٹی مانگ کر لایا ہے۔ اس شادی سے، بس تم مرجان کو اتنا ہی سمجھ سکا۔ افسوس، تم نے مرجان کو اتنا ہی سمجھا۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''تو کیا وہ تمہاری پھوپھی کی لڑکی کا شادی تھا کہ انہوں نے تمہیں شادی پہ بلایا بھی اور اتنا سارا کھانا ڈال کر دے بھی دیا۔''

''تم جانتا ہے خلیل اللہ، مرجان کے لیے مرنا آسان ہے، مانگ کر کھانا نہیں..... یہ دیکھو، اس نے خلیل اللہ کے سامنے اپنا گیلا دامن پھیلایا۔ یہ دیکھو، پھر اپنے سرخ ہوتے ہاتھ۔''

''یہ محنت کی کمائی ہے خلیل اللہ، ہم مانگ کر نہیں لایا کما کر لایا ہے۔ وہ برکت خالہ، وہ یہی کام کرتا ہے لوگوں کی شادی بیاہ میں کام سنبھالنا، برتن دھونا..... ہم اسی کے ساتھ گیا تھا۔''

''تم نے وہاں..... برتن دھوئے۔''

''ہاں، محنت مزدوری میں کیا شرم..... ہم نے بھیک تو نہیں مانگی، ہاتھ نہیں پھیلائے..... عزت کا روٹی ہے اب کھالو۔''

''نہیں۔'' خلیل اللہ نے اپنے ایک ہاتھ سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''دیکھو، خلیل اللہ، تم بے کار کی ضد مت کرو، تم کچھ کھائے گا تو ٹھیک ہوگا..... صحت ہوگا تو کما کر لائے گا ناں..... یہاں وہی عزت کی زندگی گزار سکتا ہے جس کی جیب میں کچھ ہو..... کچھ کرنا بہت ضروری ہے..... ورنہ ہم اس دنیا میں اور ذلیل ہو کر رہ جائے گا۔''

''تم بھی جانتا ہے خلیل اللہ، تمہیں اس حال میں کوئی مزدوری نہیں دے گا، لوگ تو، مزدوری کے لیے جانور بھی دیکھ بھال کر تگڑا رکھتے ہیں..... بیمار انسان کو، کون پوچھتا ہے۔ انہیں اپنے کام سے مطلب ہے..... تم بھی جانتا ہے یہاں کسی نے ہمدردی کا دکان نہیں کھولا ہوا۔'' خلیل اللہ کی آنکھوں میں پھر بے اختیار آنسو آ گئے۔ مرجان کی باتوں کی سچائی کو وہ جانتا تھا۔ ان دو، دنوں کی خواری اور ذلالت اس کے سامنے تھی۔ کام کے لیے اس نے بس لوگوں کے پاؤں ہی نہیں پکڑے تھے، باقی تو کچھ ادھار نہیں چھوڑا تھا۔ اسے وہ ٹھیکیدار یاد آ گیا۔ کالا سا، کمزور سا لمبا تڑنگا، مونچھوں والا، کتنی منت سماجت کی تھی کہ وہ مزدوری دے دے۔

''دیکھو ہم مزدور کو ایک دن کا آٹھ سو مزدوری دیتا ہے تا کہ وہ کام کرے، تم سے تو کھڑا نہیں ہوا جا رہا، جاؤ میرا دماغ مت کھاؤ..... مجھے مزدور چاہیں مریض نہیں۔'' جب وہ مایوس پلٹا تو پیچھے سے بڑبڑایا۔ ''پتا نہیں یہ بھیک مانگنے کا کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ لیا ہے ان بے شرم لوگوں نے۔''

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اینٹ اٹھا کر اس ٹھیکیدار کا سر توڑ دے مگر..... وہ بہت چاہا کر بھی ایسا نہ کر سکا۔ اپنی بیوی اور چھوٹے سے بچے کا چہرہ جو آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ اولاد تو واقعی بہت بڑی آزمائش اور کمزوری ہوتی ہے وہ یہی سوچ رہا تھا اگر مجھے کچھ ہوا تو میرے بچے کا کیا ہوگا۔ اس دنیا میں تو یتیموں کا کوئی حال نہیں۔

☆☆☆

اللہ بھلا کرے دائی اماں اور اس ناہید کا جو جتنا خیال کر سکتی تھیں، کرتی تھیں۔ ناہید اکثر سالن کی پلیٹ بھیج دیتی تھی اور دائی اماں اپنے بیٹوں بہوؤں کی آنکھ سے بچا کر کبھی چھوٹے سے شاپر میں چینی، کبھی پتی، کبھی چاول، کبھی کوئی دال۔

دائی اماں..... دائی اماں کی شخصیت محلے کی ان عورتوں جیسی ہوتی ہے جو صرف اپنے بچوں کی ہی نہیں سب کی ماں ہوتی ہیں۔ سب کے لیے فکر مند رہتی ہیں۔ ان کی فطرت میں ہی ماں کی ممتا ہوتی ہے۔ گلی میں سے گزرتے، انہیں دیکھ کر ہی ان کی شفقت اور پیار کا احساس ہو جاتا ہے۔ کبھی کسی کا چھوٹا بچہ کھیلتے کھیلتے باہر نکل آیا تو پکڑ کر دروازے سے اندر کر دیا اور

ماں کو لاپروائی پر دو سنا بھی دیں۔ دو بچوں کو لڑتے دیکھا تو ڈانٹ دیا۔ محلے کے دو گھروں کو آپس میں ناراض نہیں رہنے دیتی تھیں فوراً صلح کروا دیتی تھیں۔ اکثر ٹافیاں لے کر بچوں کو گلی میں بانٹتیں۔ کوئی مدد کے لیے ایک آواز دیتا تو بھاگتی جاتیں۔ جس کی جتنی مدد کر سکتی تھیں کرتی تھیں۔ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھیں، محلے کی ہر عورت ان سے ٹوٹکے اور مشورے لیتی، گھریلو معاملات میں بھی صلح مشورہ ہوتا۔ کسی بھی حال میں کسی فقیر، مانگنے والے کو خالی ہاتھ، مایوس نہیں لوٹاتی تھیں۔ اگر ہاتھ میں کوئی سکہ پیسہ نہ ہو تو اندر سے کوئی روٹی، ڈبل روٹی پکڑا دیتی تھیں۔

ایسے محلوں میں جہاں غربت اور تنگ دستی کسی سوتیلی ماں کی طرح زندگی تنگ کیے رکھتی ہے۔ دائی اماں جیسی عورتوں کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ جن کی شفقت اور ممتا بھرا۔ ایک دلاسا ہی زندگی کی اذیت کم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

☆☆☆

اگر تم اجازت دے، تو ہم برکت خالہ کے ساتھ شادی پہ کام کرنے چلا جائے۔ ہم تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ پھر بھی خاموش تھا۔

''تم امارا جواب جانتا ہے۔''

''اور تم گھر کے حالات.....''

''تمہارے پاؤں کا زخم، مکمل ٹھیک ہو جائے پھر نہیں، ضد کرے گا، ابھی مجبوری ہے تم جانتا ہے۔''

''تم بھی تو اپنا حالت دیکھو، اس حال میں کیسے کام کرے گا۔''

''کرے گا، اللہ کی ذات ہمت دینے والا ہے۔''

خلیل اللہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا، مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ مرجان کو لوگوں کے جوٹھے برتن دھونے کی اجازت دے دی۔ پچھلی شادی سے ایک ہزار معاوضہ ملا تھا جو مالک مکان کو کرائے کی مد میں دے کر اس کا منہ بند کروایا تھا اب آٹھ دن بعد پھر مہینہ ختم ہو جائے گا تو وہ کیا کرے گا؟ اف یہ مہینہ..... کس قدر جلدی نکل جاتا ہے..... کتنی جلدی پہلی تاریخ آ جاتی ہے۔

گھر کا کرایہ..... سب سے بڑی سر دردی تھی۔ کاش میں زیادہ کا لالچ نہ کرتا، کاش، مرجان کی بات مان لیتا تو اتنا نقصان نہ ہوتا۔ کھوکھے کے نقصان کا اسے دلی دکھ تھا، ساری جمع پونجی ایک ہی دن میں مٹی میں ملنے کی تکلیف کم نہ تھی۔ یہ تو مرجان، کی اعلا ظرفی تھی کہ نہ تو اسے کوئی طعنہ دیا نہ کوئی شکوہ کیا بس صبر کیا۔ گھر کے حالات بدلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، پاؤں کا زخم بہتر ہوتے ہی اس نے پھر مزدوری شروع کر دی، پھر وہی اینٹیں..... پھر وہی ریت..... پھر وہی مٹی، بہت کوشش سے بھی سبزی منڈی میں لونڈنگ کا کام نہیں ملا۔ اس شخص نے کہا فی الحال بندے کی ضرورت نہیں جب ہوگی تو ضرور بتائے گا۔

خیر اسے ایک بڑے پلازے کی تعمیر میں مزدوری مل گئی، وہیں اس کی جان پہچان کچھ..... ایسے لوگوں سے ہو گئی جن کا تعلق اس کے اپنے علاقے سے ہی تھا۔ مرجان نے تھوڑے ہی دنوں میں اس میں اور گھر کے حالات میں تبدیلی محسوس کی۔ وہ کچھ مشکوک سا ہو گیا تھا۔ اکثر رات کو اٹھ کر باہر چلا جاتا، نئے عجیب و غریب لوگوں سے دوستی کر لی تھی جو اکثر دروازے تک آتے اور وہ انہی کے ساتھ باہر نکل جاتا۔ مرجان کے کچھ پوچھنے پر اسے کوئی بھی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔

''یہ..... یہ میرے دوست کا سامان ہے۔'' وہ اکثر شاپر اور عجیب و غریب ڈبوں میں لپٹی کچھ چیزیں لاتا اور اسے سختی سے منع کر دیتا کہ اس کے صندوق کو ہاتھ نہ لگائے۔ اپنی چارپائی کے نیچے بڑی احتیاط سے تالا لگا کر ایک چھوٹا سا صندوق اس نے سنبھال کر رکھ دیا، وہ ہمیشہ اسی صندوق کی فکر میں رہتا۔ کبھی گھر کے ایک حصے میں اسے چھپانے کی کوشش کرتا کبھی دوسرے حصے میں..... پھر ایک دن پچن کے ٹوٹے ہوئے روشن دان میں گھسا کر آگے چھوٹا سا پردہ لگا دیا۔ اب وہ اسے چھپا کر کچھ مطمئن تھا۔

''اتنا کیوں سنبھالتا ہے اسے؟ ایسا کیا ہے اس میں؟''

''کچھ نہیں ایک دوست کا امانت ہے، قیمتی

سامان ہے، اسی لیے فکر ہے۔"
"قیمتی سامان ......؟ تمہارے پاس کیوں رکھوایا......؟"
"بس رکھوا دیا، تمہیں کیا مسئلہ ہے؟" وہ کسی بات کا سیدھا جواب دینا تو جیسے توہین سمجھتا تھا۔
"اتنے پیسے......؟" اس نے ایک دفعہ اس کے ہاتھ میں پیسے دیکھے تو حیران ہو کر پوچھا، اس نے جلدی سے جیب میں ڈال دیے۔
"یہ...... یہ امارے نہیں ہیں۔"
"تمہارے نہیں ہیں تو تمہارے جیب میں کیوں ہیں؟"
"امارے ہی ہیں......ہم نے مزدوری کیا۔"
"پہلے تو تمہیں مزدوری کا اتنا پیسہ نہیں ملا۔ اب تم ایسا کون سا مزدوری کرتا ہے؟ جس کا اتنا معاوضہ ہے۔" مرجان پریشان ہو کر پوچھتی۔
"تم کیا چوبیس گھنٹے سوال جواب میں لگا رہتا ہے اپنا کام کرو سر پہ کھڑا رہتا ہے فرشتہ بن کے...... بھئی جاؤ، اپنا کام کرو...... ایک تو یہ عورت کا فطرت ہی گندا ہوتا ہے، ہمیشہ دوسرے کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے...... اپنے کام سے مطلب ہی نہیں۔" وہ الٹا اس بے چاری مرجان پہ چڑھائی کر دیتا۔
"یہ اتنا سامان؟" ایک دن جب وہ گھر کے لیے سودا سلف خرید کر لایا تو وہ حیران ہو گئی۔
"پیسے کہاں سے آئے۔"
"تم بس آم کھاؤ۔"

☆☆☆

"مرجان تمہیں پتا چلا؟" ایک دن جب وہ کام کر رہی تھی ناہید نے دیوار سے آواز دی۔
"وہ دائی اماں، ان کا بڑا بیٹا کل رات مر گیا بے چارا۔"
"کیسے؟ او خدایا! دائی اماں کیسا ہے؟ وہ تو بہت پریشان ہوگا۔"
"ہاں ان کا حال بہت بڑا ہے۔ بے چارے کو کل رات دل کا دورہ پڑا۔ ہم محلے کی سب عورتیں ادھر ہی جا رہی ہیں۔ تم جاؤ گی؟"
"ہاں، کیوں نہیں جائے گا، ہمیں تو بہت افسوس ہو رہا ہے۔ دائی اماں، اماری تکلیف دیکھ کر کبھی نہیں رکا تو ہم کیسے گھر پہ بیٹھا رہے۔ جانا تو ضروری ہے۔ تم ٹھہرو، ہم ابھی برقعہ کر کے آتا ہے۔"
دائی اماں جس بیٹے کے پاس رہتی تھی اب وہ دنیا میں ہی نہ رہا۔ اس کے جانے کے بعد تو بے چاری دائی اماں رل کر رہ گئیں۔ دوسرے بہو، بیٹوں میں وہ بات نہ تھی۔ اب تو کبھی ایک کے گھر کبھی دوسرے کے.....
اب وہ اکثر بیمار ہی رہتیں پہلے ہفتے میں ایک دو چکر مرجان کے گھر کے ضرور لگا لیتی تھیں، اکثر گلی میں بھی نظر آ جاتی تھیں مگر اب ...... کچھ خبر نہیں وہ کس حال میں تھیں۔ مرجان ان کے لیے خاصا پریشان تھی۔
دائی اماں کی کچھ خبر ہے؟ اس نے گوشت کا سالن بنایا تو سوچا، ناہید کے برتن واپس کر دے۔ دیوار پہ پلیٹ رکھتے اس نے ناہید سے پوچھا۔
"ہائے، بے چاری برے ہی حال میں ہیں۔ خیر وہ تو ہمیشہ سے ہی اسی حال میں تھیں......"
"کیوں؟"
"پہلے ان کے اس نشئی شوہر نے ان پہ زندگی کو تنگ کیے رکھا، بڑا عجیب انسان تھا، بڑا ناقابل برداشت شوہر...... شراب پینا، دوسری عورتوں سے تعلقات گھر میں روز، روز کا جھگڑا...... مار کٹائی اور اب اس بیماری اور بڑھاپے میں بہو، بیٹوں کا یہ سلوک ...... اللہ معاف کرے۔" ناہید نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "پہلے کچھ عافیت تھی۔ رہنے کو ایک مستقل ٹھکانا تو تھا اب کام ہوتا ہے تو ہر بہو چاہتی ہے، یہیں رہیں اور جب بیمار ہو جائیں تو کوئی سنبھالنے کو تیار نہیں ...... بے چاری بوڑھی ہو گئیں مگر زندگی کا سکھ نصیب نہیں ہوا۔"
ناہید کی باتوں نے مرجان کو اداس کر دیا۔ وہ دائی اماں کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی مگر کرے بھی تو کیا کرے۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

صدمے جھیلوں، جاں پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں ہے
لیکن تیرے پاس وفا کا، کوئی بھی معیار نہیں ہے

خوابوں کی دنیا میں رہنے والے نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ حاصل چیز کی قدر نہیں کرتے اور لاحاصل کے لیے روتے رہتے ہیں۔ ایک ایسی ہی عورت کی داستان حیات اس کی شادی اس کی پسند کے خلاف کر دی گئی تھی لیکن وہ اپنی لاحاصل محبت کے لیے بے چین رہی اور جب محبت حاصل ہو گئی تو وہ دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔

عورت کا اٹھا ایک غلط قدم اسے کہاں پہنچا دیتا ہے اس کا اندازہ آپ کو کہانی کے انجام میں ہوگا

منقسم عورت

تبسم مہتاب قریشی

سہاگ رات کیسا موہ لینے والا اور جذباتی لفظ ہے۔ پیار سے بھرپور نشیلے خوابوں کی دنیا۔ ان دیکھے سفر کا آغاز۔ ایک باب کی انتہا اور دوسرے کی ابتداء۔ خوف اور خوشی کا ملا جلا احساس۔

نجمہ نے بھی یہ خواب دیکھے تھے لیکن توفیق کے لیے، عظیم لیے نہیں جس کے پلے اسے باندھا جا رہا تھا۔ کیسی بھیانک تعبیر تھی اس کے خوابوں کی۔ نجمہ کمرے میں اکیلی تھی اور اس تنہائی نے اس کے دل میں بے زاری اور نفرت بھر دی۔ اس نے سوچا۔

عظیم کتنا خود غرض ہے۔ اپنی خوشی کی خاطر میری خوشیوں کا خون کر دیا جس طرح میں کوئی پتھر کی مورت ہوں جس کی کوئی اپنی تمنا نہیں۔ میں عظیم سے اپنی تباہی کا بدلہ ضرور لوں گی۔

نجمہ متوسط طبقے کی لڑکی تھی ہر نوجوان لڑکی کی طرح اس کے بھی کچھ خواب تھے۔ پیارا، خوب صورت اور نوجوان ساتھی، توفیق اس کی منزل تھا وکیل تھا، اس کا چچا زاد تھا لیکن قسمت میں عظیم لکھا تھا، جو عمر میں نجمہ سے تقریباً بیس سال بڑا تھا سنجیدہ، بردبار، خاموش اور بادقار، اس کی بیوی اور دو بچے حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ اس صدمہ کے بعد اس نے شادی نہیں کی اور خود کو کاروبار میں مصروف کر لیا۔ لیکن نجمہ میں اسے اپنی مرحوم بیوی کا عکس نظر آیا۔ اسے یہ عام سی لڑکی بہت پسند آئی۔ یہ ملاقات ایک دعوت میں ہوئی۔ میزبان سے نجمہ کا پتا پوچھ کر عظیم نے نجمہ کے باپ کو پیغام بھیجا جو فوراً منظور ہو گیا۔ اور یوں نجمہ عظیم کی دلہن بن گئی۔

کھٹکا ہوا۔ نجمہ کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ عظیم نے کمرے میں قدم رکھا۔ خوف اور نفرت کے ملے جلے احساس سے مغلوب نجمہ نے سر اور جھکا لیا۔ عظیم نے گھونگٹ اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

''نجو میں جانتا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ سے مایوسی ہوئی ہو گی لیکن تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی صنیہ یاد آ گئی، ارشد اور امید یاد آ گئے۔ میں زخمی ہوں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور میں..... میں تمہارا مخلص ساتھی اور بہترین دوست ثابت ہوں گا۔''

عظیم نے دکھی لہجے میں کہا، نجمہ کے آنسو بہہ نکلے۔

''میری نازک گڑیا اب تم آرام کرو، تھک گئی ہو گی صبح کو ملاقات ہو گی۔''

حسرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس نے سوچا۔

میں نے کتنا غلط تصور قائم کیا تھا عظیم کے لیے میں نے جسے خود غرض سمجھا وہ تو انتہائی بے غرض نکلا، لیکن ہے تو میرے پیار کا قاتل، میں بدلہ ضرور لوں گی۔

دوسرے روز عظیم نے نجمہ کو تیاری کرنے کے لیے کہا، اس لیے کہ ہنی مون منانے سوات جانا تھا۔ نجمہ اداس ہو گئی۔ کاش عظیم کے بجائے توفیق ہوتا۔ سوات کا سفر مزے سے کٹ جاتا۔

پرفضا پہاڑوں کے بیچ ایک خوب صورت بنگلے میں دونوں نے قیام کیا ماحول وہی تھا لیکن کیفیات جدا جدا تھیں۔ عظیم خوش تھا اور نجمہ اداس۔ نجمہ کے موڈ کو دیکھتے ہوئے عظیم اکیلا ہی گھومنے چلا گیا اور نجمہ کو آرام کرنے کا کہہ گیا۔

''اف! کہیں یہ شخص مجھے پاگل نہ کر دے، ہر بات میں میرا احترام کہیں مجھے اس سے پیار نہ ہو جائے، لیکن نہیں! یہ شخص میری خوشیوں کا قاتل ہے مجھے اس سے پیار نہیں ہو سکتا۔''

دو تین روز گزر جانے کے باوجود جب نجمہ کی بیزاری قائم رہی تو عظیم نے کہا۔

''نجمہ تم شاید بور ہو گئی ہو، میرا خیال ہے واپس چلیں۔'' نجمہ گھبرا کر سوچنے لگی۔

کہیں یہ شخص جادو گر تو نہیں، دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ عظیم واقعی عظیم ہے۔

نجمہ کو عظیم پر بہت پیار آیا۔ لیکن یہ پیار اس وقت احساس کمتری میں بدل گیا جب اس نے نوجوان جوڑوں کو سیر و تفریح کرتے دیکھا اسے اپنی بے جوڑ شادی پر افسوس ہونے لگا اسے پھر توفیق یاد آ گیا۔

ہنی مون سے واپس آ کر ایک دن عظیم نے نجمہ سے بہت پیار سے کہا۔

''دیکھو گڑیا! پورا ایک مہینہ گزر چکا ہے اب تو

خاموشی کی اس مہر کو توڑ دو۔ اگر یہ حجاب ہے تو ختم ہو جانا چاہیے۔ بیزاری ہے تو غصہ دل میں نہ رکھو، کہہ ڈالو۔ میں تمہاری ہر بات برداشت کروں گا۔ اداس نہ ہوا کرو نجو۔ یہ گھر یار، یہ پیسہ سب تمہارا ہے۔ میں بھی تمہارا ہوں پھر مایوس کیوں ہو؟ ارے تمہاری آنکھوں میں آنسو۔ مت رو جانم تمہارے آنسو میں، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

عظیم نے نجمہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ بھی کسی بچے کی طرح عظیم کے سینے سے جا لگی۔ اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں عظیم۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔''

عظیم چلا گیا۔ نجمہ کو پہلی مرتبہ اس گھر پر پیار آیا جو اس کا اپنا تھا۔ اپنائیت کا احساس، ملکیت کا احساس نجمہ کو بہت سکون دے رہا تھا لیکن یہ سب ہونے کے باوجود کچھ تھا جو اندر ہی اندر اسے پگھلا رہا تھا۔ کوئی درد، کوئی کمی۔

عظیم کے پیار، ہمدردی، خلوص اور پوری توجہ نے کسی حد تک نجمہ کو بحال کر دیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر عظیم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ کبھی نرمی سے بات کرتی تو عظیم کہتا۔

''نجو! اس طرح بات کیوں کرتی ہو حکم دیا کرو میں تمہارا خادم ہوں۔''

ان نازنخروں نے نجمہ کو گستاخی کی حد تک بے باک کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود عظیم خوش تھا۔ اس نے نجمہ میں خود اعتمادی کو اس حد تک ابھارا کہ وہ اپنی غلط بات کو بھی صحیح منوا لیتی۔ اگر کبھی اسے اپنی زیادتی کا احساس ہوتا اور وہ عظیم سے ذکر کرتی تو وہ کہتا۔

''گڑیا تم نے کوئی زیادتی نہیں کی میں خوش ہوں کہ تم خوش ہو اور لڑتے بھی تو اپنوں سے ہیں۔''

عظیم کا پیار اتنا تھا کہ بعض اوقات نجمہ کو خوف محسوس ہونے لگتا۔ وہ عظیم سے کہتی۔

''آپ نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے اب میں کسی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی۔''

''نجو جانی۔ میں نے تمہارے اندر جو خود اعتمادی پیدا کی ہے وہ بھی زندگی کی سب سے بڑی فتح ہے۔ تمہیں مجھ پر اعتماد ہے اور اتنا اعتماد ہے کہ تم گستاخی بھی کرتی ہو تو یہ سمجھ کر میں برا نہیں مانوں گا اور یہ اعتماد ہی میری زندگی ہے۔''

''اور میں جو آپ کا اتنا خیال رکھتی ہوں تو کیا اس پیار کی بھی حق دار نہیں ہوں۔''

''حق دار ہو نجو، تب ہی تو کہتا ہوں، مگر یہ صرف اس لیے ممکن ہے کہ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ بات بات پر لڑتا نہیں ہوں اور یوں تلخی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر کوئی نوجوان ہوتا تو بجائے تمہاری حاکمیت منوانے کے اپنی حاکمیت منواتا۔''

''جی ہاں بڑی مہربانی ہے، بڑا احسان ہے۔''

''غلط بات مت کرو۔''

''ہاں ہاں میں تو غلط باتیں کرتی ہوں صحیح باتیں تو آپ ہی کرتے ہیں۔''

''میں بھی پاگل ہوں اپنی گڑیا کو ناراض کر دیتا ہوں، چلو گھومنے چلیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔''

''اکیلا تو جہنم میں بھی نہیں جاؤں گا۔''

''آپ مجھے جہنم میں بھیجنا چاہتے ہیں؟''

''دیکھو پھر غلط بات۔''

''اب تو آپ کو میری کوئی بات اچھی نہیں لگتی مجھ سے بیزار ہو گئے ہیں؟''

''نجو مجھے جو کچھ بھی کہہ لو مگر میرے پیار کی توہین مت کرو۔''

''بڑا پیار کرتے ہیں۔''

''تو اور کیا مذاق کرتا ہوں۔''

''مجھے کیا پتا۔''

''اچھا چلو گھوم آئیں موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ایمان سے بہت تنگ کرتے ہیں آپ خود کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں؟''

''تمہارا خادم..... جواب دو۔''

نجمہ کے ہونٹوں پر جذبات میں ڈوبی ہوئی دل فریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

عظیم جس طرح خود سادہ دل تھا ویسا ہی اس نے

نجمہ کو بھی سمجھا۔ لیکن وہ اب تک اس سے سمجھوتا نہیں کر سکی تھی۔ عظیم نے سوچا تھا کہ اس کے بے لوث پیار کے جواب میں نجمہ اسے ضرور پیار کرنے لگے گی لیکن وہ اس سے پیار کرتے ہوئے بھی اس سے نفرت محسوس کرتی تھی۔ قدم قدم پر پیار اور بیزاری ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ یہ احساس ہوتے ہوئے بھی کہ عظیم کے گھر میں وہ ملکہ ہے توفیق کے ساتھ اس نے اپنا تعلق قائم رکھا۔ فون خط، ملاقات تعلق مضبوط ہوتا گیا۔ اپنے پیار کی تسکین کی خاطر بعض اوقات وہ عظیم سے طلاق لینے کے متعلق سوچنے لگتی۔ لیکن جب عظیم کا پیار دیکھتی تو وہ توفیق کو بھول جاتی۔ اس کشمکش نے نجمہ کو نفسیاتی مریض بنا ڈالا۔ وہ سوتے میں بولنے لگی تھی لیکن عظیم اسے پہلے سے زیادہ چاہنے لگا تھا۔

نجمہ کو بخار تھا۔ غش میں پڑی ہوئی تھی عظیم اس کی بیٹی سے لگا بیٹھا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا اسے نجمہ کی نفرت کا احساس تھا اور اسے اپنی محنت کے ضائع ہو جانے کا دکھ تھا۔ نجمہ کے کراہنے پر عظیم حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا وہ بے اختیار نجمہ کی طرف بڑھا لیکن ٹھٹھک گیا۔ نجمہ بڑبڑا رہی تھی۔

''توفیق..... تم، میں..... توفیق۔''

عظیم بردبار ضرور تھا لیکن بے وقوف نہیں تھا۔ یہ بے ربط الفاظ سن کر اسے یوں محسوس ہوا، جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ اس کے سر کو ہلکا سا چکر آ گیا۔ دل میں درد کی لہری اٹھی مگر وہ ضبط کر گیا۔ اس نے اپنا دکھ چھپائے دل و جان سے نجمہ کی خدمت کی یہاں تک وہ بالکل ہی تندرست ہو گئی اور پھر ایک دن اس سے کہا۔

''نجو میں تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی۔''

''توفیق کون ہے؟''

''جی۔ کوئی بھی نہیں! کوئی بھی تو نہیں۔ مگر آپ کو کس نے بتایا؟''

''تمہاری پریشانی بتا رہی ہے۔''

''آں۔ نہیں میں پریشان تو نہیں، میں تو بالکل نارمل ہوں۔''

''خیر میں تمہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ میں اتنا گرا ہوا نہیں کہ تمہاری خوشیوں کو پامال کروں۔ میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔''

آنسو، سسکیاں۔

''دیکھو نجو رونے کی کوئی بات نہیں مجھے صرف حقیقت بتا دو۔''

''لکھ کر بتاؤں گی۔'' ہچکیوں کے درمیان نجمہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' عظیم نے کہا اور چلا گیا۔

نجمہ اپنی داستان لکھنے بیٹھی تو وہ بہت جذباتی ہو گئی۔ وہ یہ بھول گئی کہ عظیم اس کا شوہر ہے اور اسے کسی بات پر غصہ بھی آ سکتا ہے لیکن وہ اپنی رو میں توفیق کے بارے میں بہت کچھ لکھ گئی۔ عظیم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے آخر میں اس نے لکھا کہ وقت نے اس کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔

خط پڑھتے ہی عظیم کا سر چکرانے لگا اور دل میں درد سا اٹھا۔ اور پھر جب اسے ہوش آیا تو اسپتال میں تھا۔ آنکھیں کھول کر اس نے چاروں طرف دیکھا نقاہت کے مارے بولا بھی نہ گیا۔ چند گھنٹوں کی تکلیف نے اسے صدیوں کا مریض بنا دیا تھا۔ نجمہ اس کے سینے سے جا لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''عظیم مجھے معاف کر دیجئے میں آپ کی گنہ گار ہوں۔''

''پگلی..... معاف تو۔'' درد پھر اٹھا۔ ضبط کرتے ہوئے عظیم نے کہا۔ معافی تو تجھے مانگنی چاہیے۔

''نہیں عظیم نہیں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے کچھ نہیں چاہیے۔''

''نجو میری جان کاش زندگی اتنی مہلت دے کہ تمہارے پیار میں ڈوبے الفاظ کچھ دیر اور سن سکوں، زندگی کی بہت بڑی اور آخری خواہش پوری ہو رہی ہے۔''

نجمہ اس کے سینے پر سر رکھے روتی رہی اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

''نجو آج تم نے..... اتنے پیار سے..... مجھ سے بات کی ہے اب میں..... آرام سے مر سکوں گا

ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

ہاتھ رک گیا اور بے جان ہو کر ڈھلک گیا۔ نجمہ روتی رہی عظیم سے لپٹ کر لیکن پجاری دیوی کے حضور نذرانہ پیش کر چکا تھا۔ عظیم نجمہ کو آزاد کر چکا تھا۔ آئندہ خوشیوں کے لیے۔

☆☆☆

عظیم کیا گیا نجمہ کی زندگی ویران ہو گئی اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ عظیم کو اتنا بہت پیار کرتی ہے۔ اور اس کے بغیر جینا حرام ہو جائے گا۔ اب کون اس کے ناز اٹھائے گا۔ کون منائے گا لیکن توفیق کے تصور نے دکھ کی اس شدت کو کم کر دیا۔

عظیم کی دولت اور توفیق کے ساتھ نے زندگی کو خوابوں کی جنت بنا دیا تھا۔ نجمہ کو اس کے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی ایک نوجوان ساتھی، توفیق اس کا اپنا توفیق۔

لیکن کبھی کبھی عظیم کی یادیں دل میں درد بن کر سما جاتی تھیں۔ اور یہ تب ہوتا تھا جب توفیق روٹھ جاتا تھا۔ وہ جوان اور جذباتی تھا۔ بات بات میں غصہ آ جاتا اور اس وقت عظیم کا خاموش اور سمندر کی طرح گہرا پیار نجمہ کو یاد آ جاتا اور وہ تڑپ اٹھتی تھی۔

ایک روز توفیق ناراض ہو کر کورٹ چلا گیا۔ نجمہ کو عظیم کی یادوں نے گھیر لیا۔ وہ الماری میں سے اس کی تصویر نکال لائی۔ اور اسے سینے سے لگا کر رونے لگی۔ اچانک توفیق آ گیا۔ شاید نجمہ کو منانے آیا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' نجمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب تک عظیم صاحب کا سوگ منایا جا رہا ہے۔''

''نہیں توفیق نہیں تو۔''

''تمہیں شرم نہیں آتی میرے ہوتے ہوئے کسی اور کے لیے آنسو بہا رہی ہو۔''

''وہ اس دنیا سے جا چکا ہے توفیق۔''

''تو تم بھی چلی جاؤ۔''

''میں تو تمہاری وجہ سے اسے بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''میری وجہ سے یا اپنی عیاش فطرت کی وجہ سے؟ کہ تمہیں ہمیشہ ایک نوجوان شوہر کی تمنا رہی۔''

''توفیق میرے پیار کو میرے کردار کی کمزوری مت بناؤ۔''

''تم ایک شوہر کے ساتھ بے وفائی کر سکتی ہو تو دوسرے کے ساتھ کرتے تمہیں کیا جھجک محسوس ہوگی۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے میرا محبوب، میرا شوہر اتنی گھٹیا سوچ کا مالک ہے۔''

''چلو یونہی سہی۔''

چار دن سے دونوں کی بات چیت بند تھی۔ نجمہ حیران تھی کہ توفیق کی اس بدتمیزی پر کس ردعمل کا اظہار کرے۔ غصہ کرنا بھی فضول تھا اور منانا تو اسے بھول ہی گیا کیونکہ یہ سب کام تو عظیم انجام دیتا تھا اسے توفیق سے نفرت سی ہونے لگی۔

خواب بکھر گئے تھے جوان خون نے اپنی حاکمیت منوالی تھی۔

آخر نجمہ نے ہار مان لی۔

''مجھ سے ناراض ہو توفیق؟ میں بہت دکھی ہوں مجھ سے روٹھا نہ کرو۔''

''چلی جاؤ دماغ خراب نہ کرو۔''

''صبر کی حد ہوتی ہے توفیق۔''

''میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔''

''تم کچھ حقیقت ہو اور عظیم ایک گمان۔ تم اپنا مقابلہ اس سے کیوں کرتے ہو۔''

''میرے پیار میں گمان کا دخل ہے۔''

''تم کتنے بدل گئے ہو توفیق۔''

''یا تم نے کوئی اور پھانس لیا ہے۔''

''توفیق یہ بداخلاقی ہے۔''

''سچ نہیں سنا جاتا۔''

''تم کیا جانو سچ کی قدر۔''

''تو کیا عظیم جانتا تھا؟''

''ہاں۔ اس میں سچ سننے اور برداشت کرنے کا وصف تھا؟''

’’اب تک نہیں بھولیں بہت وفادار ہو۔‘‘

’’احسان مند ہوں۔ مرنے سے پہلے اسے تمہارے متعلق علم ہو گیا تھا۔ اگر وہ اس جائیداد میں سے مجھے کچھ نہ دیتا تو میں کیا کر لیتی۔‘‘

’’اچھا ہوا تم نے میری حیثیت مجھے یاد دلا دی۔ یہ سب کچھ تو عظیم کی بدولت ہے۔ میری تو کوئی حقیقت نہیں۔‘‘

’’تم سے بات کرنے میں کون جیت سکتا ہے۔‘‘

صلح نہیں ہوئی، نجمہ بکھر کر رہ گئی۔ اس نے نہ جانے کس دل سے توفیق کو منانا چاہا تھا۔ لیکن ناکام رہی، اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر بہت رونا آیا۔ اور وہ عظیم کی تصویر کو سینے سے لگائے ساری رات سسکتی رہی۔

’’عظیم آپ کو تو روتی ہوئی نجو اچھی نہیں لگتی تھی۔ اب دیکھیے آپ کی گڑیا...... رو رہی ہے اور کوئی اسے منانے والا نہیں۔‘‘

چند دن اسی ناراضی میں گزر گئے اور پھر توفیق نے اسے منا لیا۔ لیکن نجمہ یہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ توفیق کبھی بھی عظیم نہیں بن سکتا وہ روٹھنا تو جانتا ہے منانا نہیں۔ نجمہ نے اس لڑکی کا گلا گھونٹ دیا جسے عظیم نے خود اعتمادی بخشی تھی لیکن وہ تو زخمی ہو چکی تھی۔ وہ دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ منقسم عورت۔

رات بھیگ رہی تھی، صبح عظیم کی پہلی برسی تھی۔ نجمہ ماضی میں کھوئی ہوئی عظیم کی یادوں سے کھیل رہی تھی۔ توفیق نے کروٹ بدلی سسکیوں کی آواز سن کر اٹھ بیٹھا۔

’’نجو! خیریت؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘

’’کچھ تو ہے۔ بتاؤ نا میری جان۔‘‘

’’کل عظیم کی برسی ہے میں سوچ رہی تھی نیاز۔‘‘

’’نجو! کان کھول کر سن لو میرے گھر میں عظیم کے لیے کچھ نہیں ہوگا سمجھیں۔‘‘

’’توفیق۔‘‘

’’میں تو پچھتا رہا ہوں کہ میں نے ایسی لڑکی سے شادی کیوں کی؟ جس کی زندگی میں کسی کی یادوں کی پرچھائیاں ہیں، دل میں اس کا پیار زندہ ہے۔ تم تو رو بھی لیتی ہو نجو۔ میں تو رو بھی نہیں سکتا۔ میں جو ہر لمحہ سولی پر ٹنگا ہوا ہوں کسی کو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ میرا محبوب کسی اور کے لیے تڑپ رہا ہے۔‘‘

توفیق زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں وہ میرا شوہر تھا۔‘‘

’’پھر مجھ سے شادی کر کے میری زندگی میں زہر کیوں گھول دیا؟‘‘

’’کون سا زہر گھولا ہے؟‘‘

’’چپ ہو جاؤ توفیق چپ ہو جاؤ۔‘‘ نجمہ کی آنکھوں کے بند ٹوٹ گئے۔

’’رونے کی کیا بات ہے؟ میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔‘‘

آنسو، سسکیاں۔

’’چپ ہو جاؤ اب سونے دو شوہر کے لیے ٹسوے بہانے ہیں تو دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔‘‘

’’بے حس، خود غرض، پتھر دل۔‘‘

’’بکواس بند کرو۔‘‘

’’بکواس تم بند کرو۔‘‘

’’او رذیل عورت تمہاری زبان بند نہیں ہوتی۔‘‘

ایک زناٹے دار تھپڑ نجمہ کے گال پر پڑا۔ نجمہ نے بھی ہاتھ اٹھا لیا اور پھر توفیق نے گھونسوں اور لاتوں سے نجمہ کو پیٹ ڈالا۔ نجمہ کو مار کی اذیت سے زیادہ مار کا صدمہ تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

صبح آنکھ کھلی تو توفیق اور نجمہ کے ماں باپ سب اس کے گرد جمع تھے۔ اس نے ایک اجنبی نظر سب پر ڈالی۔ اس کی ماں آگے بڑھی۔

’’چندا کیسی ہو؟‘‘

’’کون ہو تم؟‘‘

’’میں تمہاری ماں ہوں۔‘‘

’’ماں؟ میری کوئی ماں نہیں۔‘‘

’’نجو طبیعت کیسی ہے؟‘‘

’’تم کون ہو؟‘‘

’’میں توفیق ہوں تمہارا شوہر۔‘‘

’’تو...... فی...... ق...... شوہر؟ میرا شوہر تو عظیم ہے عظیم کہاں ہے؟ عظیم، عظیم۔‘‘

نجمہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

’’نجمہ کو ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اس لیے اسے کوئی بات یاد دلانے کی فی الحال کوشش نہ کریں ذہن پر زیادہ زور دینے سے دماغی توازن بگڑ جانے کا خطرہ ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر صاحب میری نجو کو بچا لیجیے۔‘‘ توفیق نے ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

تین دن تک ڈاکٹر نجمہ کو نشہ آور دوائیں دیتے رہے تاکہ صدمہ کا اثر ختم ہو جائے۔ لیکن جب اسے ہوش میں لایا گیا تو اس نے پھر عظیم کو یاد کیا۔

’’عظیم...... آ...... آ، آپ کہاں ہیں؟‘‘

’’نجو طبیعت کیسی ہے؟‘‘

’’تم کون ہو؟‘‘

’’میں توفیق ہوں نجو۔‘‘

’’میں کسی کو نہیں جانتی۔‘‘

وہ سسکیاں لیتی رہی۔

’’میرا عظیم کہاں ہے۔ اسے...... کیوں...... نہیں بلاتے عظیم...... ع ظی...... م، ع...... ظی م۔‘‘

نجمہ پھر بے ہوش ہو گئی۔

ڈاکٹر توفیق کو ایک طرف لے گئے۔

’’مسٹر توفیق! ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنی پوری کوشش کے باوجود مسز توفیق کو نہیں بچا سکے۔ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔ میں آپ کو مینٹل ہاسپٹل کی سپرنٹنڈنٹ کے نام خط لکھ دیتا ہوں آپ انہیں فوراً پاگل خانے میں داخل کروا دیں۔‘‘

’’ڈاکٹر؟ میری نجمہ کو کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر؟ یہ سب کیا ہو گیا۔‘‘

ڈاکٹر نے تسلی دینے کے خیال سے توفیق کا شانہ تھپتھپایا اور توفیق ڈاکٹر کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆

مغالطہ

ایک ڈاکٹر نے نوجوان بیٹی سے کہا۔ ’’جلدی کرو، میرا اسٹیتھسکوپ اور دواؤں کا بکس گاڑی میں رکھ دو۔ مجھے ایک ایمرجنسی کال آئی ہے اگر میں فوراً نہ پہنچا تو وہ مر جائے گا۔‘‘

’’پاپا! وہ کال آپ کے لیے نہیں، میرے لیے آئی تھی۔‘‘ بیٹی نے شوخی سے کہا۔

غلطی

آمنے سامنے سے آتی ہوئی ایک خاتون اور ایک صاحب کی گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ خاتون گاڑی سے اتر کر معذرت بھرے لہجے میں بولیں۔

’’معاف کیجیے گا، غلطی میری ہے۔‘‘

’’نہیں خاتون! غلطی میری ہے۔‘‘ وہ صاحب ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔

’’میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ سامنے سے آنے والی کار کوئی خاتون چلا رہی ہیں۔ میں چاہتا تو اپنی گاڑی کچے میں اتار کر جلدی سے کسی درخت کی آڑ لے سکتا تھا لیکن میں نے گاڑی کو سیدھا چلنے دیا۔‘‘

مشورہ

ایک خاتون انتہائی دکھی لہجے میں اپنی دوست کو بتا رہی تھیں کہ ’’میرا شوہر مجھ سے زیادہ اپنی ماں کو چاہتا ہے۔‘‘

دوست نے پوچھا۔ ’’تمہیں کیسے پتا چلا؟‘‘

کہنے لگی۔ ’’ایک دن میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ میں اور تمہاری ماں ڈوب رہے ہوں تو تم پہلے کس کو بچاؤ گے؟‘‘

’’پھر اس نے کیا کہا؟‘‘ دوست نے تجسس سے پوچھا۔

’’وہ کہنے لگا، اپنی ماں کو۔ کیوں کہ ان کا حق زیادہ بنتا ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ میں ان حالات میں کیا کروں؟‘‘ خاتون نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

دوست سنجیدگی سے بولی۔ ’’تم تیراکی سیکھنا شروع کر دو۔‘‘

نکتہ رسی

یاسمین فرحت

پراسرار کہانیوں کے مصنف کی بھتیجی نے اپنے چچا کی ذہنی حالت کو پیش نظر رکھ کر اس کی نئی کہانی کے ایک پیراگراف سے فائدہ اٹھانے کا سوچا اور پھر اپنے منصوبے پر عمل بھی کر ڈالا مگر وہ ایک نکتے کو فراموش کر گئی تھی۔

(وارث میں ملنے والی دولت کا اصل مزا اس وقت ہوتا ہے جب جوانی میں ملے)

چچا ایوری بھوتوں، چڑیلوں اور روحوں کی پراسرار کہانیاں تحریر کیا کرتے تھے۔ میرے نزدیک ان کی کہانیاں بڑی ہیبت ناک ہوتی تھیں لیکن لوگ بصد ذوق وشوق ان سے چٹ پٹے کبابوں کی طرح لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ان کی کہانیوں کے بل بوتے پر چچا ایوری نے بڑی دولت کمائی تھی۔ کامیابی ان کے قدم چومتی تھی لیکن خود وہ اس کامیابی کو کامیابی تصور نہیں کرتے تھے۔ میگزینوں کی طرف سے فرمائشوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ چنانچہ چچا ایسی کہانیاں لکھنے پر مجبور تھے۔ ان کی کہانیوں کی اداس اور غم زدہ ہیروئنیں بھوتوں اور چڑیلوں کے ہاتھوں بڑے بڑے دکھ اٹھاتی تھیں اور آخر انتہائی المناک انجام سے دوچار ہو جاتی تھیں۔

میں ان کی ہاؤس کیپر بھی تھی اور سکریٹری بھی۔ انہوں نے مجھے اس عہدے کی پیشکش اس وقت کی تھی جب میرا شوہر اچانک انتقال کر گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی ان کی پیش کش کو غیبی امداد سمجھ کر قبول کیا۔ وہ میرے باپ کے بھائی تھے اور دور کے چند رشتے داروں کو چھوڑ کر جو نہ جانے کہاں کہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی واحد قریبی رشتے دار تھی۔ فطری طور پر چچا ایوری سے میری بے شمار توقعات وابستہ تھیں۔ ان کی پیش کش قبول کرتے وقت میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ میں ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے انہیں خوش رکھ سکوں گی۔

اور شروع شروع میں، میں نے ایسا ہی کیا۔

اس زمانے میں جب میں ان کے ہاں پہنچی، وہ اپنی پچاسویں کہانی تحریر کرنے والے تھے۔ ان کی ہاتھوں ہاتھ لی جانے والی کہانیوں کے پھلوں میں دس ایکڑز کے درمیان بنی ہوئی ایک خوب صورت مینشن دو جدید طرز کی بڑی اور بیش قیمت کاریں، ایک باورچی اور ایک مالی شامل تھے۔ میرے قیام کے لیے یقیناً وہ بہت اچھی اور فضا جگہ تھی۔ میں گھر کو خوب بنا سنوار کر رکھتی۔ کہانیوں کے مسودوں کو دوبارہ صاف ستھرے طریقے پر ٹائپ کرتی۔ آئے ہوئے خطوط کے جواب دیتی اور وقتاً فوقتاً چچا ایوری کی ہمت بڑھاتی کہ وہ ایک عظیم ناول تحریر کریں۔

لیکن عظیم ناول، عظیم ادیب ہی لکھ سکتے ہیں۔ مجھ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہی تھی کہ چچا ایوری عظیم ادیبوں میں سے نہیں تھے اور نہ کبھی ہو سکتے تھے۔ چند سالوں کے بعد وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے اور مایوسی کے عالم میں ہر وقت نشے میں دھت رہنے لگے۔

میں ان کی مایوسی کو محسوس کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ میرے ناقابل برداشت ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہمت افزائی کرنے کے بجائے میں نے کوشش کی کہ ان کی مایوسی میں روز بروز اضافہ ہو، میرے دل میں ان کی موت کی خواہش جاگ اٹھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک انجانے مقررہ وقت پر، اس دنیا کو خیر باد کہیں بلکہ میری آرزو تھی کہ انہیں جلد از جلد، مقررہ وقت سے پہلے موت آجائے۔

مجھے علم تھا کہ میں چچا ایوری کی دولت کی مالک ہوں کیونکہ پچھلے چند سالوں میں میں ان کی اتنی خدمت کی تھی کہ نہ صرف وہ مجھ پر انحصار کرنے لگے تھے بلکہ اپنی وصیت میں انہوں نے خاص طور پر مجھے اپنا وارث قرار دیا تھا۔ اڑسٹھ سال کی عمر میں بے انتہا شراب نوشی اور سگریٹ نوشی کے باوجود جسمانی طور پر ان کی صحت اتنی اچھی تھی کہ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ دنیا کو الوداع کہنے کے لیے انہیں اتنا طویل عرصہ درکار ہوگا کہ میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ یہ تصور دل کو خوش کرنے والا نہیں تھا۔ ایک عجیب سی وحشت تھی جو مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ ورثے میں ملنے والی دولت کا اصل مزا اسی وقت ہوتا ہے۔ جب جوانی کے زمانے میں ملے۔ بڑھاپے میں ملنے والی دولت مٹی کی اس مٹھائی کی طرح ہوتی ہے جو دیکھنے میں خوش نما ہو لیکن حلق سے نیچے نہ اتاری جا سکے۔ اور چچا ایوری کے لیے ضروری تھا کہ وہ میری جوانی کے زمانے میں اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں۔

بس ایک سہ پہر کو جب میں ان کے اسٹڈی روم میں گئی اور مجھے ٹائپ کیے ہوئے زردی مائل

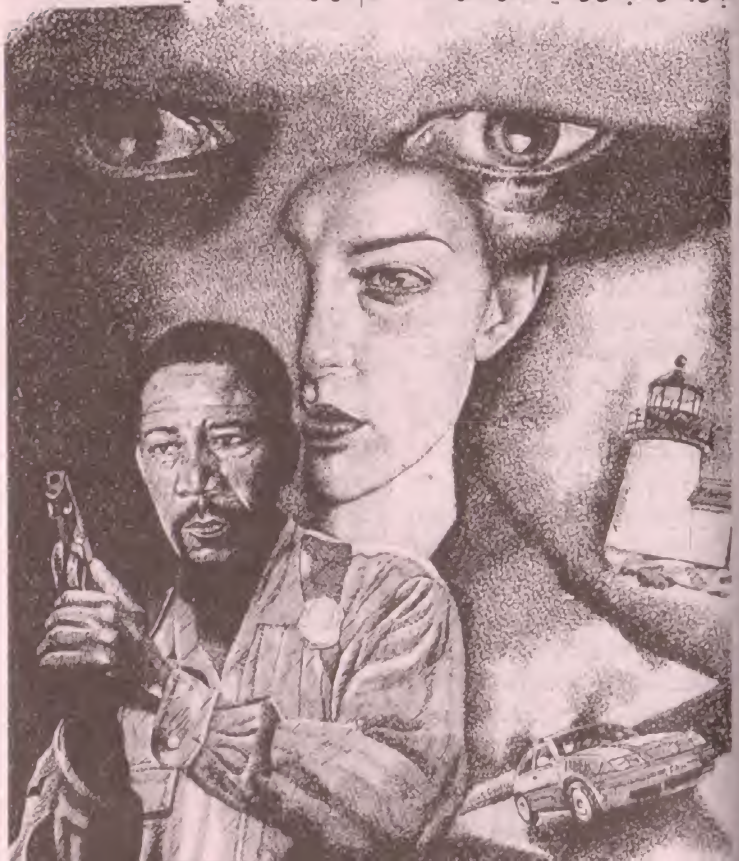

صفحات پر رکھا ہوا ایک مختصر سا اقتباس کی مدد سے فائدہ نہ اٹھانا انتہائی درجے کی حماقت ہوگی۔

بھوت پریت کی کہانی والا وہ اقتباس باقاعدہ خودکشی کا مکمل ترین اعتراف تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ قدرت کو میری حالت زار پر بالآخر رحم آ گیا ہے۔

حالات سازگار تھے۔ چچا کی روز افزوں شراب نوشی اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے تھے۔ میں نے ایک نظر چچا ایوری پر ڈالی۔ وہ دنیا مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کے خراٹے اسٹڈی روم میں گونج رہے تھے۔ باورچی آج صبح ہی دن بھر کی چھٹی لے کر گیا تھا اور رات گئے آنے کو کہہ گیا تھا۔ مالی حسب معمول باغ میں تھا، مگر میں میرے اور چچا ایوری کے علاوہ کوئی بھی تیسرا فرد نہیں تھا۔

وہاں ہر طرف میری انگلیوں کے نشانات تھے پھر بھی میں نے مناسب سمجھا کہ عملی اقدام اٹھاتے وقت کوئی ایسا ثبوت نہ چھوڑ جاؤں جو شک و شبے کا باعث بن جائے۔ چنانچہ میں باورچی خانے میں اور شفاف پلاسٹک کے وہ دستانے پہن آئی جو عموماً ہاتھوں کو گندگی سے بچانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔

اسٹڈی روم میں واپس جا کر میں نے ایک بار پھر چچا ایوری کا ٹائپ کیا ہوا اقتباس پڑھا۔

''میں زیادہ عرصے تک اس بیہودہ زندگی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے آرام اور سکون حاصل ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک سراب ہے جو بڑے بڑے خوش نما اور دلفریب منظر پیش کرتی ہے۔ مگر قریب جانے پر پتا چلتا ہے کہ فریب نظر کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بے حقیقت، بے معنی کھوکھلی اور پریشان کن زندگی گزارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بے چین اور مضطرب روح کو اگر کہیں سکون مل سکتا ہے تو وہ دوسری دنیا ہے۔ مجھے وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔ امن و سکون کی تلاش میں وہیں جا رہا ہوں ان اعزہ و احباب کے پاس جا رہا ہوں جو مجھ سے پہلے یہاں سے جا چکے ہیں۔ ان کی روحیں میرا استقبال کریں گی۔ بچھڑنے والوں سے ملاقات ہوگی۔ الوداع اے ظالم دنیا۔''

پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ اقتباس ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ ان کی غیر معمولی شراب نوشی جس کی گواہی میرے علاوہ مالی و باورچی بھی دیتے، اقتباس کو مکمل ترین بناتی تھی۔

میں نے ٹائپ رائٹر کے قریب رکھے ہوئے مسودے کے دیگر صفحات کو دیکھا۔ کہانی چچا ایوری کے مخصوص انداز میں لکھی گئی تھی۔ ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے تھے لیکن ہیروئن کی ماں، جو کہ مر چکی تھی۔ ہیرو کو سخت ناپسند کرتی تھی اور اکثر و بیشتر سوتے جاگتے میں ہیرو کے اس آگر کہتی تھی کہ وہ اس کی بیٹی کو دنیا میں حاصل نہیں کر سکے گا۔ اگر اس نے شادی کی کوشش کی تو وہ اپنی بیٹی کو لے جائے گی۔ ہیرو نے ان دھمکیوں کو خواب و خیال سمجھا اور شادی کے بعد ہنستی مسکراتی پھول جیسی ہیروئن کو گود میں اٹھا کر حجلہ عروسی میں داخل ہوا اور تب اسے پتا چلا کہ اس کی گود میں ہیروئن کی لاش ہے۔

ماں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ ہیروئن مر گئی اور سونے جاگتے میں اس کی روح ہیرو کے پاس آ کر اسے اس دنیا میں بلانے لگی جہاں وہ دونوں ایک ہو سکتے تھے۔ پس ہیرو نے مندرجہ بالا اقتباس لکھا۔

چچا ایوری کہانی میں مزید اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ یقینی طور پر یہ کہنا مشکل تھا کہ ان کا ارادہ ہیرو کو خودکشی کرانے کا تھا یا عین وقت پر ڈرامائی انداز میں بچا لینے کا۔ تاہم یہ بات یقینی کہ اب چچا ایوری کو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی خودکشی سے نہیں بچا سکتی۔ کہانی مکمل نہیں تھی لیکن حیرت ہوتی تھی کہ چچا ایوری نے کہا آگے بڑھائے بغیر اس عظیم اقتباس کا صفحہ ٹائپ رائٹر سے نکال کر بقیہ مسودے کے ساتھ کیوں رکھ دیا تھا؟ ویسے ان ادیبوں کے موڈ کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہو سکتا ہے، انہیں اتنا اچھا اقتباس پسند نہ آیا ہو اور وہ ہیرو کو کسی دوسرے طریقے پر ہیروئن کے حوالے کرنا چاہتے ہوں۔ چنانچہ اس صفحے کو نکال کر شراب کا ایک گلاس پینے کے لیے اٹھ گئے ہوں۔ مجھے ان کی وہ کہانی یاد تھی جس کی ہیروئن بھری محفل اپنے

مرے ہوئے ہیرو کی روح دیکھ کی اس کی آغوش میں چلی گئی تھی اور محفل میں موجود افراد نے اگلے ہی لمحے ہیروئن کا مردہ جسم اور فضا میں بلند ہوتے ہوئے سفید کبوتروں کے ایک جوڑے کو دیکھا تھا۔ قارئین کو وہ کہانی بے حد پسند آئی تھی۔ ممکن تھا کہ چچا ایوری اس کہانی کے ہیرو کو بھی خودکشی کے بجائے تاثراتیز طور پر سفید کبوتروں کے جوڑے کی طرح آسمان کی جانب مائل پرواز دیکھنا چاہتے ہوں لیکن یہ کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔ میں نے دستانے والے ہاتھوں سے اس اقتباس کو دوبارہ ٹائپ رائٹر میں لگا دیا اور مسودے کے دوسرے صفحات اٹھا کر گریبان میں رکھ لیے تاکہ اقتباس کا تعلق کسی کہانی سے نہ رہے۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گی کہ چچا ایوری کہانی کے مسودے پر صفحات کے نمبر ڈالنے کے عادی نہیں تھے۔ میں جب بھی ان کہانیوں کو دوبارہ ٹائپ کرنے کے لیے بیٹھتی۔ مجھے چچا کی اس خراب عادت پر بہت غصہ آتا۔ یہ علم نہیں تھا کہ ان کی یہی خراب عادت ایک روز میرے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی۔

میں جانتی تھی کہ پولیس والے سب سے پہلا شبہ کریں گے کہ اقتباس کو میں نے ٹائپ کیا ہوگا مگر میں مطمئن تھی کہ ٹائپ رائٹر کے حروف والے نشانات پر چچا ایوری کی انگلیوں کے نشانات، ٹائپ کرنے کا ارادہ اور حروف پر مخصوص قسم کے دباؤ مجھے شکوک و شبہات سے بالاتر قرار دینے کے لیے شافی و کافی ہوں گے۔

غرض ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد، میں اسٹڈی روم سے نکل کر چچا ایوری کے اس کمرے میں گئی جہاں وہ خواب آور کیپسول کا وائل رکھتے تھے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ انہیں ہمیشہ کی نیند سلانے کے لیے کتنے کیپسول مناسب رہیں گے لیکن یہ سمجھتی تھی کہ شراب میں مل کر ان کا اثر جلد ہوگا اور مہلک نشے میں وہ یہ بھی محسوس نہیں کر سکیں گے کہ ان کی شراب میں کسی چیز کی آمیزش کر دی گئی ہے۔

پس میں نے وائل کے دس کے دس کیپسول گلاس والے، نصف گلاس میں اسکاچ انڈیلی اور اسے اس وقت تک ہلاتی رہی جب تک سارے کیپسول اچھی طرح نہیں گھل گئے۔ پھر میں نے اس میں برف کے ٹکڑے ڈالے اور جائے کا چمچہ لے کر اس کا ذائقہ چکھا جو میں نے فوراً ہی تھوک دیا لیکن کچھ میں نے چکھا تھا وہ اسکاچ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اپنے لیے بھی ایک گلاس تیار کیا۔ پھر دونوں گلاسوں کو ٹرے میں رکھ کر اسٹڈی روم میں پہنچی۔

ٹرے کو میز پر رکھنے کے بعد میں نے فون اٹھایا اور چچا ایوری کے پاس گئی۔

''چچا ایوری!'' میں نے بے خبر سوئے ہوئے چچا کا کندھا ہلایا۔ ''آپ کے ایجنٹ کا فون آیا ہے۔''

انہوں نے کروٹ بدل کر ایجنٹ کو گالی دی۔ ''اس سے کہو کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد فون کرے۔''

یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ورنہ خواہ مخواہ مجھے وضاحت کرنا پڑتی کہ ایجنٹ نے کچھ دیر انتظار کر کے ریسیور رکھ دیا ہوگا۔ میں نے فون کو اس کی جگہ پر رکھا اور چچا ایوری کے پاس جا کر انہیں بیٹھنے میں مدد دی۔

''کھانے میں ابھی تقریباً نصف گھنٹے کی دیر ہے۔'' میں نے ان کی طرف شراب کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آج سارا کام مجھے کرنا پڑ رہا ہے۔''

''خدا کی قسم'' انہوں نے گلاس لے کر کہا۔ ''یہ کام تم نے سب سے اچھا کیا ہے۔ مجھے اسکاچ کی شدید ترین پیاس محسوس ہو رہی تھی۔''

''شکریہ چچا ایوری!'' میں نے کہا اور انہیں پورا گلاس حلق سے نیچے اتارتے دیکھتی رہی..... اور تب اچانک میرے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی میں بکھرنے لگی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگی۔ میں نے چچا ایوری کو قتل کر دیا تھا۔ یوں لگنے لگا تھا جیسے میرا دل حلق کے راستے باہر نکل آئے گا۔ مجھے پیاس لگنے لگی اور میں تیزی سے اپنے گلاس کی طرف بڑھی۔ میرے ہاتھ اتنے زور زور سے لرز رہے تھے کہ مجھے گلاس اٹھا کر منہ تک پہنچانا دشوار ہو گیا۔

چچا ایوری نے میری حالت پر غور نہیں کیا۔ ''اچھی لڑکی!'' انہوں نے کہا۔ ''مجھے ایک گلاس اور پلا دو۔''

مگر میں چاہتی تھی کہ وہ جو کچھ پی چکے ہیں۔ اس کے اثرات میں کوئی دوسرا گلاس دخل انداز نہ ہو۔ ''آل رائٹ'' میں نے کہا۔ ''میری آواز کانپ رہی تھی۔'' آپ آرام سے لیٹ جایئے۔ میں ابھی ایک منٹ کے اندر آپ کے لیے دوسرا گلاس لے آؤں گی۔''

میں نے جلدی سے اپنے حصے کا گلاس حلق میں انڈیلا پھر آگے بڑھ کر انہیں لیٹنے میں مدد دی۔ انہوں نے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور گہرے سانس لیتے ہوئے بولے۔ ''اچھی لڑکی! تم بہت اچھی لڑکی ہو۔''

اس وقت خود مجھے بھی دوسرے گلاس کی ضرورت محسوس ہونا شروع ہوگئی تھی۔ چچا ایوری نے آنکھیں بند کرلیں اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے دوبارہ خراٹے لینا شروع کردیے مگر اس مرتبہ ان کے خراٹوں کی آواز قدرے مختلف تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شخص ان کا گلا دبا رہا ہوں۔ شراب کی مزید خواہش ہونے کے باوجود میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اپنی خواہش کو پورا کیا جائے۔ میں دماغ کو صاف ستھرا رکھنا چاہتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر پلاسٹک کے دستانے پہنے۔ چچا ایوری کے گلاس سے اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے اور بے خبر سوتے ہوئے چچا کے ہاتھ میں کئی مرتبہ اس گلاس کو تھما کر بڑی احتیاط سے ان کے سرہانے والی میز پر رکھ دیا۔ یہی کام میں نے خواب آور کیپسول کے وائل کے ساتھ کیا لیکن وائل کو میز پر رکھنے کے بجائے فرش پر ڈال دیا۔ سب سے آخر میں، میں نے ایک نظر ٹائپ رائٹر میں لگے ہوئے خودکشی کے اعتراف پر ڈالی اور دائیں ہاتھ سے گریبان رکھے ہوئے مسودے کو تھپتھپا دیا۔

اور میرا کام ختم ہوگیا۔ صرف مسودے کو جلانا باقی تھا۔ کوئی اور ایسا کام نہیں رہا تھا جو مجھے انجام دینا ہو۔ میں نے غور کیا، خوب اچھی طرح غور کیا ہر کام خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔ پس میں نے باورچی خانے میں جاکر کہانی کا مسودہ جلا دیا۔ مسودے کی راکھ کو پانی کو تیز دھار سے بہادیا اور مطمئن ہوکر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سونے نہیں گئی تھی بلکہ کچھ دیر ریلیکس کرچاق و چوبند رہنے اور وقت کو گزرتے ہوئے دیکھنے اور یہ سوچنے کے لیے گئی تھی کہ میں نے کسی چیز کو نظر انداز تو نہیں کردیا ہے۔

☆☆☆

سب لوگ چلے گئے۔ سارے ماہرین اور سارے پولیس والے رخصت ہوگئے لیکن پولیس کا چیف ہیل بروک میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے وہیں ٹھہر گیا۔

''مسز مارلین!'' اس نے پیار بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے چچا کی خودکشی کی وجہ سے جس صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کے اثرات کو کچھ کم کردوں۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ آہستہ آہستہ تمہیں صبر آجائے گا۔ زیادہ اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں کوئی شخص بھی ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

میں نے غصے سے اپنے دانت پیسے اور غم زدہ آواز بنا کر کہا۔ ''آپ درست فرمارہے ہیں مسٹر ہیل بروک! مگر چچا ایوری ایسے لوگوں میں نہیں جنہیں آسانی سے بھلایا جاسکے۔ ماں باپ اور شوہر کی موت کے بعد وہ واحد انسان تھے جن کے پاس مجھے محبت ملی تھی۔ آخر ایسا کون سا غم تھا جس نے پہلے انہیں حد سے زیادہ شراب نوشی کی طرف راغب کیا اور آخر خودکشی پر مجبور کردیا۔''

اس نے میرے کندھے کو تھپکا۔ ''صبر کرو۔ مسز مالین! صبر کرو۔''

میں نے بمشکل اپنی ایک آنکھ میں آنسو لا کر دوسری خشک آنکھ کو مسلتے ہوئے کہا۔ ''کیسے صبر کروں؟''

وہ بولا۔ ''مجھے بتاؤ کہ خودکشی کرنے سے قبل تمہارے چچا کس قسم کے حالات گزر رہے تھے؟''

دل ہی دل میں میں نے چیف کو اور بتایا کہ چچا ایوری اپنی کامیابی سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بھوتوں چڑیلوں اور روحوں کی کہانیاں لکھنے کے بجائے ایسی ادبی کہانیاں لکھیں جو انہیں زندہ جاوید بنا دیں مگر ان کے پبلشرز انہیں مجبور کرتے کہ وہ اس قسم کی کہانیاں لکھتے رہیں۔ ان کا ایجنٹ کہا کرتا تھا کہ قارئین کی پسند کو ہر حال میں مقدم سمجھنا چاہیے۔ ادبی کہانیاں نہ

لکھنے کا غم آہستہ آہستہ انہیں چاٹتا رہا۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ ان کے غم کا کوئی دوسرا سبب نہیں تھا۔ وہ رات دن نشے میں دھت رہنے لگے۔ پھر بھی سکون نہیں ملا تو گزشتہ شب انہوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ رات کو جب میں ان سے کھانے کی درخواست کرنے گئی تھی وہ اچھے بھلے تھے۔ انہوں نے کھانے سے انکار کردیا۔ انہیں جب کبھی رات گئے تک کام کرنا ہوتا تھا وہ رات کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''اچھی لڑکی! تم بہت اچھی لڑکی ہو۔'' مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ یہ الفاظ ہیں جو میں آخری بار سن رہی ہوں۔ صبح کو جب ان کے کمرے میں پہنچی تو وہ مجھے یکہ و تنہا چھوڑ کر جاچکے تھے اور ٹائپ رائٹر میں لگا ہوا کاغذ بتا رہا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں موت کو گلے لگالیا ہے۔''

چیف کے ہاتھ میں ٹائپ رائٹر سے نکالا ہوا چچا ایوری کا اعتراف نامہ موجود تھا۔ اس نے اعتراف نامے کو بڑی احتیاط سے سفید پلاسٹک کے لفافے میں رکھ لیا تھا۔ میرا آخری جملہ سن کر اس نے اس پر نظر ڈالی اور ایک بار پھر اسے بغور پڑھا۔ پھر میرے چہرے کو گھورنے لگا۔

میں تلملا کر کہا۔ ''اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اسے میں نے ٹائپ کیا ہے تو آپ بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ چچا ایوری سے مجھے محبت تھی محبت ہے اور وہ محبت مرتے دم تک باقی رہے گی۔''

وہ سر کھجانے لگا۔ ''میں تم پر شبہ نہیں کررہا ہوں مسز مالین! اس کاغذ کو یقیناً تمہارے چچا ہی نے ٹائپ کیا ہوگا مگر ایک بات ہے جو خاص طور پر مجھے پریشان کررہی ہے۔''

میں نے اپنے آپ کو اس کا حملہ روکنے کے لیے تیار کرلیا اور بھولا سا منہ بنا کر بولی۔ ''ایسی کون سی بات ہے جو آپ کو پریشان کررہی ہے چیف؟''

ان کی نظریں ایک مرتبہ پھر میرے چہرے پر جم گئیں۔ ''تمہارے چچا کا خط۔'' اس نے کہا۔ ''وہ ایسا آدمی نہیں ہے جسے کوئی شخص خودکشی کرنے سے قبل تحریر کرے۔ اس ضرورت سے زیادہ ضائع بدائع کا

غلط فہمی

ایک صاحب نے اپنی بیوی سمجھ کر غلطی سے ایک راہ چلتی خاتون کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر فوراً ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ بے حد شرمندہ ہوئے اور جلدی سے خاتون کا ہاتھ چھوڑ کر بولے۔

''معاف کیجیے گا محترمہ! محض غلط فہمی کی بنا پر میں آپ کو اپنی بیوی سمجھ بیٹھا تھا۔''

''قسمت پھوٹ گئی ہوگی اس عورت کی، جسے تم جیسا بے وقوف اور بدصورت شوہر نصیب ہوا..... کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے۔ کالا منہ، فضول قسم کے کپڑے اور آنکھیں تو ایسی ہیں جیسے نشہ پیا ہو۔''

''خدا کی قسم محترمہ! آپ کی صورت ہی نہیں بلکہ گفتگو بھی میری بیوی جیسی ہے۔'' صاحب نے انتہائی حیرت سے جواب دیا۔

وجہ

رپورٹر: ''آپ کے شوہر کی موت کیسے ہوئی؟''

بیوی: ''زہر کھانے سے.....''

رپورٹر: ''لیکن جسم پر یہ نشان کیسے ہیں؟''

بیوی: ''کھا نہیں رہا تھا..... تو.....''

☆☆

ایک پاکستانی نے اپنے چائنیز انجینئر کو کھانے کے بعد جلیبی پیش کی تو وہ رونے لگا۔ پاکستانی پریشان ہوگیا اور اس نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟ روتے کیوں ہو؟''

اس پر چائنیز نے جلیبی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

''یہ تو لکھا ہے کہ آپ کی ماں کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔''

لاٹری

شوہر بیوی سے کہتا ہے۔ ''فرض کرو تمہاری ایک کروڑ کی لاٹری لگ جائے اور اسی دن مجھے کوئی اغوا کرلے اور تم سے ایک کروڑ تاوان مانگ لے تو تم کیا کروگی؟''

بیوی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ناممکن! ایک دن میں دو دو لاٹریاں لگ ہی نہیں سکتیں۔''

استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ اس قسم کا خط ہے عموماً ظلموں کے ہیرو لکھا کرتے ہیں۔"

میں نے کہا" چچا ایوری ادیب تھے۔ وہ عبارت آرائی کے اتنے زیادہ عادی ہو گئے تھے کہ روزمرہ کی گفتگو بھی اسی طرح کرتے تھے۔ غالباً وہ سوچتے بھی اسی طرح تھے۔ ان کی شخصیت اور عادت کو مدنظر رکھا جائے تو خط میں کوئی انوکھی اور پریشان کرنے والی بات نہیں ہے۔ طرز تحریر وہی ہے جو ان کی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔"

"ہوں۔" وہ بولا۔ "میں طرز تحریر یا عبارت آرائی وغیرہ سے زیادہ واقف نہیں، خصوصاً ان کہانیوں سے جنہیں تمہارے چچا لکھتے تھے، مجھے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ میری بیوی اس قسم کی کہانیاں پسند کرتی ہے۔ مجھے سراغرسانی کی کہانی اچھی لگتی ہیں۔ دراصل ان کہانیوں کا تعلق میرے پیشے سے ہوتا ہے اور مجھے ان سے ہمیشہ بڑے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔"

میرے ہونٹوں پر بچھی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہنا چاہیے۔

وہ ٹہلتا ہوا چچا ایوری کے ڈیسک تک گیا اور زردی مائل سادے کاغذوں پر جن پر کہانیوں کے مسودے تیار کیے جاتے تھے جھک گیا۔ پھر اس نے ایک مکمل ٹائپ شدہ کہانی کے کاغذات اٹھائے۔" کبھی کبھی آنکھیں دھوکا بھی دے جاتی ہیں۔" اس نے کہا اور ٹائپ شدہ کہانی کا اقتباس پڑھ کر بولا۔" ہاں طرز تحریر تو وہی ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جس تحریر کو ہم نے خودکشی کا اعتراف سمجھ لیا، وہ حقیقت میں تمہارے چچا کی کسی نئی کہانی کا حصہ ہو؟"

میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجتے ہوئے چیلنج کیا۔

"سراغرساں کی اولاد! ثابت کر کے دکھاؤ۔" مگر میرے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنی ہتھیلیوں کو اسکرٹ کے دامن سے صاف کیا۔

وہ مسکراتا ہوا ٹائپ رائٹر کی طرف بڑھا۔ ایکا یکی اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے سادے کاغذات میں سے ایک کاغذ کھینچ کر ٹائپ رائٹر میں لگایا اور اپنی ایک انگلی سے اس نے کچھ حروف کو دبا دیا۔ اس نے بغور ٹائپ شدہ حروف کو دیکھا۔ پھر مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنے ٹائپ کیے ہوئے حروف والا کاغذ ٹائپ رائٹر سے باہر نکالا اور اس کا موازنہ چچا ایوری کے اعتراف نامے سے کیا۔

چیف کی حرکات اتنی بچکانہ تھیں کہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ غالباً وہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ چچا کا اعتراف نامہ کسی دوسرے ٹائپ رائٹر پر تیار کیا گیا ہے۔

وہ میری طرف بڑھا اور کچھ کہے بغیر اس نے چچا ایوری کا اعتراف نامہ اور اپنا ٹائپ کیا ہوا کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ اچانک میری رگوں میں خون جم گیا۔ میں سر سے پاؤں تک برف بن گئی۔ چیف نے جو حرف ٹائپ کیے تھے وہ یہ تھے۔

"میں اپنے چچا کی قاتل ہوں۔"

"میں نے کمزور اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی چیف!"

لیکن میں اس کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ میں نے اپنے بے پناہ جوش خروش کے باعث ایک اہم ترین بات کو فراموش کر دیا تھا۔ چیف کے ٹائپ شدہ حروف میری نگاہوں میں ناچ رہے تھے۔ میرا منہ چڑا رہے تھے اور میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ مجھ پر جاڑا چڑھ گیا تھا۔ جسم کا ایک حصہ بھی میرے قابو میں نہیں رہا تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں مسز مارلین! یہ اقتباس تمہارے چچا ہی نے لکھا تھا لیکن یہ اس کہانی کا حصہ ہے جسے وہ لکھ رہا تھا اور جسے تم نے ضائع کر دیا ہوگا۔ میں نے آج تک ایسا خودکشی کرنے والا نہیں دیکھا جو پہلے تو خودکشی کے اعتراف کا خط تحریر کرے پھر ٹائپ رائٹر کا ربن تبدیل کر دے۔"

چیف درست کہہ رہا تھا۔ چچا ایوری نے کہانی اس لیے نامکمل چھوڑ دی تھی کہ ربن ناقص تھا۔ پہلے انہوں نے کاغذ نکال کر نیا ربن لگایا۔ پھر ستانے کے لیے لیٹ گئے۔ چچا اور چیف کی تحریروں کا فرق میرے سامنے تھا اور ہوش وحواس میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

☆☆

دل پھینک روح

نوازش شاہین

تجسس انسانی سرشت میں داخل ہے۔ ایک نوجوان جوڑے کا قصہ انہوں نے ایک مکان لے لیا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس میں کیا اسرار پوشیدہ ہے۔ وہ بے چارے تو اپنی زندگی کے خوشگوار دن گزارنا چاہتے تھے مگر ایسا لگتا نہیں تھا۔ ایک دن جب بیوی ضروری کام سے گئی ہوئی تھی کہ.....

اگر آپ بھی کرائے پر مکان لینے والے ہیں تو ٹھہریے، پہلے یہ کہانی پڑھ لیں

مکان دیکھ کر جمشید اور عینی دونوں کو بہت خوشی ہوئی۔ بالکل ان کے آئیڈیل کے مطابق شہر سے الگ تھلگ بنا ہوا تھا۔ مکان کے گرد چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا۔ کانٹوں دار تار کی باڑھ تھی۔ اس میں پھاٹک تھا۔ اندر قدیم طرز کا فرنیچر تھا۔ بڑی بڑی وکٹورین عہد کی کرسیاں میزیں تھیں۔ چھتری دار جہاز جیسے مسہری تھی جس کے چاروں طرف جال کی پردے ابھی تک تھے۔ اگرچہ وہ پھٹنے لگے تھے اور خوشی کی بات یہ تھی کہ مکان کے اندر اور باہر صفائی بھی تھی۔ باغ میں گھاس اور روشیں ترشی ہوئی تھیں جن پر رنگ برنگے پھول کھل رہے تھے۔ اندر گرد بالکل نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پراپرٹی ایجنٹ نے مکان کی دیکھ بھال اور صفائی کا معقول بندوبست کیا ہے۔

ایک نظر دیکھتے ہی جمشید اور عینی نے مکان کرایہ پر لے لیا۔ شرط کے مطابق ایجنٹ نے ایک سال کا کرایہ پیشگی لیا اور ہاتھوں ہاتھ رسید بنا کر اس کے ہاتھ میں دے دی اور کنجیاں بھی ان کے حوالے کر دیں۔ دو ہزار روپے مہینہ پر اتنا بڑا آراستہ و پیراستہ مکان۔ جمشید اور عینی کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پراپرٹی ایجنٹ کو لوٹ رہے ہوں۔

پراپرٹی ایجنٹ چلا گیا تو جمشید نے عینی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''ڈارلنگ! میں حیران ہوں کہ اتنا خوب صورت اور اتنے سستے کرائے کا مکان ابھی تک خالی کیسے پڑا رہ گیا؟''

''شاید اس لیے کہ یہ شہر سے باہر ہے۔'' عینی نے جواب دیا۔ ''شہر سے باہر اس سنسان علاقے میں تو ہم جیسے دو پاگل آرٹسٹ ہی رہ سکتے ہیں۔ کیا تم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنا اپنا اسٹوڈیو کہاں بنائیں گے؟''

''کیا تم الگ اسٹوڈیو بنانا چاہو گی؟''

''مکان چھوٹا ہوتا تو ضرورت نہیں تھی۔

''لیکن اب جبکہ ہمارے پاس بہت سے کمرے فاضل ہیں تو الگ الگ اسٹوڈیو بنانے میں کیا دشواری ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے شوخ نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ ''البتہ جب ہمارے ایک درجن بچے ہو جائیں گے اور سارے کمرے بھر جائیں گے تو پھر ہم ایک ہی کمرے میں اپنے اسٹوڈیو لے آئیں گے۔''

اس پر دونوں نے قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر یوں ہی دونوں کمرے میں گھومتے رہے پھر عینی نے کہا۔

''گھر کی صفائی کرنے والی رشیدن اوپر کونے والے کمرے میں رہ لے گی۔ باورچن صغرا نیچے باورچی خانے کے برابر والے کمرے میں ٹھیک رہے گی۔''

''یہ سوچنا اب تمہارا ہے کہ کون کس کمرے میں رہتا ہے۔'' جمشید نے کہا۔ ''اب تم اس گھر کی مالک ہو۔ مجھے تو تم صرف یہ بتا دو کہ ہماری خواب گاہ کون سی ہو گی؟''

''واہ، یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے۔''

''بڑی مسہری والا کمرہ ہماری خواب گاہ ہو گا۔ میں اس کمرہ میں اپنا ماڈرن فرنیچر لگانا پسند نہیں کروں گی۔ کمرہ کا کلاسیکی کارپٹ خراب ہو جائے گا البتہ ڈرائنگ روم اور ڈائننگ ہال کو میں ضرور ماڈرن بناؤں گی، ان کا پرانا فرنیچر ہم اسٹور میں بند کر دیں گے۔''

''گڈ آئیڈیا!'' جمشید نے کہا۔ ''اس مکان میں ہماری قدیم تہذیب کا ''فلیور'' چھایا ہوا ہے، جو مجھے بہت پسند ہے یقیناً یہ مکان کسی معزول راجہ کا ہے یا کسی بڑے زمیندار کا......''

''کیا تم نے پراپرٹی ایجنٹ سے نہیں پوچھا کہ یہ مکان کس کا ہے؟''

''یاد ہی نہ رہا۔''

''خدا جانے ہم سے پہلے کون اس مکان میں رہتا ہو گا۔'' عینی نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''پراپرٹی ایجنٹ کہہ رہا تھا ہماری ہی طرح ایک نوجوان جوڑا اس مکان میں تین مہینہ رہا تھا۔ پھر مہینے کا کرایہ چھوڑ کر اچانک کہیں چلا گیا۔ چلو اب واپس چلیں۔ میں چاہتا ہوں شام تک ہم ا...

...ان لے کر مکان میں آ جائیں۔''

''ہاں چلو۔'' وہ دونوں چل پڑے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اچانک عینی نے رکتے ہوئے کہا۔

''جمشید! میں کبھی کبھی سوچتی ہوں یہ راجہ نواب ...بیویوں کو کس طرح پیار کرتے ہوں گے کیونکہ وہ تو ...ر کے پتلے ہوئے تھے۔ ذرا تم تصور میں خود کو ایک ...شاہ سمجھ کر مجھے شاہانہ انداز میں پیار تو کرو۔''

''آل رائٹ ڈارلنگ!'' جمشید نے مسکرا کر ...ہا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور ذرا اکڑ کر فلم مغل اعظم کے ...کی طرح ڈائیلاگ بولتے ہوئے آگے بڑھا۔

''مہارانی! اس وقت مابدولت کا دل آپ کو ...کرنے کو چاہ رہا ہے۔ ذرا اپنے لب لعلیں آگے ...یہ قبول فرمائیں۔''

''ونڈر فل...... ونڈر فل......'' عینی تالیاں بجا ...کر بچوں کی طرح اچھلنے لگی اور پھر اس نے آگے ...کر بچوں کی طرح اچھلنے لگی اور پھر اس نے آگے ...کر اپنی بانہیں جمشید کے گلے میں ڈال کر کہا۔

''کنیز آپ کے ایک بوسے کو کب سے ترس ...ی ہے عالم پناہ! لیکن ظل الٰہی کو دوسری بیگمات سے ...ت ملے تو کنیز کی جانب توجہ فرمائیں۔''

اس پر پھر دونوں نے قہقہہ لگایا اور مکان سے ...آ گئے۔

☆☆☆

تین ماہ جیسے پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ جمشید اور ...ی کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ دونوں مشہور آرٹسٹ ...۔ اتنی آمدنی تھی کہ عیش کے ساتھ زندگی گزارتے ...۔ دیکھ بھال کے لیے دو نوکرانیاں تھیں۔ مکان ...ب صورت تھا۔ انہوں نے ہنی مون گلمرگ میں منایا ...لیکن اس مکان میں گزرتے ہوئے تین مہینے بھی ہنی ...ن ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے لیکن تین مہینے ...اچانک ایک ایسا سانحہ پیش آ گیا جس نے انہیں ...مون کے خواب سے جھنجوڑا۔ ہوا یہ کہ تین مہینے بعد ...کو ٹیلی گرام ملا، اس کی ماں سخت بیمار ہے۔ عینی گھبرا ...رونے لگی۔ جمشید نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''حوصلہ رکھو عینی! اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ سب بیمار پڑتے ہیں، تمہاری ممی بھی اچھی ہو جائیں گی۔ اگر دل زیادہ گھبرا رہا ہے تو کچھ دن کے لیے اپنی ممی کے پاس رہ آؤ۔''

''ہاں، میں جانا چاہتی ہوں۔'' عینی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مگر کیا تم اکیلے رہ لو گے؟''

''تمہارے بغیر میرا دل تو نہ لگے گا لیکن مجبوراً انسان ہر دکھ برداشت کر لیتا ہے۔ ویسے تم جانتی ہی ہو میری دیکھ بھال کے لیے صغرا اور رشیدن کافی ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔ میں آج شام ہی چلی جاتی ہوں۔''

اسی شام جمشید عینی کو اس کے میکے میں چھوڑنے چلا گیا۔

جمشید سسرال میں تین دن رہا۔ جب عینی کی ماں کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی تو جمشید نے کہا۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تم ایک آدھ ہفتہ اور رہ لو۔ ممی کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے تو آ جانا۔''

''تھینکس ڈیئر!'' عینی نے جمشید کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اپنی صحت کا خیال رکھنا اور یہ یقین رکھنا کہ میں یہاں تمہاری یاد میں تڑپتی رہوں گی۔''

''مجھے یقین ہے ڈارلنگ!'' یہ کہہ کر جمشید نے اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔

☆☆☆

تین دن بعد جمشید گھر پہنچا۔

پہلی چیز گھر میں قدم رکھتے ہی جو اس نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ دونوں نوکرانیوں کے چہرے پھولے ہوئے تھے اور وہ کچھ خوف زدہ سی معلوم ہو رہی تھی۔

اس نے اٹیچی کیس نیچے ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے رشیدن! صغرا! تم دونوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

دونوں نوکرانیوں نے ایک بار ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر رشیدن سے بولی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے بابو جی! اگر اب ہم دونوں نوکری کرنا نہیں چاہتیں۔'' جمشید نے حیرت سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہیں کم تنخواہ کی شکایت ہے۔ یہاں تو کام بھی بہت زیادہ نہیں اور ہم دونوں نے تمہیں نوکر بھی نہیں سمجھا۔''

''یہ سب ٹھیک ہے بابو جی! ہمیں نہ آپ سے، نہ بی بی جی سے کوئی شکایت ہے۔ نہ تنخواہ کم ہے۔ لیکن ہم اس مکان میں نہیں رہ سکتے۔''

''کیوں نہیں رہ سکتیں۔ کیا میرے جانے کے بعد یہاں چور آئے ہیں؟''

''نہیں، چور تو نہیں آئے۔''

''پھر کیا بات ہے، صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''کیا اس مکان میں بھوت رہتا ہے جس سے تم ڈر گئی ہو؟''

دونوں نوکرانیوں نے پھر ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر صغرا نے کھنکار کر کہا۔

''ہاں بابو جی! ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، اس مکان میں بھوت رہتے ہیں۔''

یہ سن کر جمشید خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ دونوں نوکرانیاں اسے عجیب نظروں سے دیکھتی رہیں۔ بہت دیر کے بعد جب جمشید نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور آنکھوں سے پانی صاف کرتے ہوئے بولا۔

''بھئی واللہ! یہ بھی ایک ہی رہی۔ اس مکان میں اور بھوت۔ ہمیں تین مہینے رہتے ہوئے ہو گئے اور ایک بھوت صاحب سے ملاقات کر لی۔'' پھر مذاق کے انداز میں آواز دبا کر اور آنکھ مار کر بولا۔ ''یہ بتاؤ بھوت مرد ہے یا عورت۔ اگر عورت ہے تو کیا خوب صورت ہے اور اگر واقعی خوب صورت ہے تو عینی کے آنے تک میں اسی سے اپنا دل بہلاؤں گا۔''

صغرا نے پھر کھنکار کر کہا۔

''بابو جی یہ مذاق نہیں۔''

''میں بھی سنجیدہ ہوں۔'' جمشید نے سنجیدگی سے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''بائی گاڈ میری بچپن سے دو بیویاں رکھنے کی خواہش ہے۔ ایک انسان بیوی اور ایک بھوت بیوی۔''

اس بار رشیدن نے گمبھیر لہجہ میں کہا۔

''بابو جی! آپ ہماری بات کو مذاق نہ سمجھیں۔ آپ کے سونے کے کمرے میں ضرور کوئی بھوت رہتا ہے۔ جس دن آپ اور بی بی جی گئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا بی بی جی! اپنے سب کپڑے الماری میں ٹانگ گئی تھیں۔''

''ہاں۔'' جمشید نے سر ہلایا۔

''اس رات اچانک ہم نے آپ کے کمرے سے ایسی آوازیں سنیں جیسے کوئی اندر چل رہا ہو۔ کپڑوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کرسی گھسیٹنے کی آواز، کبھی قدموں کی چاپ۔ ہم دونوں ڈر سے اس رات ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔ یہ آوازیں سن کر ہم دونوں اور زیادہ ڈر گئے۔ اس وقت کمرے میں جا کر دیکھنے کی ہمیں ہمت نہ ہوئی لیکن جب ہم نے صبح کو جا کر کمرے میں دیکھا تو بی بی جی کا نائٹ گاؤن مسہری پر پڑا تھا۔ چادر اس طرح سکڑی تھی جیسے کوئی اس پر سویا ہو اور کرسی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے نہیں تھی۔''

جمشید ماڈرن دنیا کا آدمی تھا۔ سائنس کا اسٹوڈنٹ بھی رہ چکا تھا۔ وہ بھوت پریت یا روحوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔

''پھر تو ضرور کوئی چور گھر میں گھس آیا ہوگا اور کمرہ خالی دیکھ کر سو گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی عورت چور ہو۔''

''نہیں بابو جی! وہ چور نہیں تھا۔'' رشیدن بولی۔

''پہلے ہم بھی یہی سمجھے تھے کہ چور ہوگا۔ دوسرے دن ہم نے بی بی جی کے کپڑے نہ کر کے الماری میں لٹکا دیے۔ بستر کی چادر صاف کر دی، کرسی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اس کی جگہ رکھ دی۔ اسی رات پھر ویسی ہی آوازیں ساری رات آتی رہیں اور ہم دونوں سہمے پڑے رہے۔ پھر دوسری صبح جب ہم نے آپ کی خواب گاہ میں جا کر دیکھا تو سچ مانیے میں تو بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس بار بھی کمرے کا وہی عالم تھا۔ اس پر بی بی جی

کی سلیپنگ سوٹ میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ نیچے گرا تھا۔ ان کا گون کرسی پر رکھا ہوا تھا۔ بستر پر بھی اس طرح سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں جیسے کوئی ساری رات کروٹیں لیتا رہا ہو۔''

''کیا تم سارے دروازے بند کر کے سوئی تھیں۔''

''جی ہاں، کل تیمارداں تھا۔ بی بی جی کے کپڑے استری کر کے الماری میں رکھ دیے تھے۔ سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں، پھر ویسی ہی آوازیں ساری رات آتی رہی ہیں اور آج ہم نے ڈر کے مارے اس کمرے میں جا کر بھی نہیں دیکھا۔ آپ کو اگر ہماری بات کا یقین نہیں تو چل کر دیکھ لیجیے۔''

جمشید نے کچھ سوچ کر کہا۔

''آل رائٹ۔ چلو میں دیکھتا ہوں، وہ کیسا بھوت ہے؟''

وہ تینوں خواب گاہ کے دروازے تک آئے۔ صغرا اور رشیدن ڈر کے مارے اس کے پیچھے ہو لیں۔ جمشید نے دروازہ جھٹکے سے کھول دیا۔

کمرے کا منظر دیکھ کر وہ بھی جھجک گیا۔

واقعی کمرے کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے رات کو وہاں کوئی سویا ہو۔ عینی کے وہ جوڑے کپڑے فرش پر پڑے تھے اور کپڑوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے انہیں پہنا ہو۔ سلیپنگ سوٹ مسہری پر ہی پڑا تھا۔ مسہری کی چادر میں بھی سلوٹیں تھیں اور عینی کا گاؤن الماری کے بجائے مسہری کے تکیے پر پڑا تھا۔ کرسی کا رخ بھی بدلا ہوا تھا۔

جمشید کچھ دیر کمرے کو دیکھتا رہا پھر دونوں نوکرانیوں کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا روز اسی طرح کمرہ ہوتا ہے؟''

''جی ہاں۔''

جمشید نے سوچا۔ ضرور یہ ان دونوں نوکرانیوں کی شرارت ہے۔ وہ دونوں یہاں سے چلے جانا چاہتی ہیں لیکن نوکری چھوڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں اس لیے انہوں نے یہ کہانی گھڑی ہے۔

اس نے اپنے شک کا اظہار کیا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے کھڑکیاں دیکھیں سب کھڑکیاں اندر سے بند تھیں جس سے یہ ناممکن تھا کہ کھڑکی کے راستے کوئی کمرے میں آیا ہو۔ پھر اس نے مزید تسلی کے لیے نوکرانیوں سے کہا۔

''اچھا تم اس کمرے کو ٹھیک کر دو میں آتا ہوں۔''

انہیں کام پر لگا کر جمشید نے سارے گھر کا چکر کاٹا، ایک ایک کھڑکی ایک ایک دروازہ دیکھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ رات کو کوئی باہر سے اندر تو نہیں آ گیا۔ ہر کھڑکی اور ہر دروازہ اندر سے بند تھا۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ یہ نوکرانیوں کا اپنا کھیلا ہوا ڈرامہ ہے۔ وہ نوکری چھوڑنے کے لیے یہ بہانہ بنا رہی ہیں۔ اس نے سوچا۔

مجھے عینی کے آنے تک انہیں کسی طرح روکے رکھنا ہے، عینی واپس آ کر خود انہیں سنبھال لے گی۔

یہ سوچ کر اس نے دونوں نوکرانیوں کو بلا کر کہا۔

''سنو رشیدن اور صغرا! اب میں آ گیا ہوں تمہیں کسی بھوت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کمرے میں رہوں گا، تمہیں اکیلے میں اس کمرے میں جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ پھر بھی تم نوکری چھوڑنا چاہو تو عینی کے آنے تک انتظار کرو۔ عینی آ جائے گی تو دوسری نوکرانیوں کا بندوبست کر کے تمہیں چھٹی دے دے گی۔''

جمشید نے محسوس کیا کہ دونوں کو یہ تجویز پسند نہیں آئی لیکن انہوں نے جمشید کی بات مان لی۔

☆☆☆

شام تک جمشید اس بات کا بھول چکا تھا۔ آٹھ بجے تک وہ اسٹوڈیو میں کام کرتا رہا۔ ساڑھے آٹھ بجے کھانا کھا کر حسب معمول ٹہلنے نکل گیا۔ دس بجے واپس آیا، ایک گلاس دودھ پیا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ کھلتے ہی اسے نوکرانیوں کی بات یاد آئی۔ دروازہ کھولتے ہی اسے توقع تھی کہ صبح جیسی بے ترتیبی کا منظر ہوگا لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ ہر چیز اپنی

جگہ قرینے سے رکھی تھی۔ بستر صاف تھا۔ کپڑوں کی الماری بند تھی۔ وکٹورین عہد کی کرسی اپنی جگہ رکھی تھی۔

سیٹی بجاتے ہوئے اس نے لباس تبدیل کیا۔ نائٹ بلب روشن کیا اور بستر پر لیٹ گیا اور دس پندرہ منٹ میں ہی سو گیا۔

پھر نجانے کس وقت اس کی آنکھ کھل گئی' کچھ دیر وہ چت پڑا چھت کو تکتا رہا اور سوچتا رہا۔

میری آنکھ کیوں کھلی۔ کیا میں نے کوئی آواز سنی تھی۔

''سر......ر......ر''

واقعی ایک آہٹ ہوئی، اس نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا۔

مدھم روشنی میں وہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا، خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا لیکن کپڑوں کی الماری کا دروازہ کھلا تھا۔ جبکہ الماری میں وہ اپنے کپڑے لٹکا کر دروازہ بند کر کے سویا تھا۔ شاید میں ہی بھول گیا ہوں گا۔ اس نے دل کو تسلی دی لیکن کرسی آبنوس کی منقش کرسی ٹیڑھی تھی۔ کرسی کا رخ شیشے کے بجائے اس کی طرف تھا جبکہ اس نے کرسی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کرسی کا رخ آئینے کی طرف تھا۔

''یا خدا! یہ کیا اسرار ہے۔'' اس نے کہا۔ پہلی بار اسے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔

پھر اس کی نظر الماری پر جم کر رہ گئی۔ کھلے دروازے سے وہ سارے کپڑے دیکھ سکتا تھا۔ رات کو جب اس نے کپڑے لٹکائے تھے، عینی کا نائٹ گاؤن جو مور کے پنکھوں جیسے ڈیزائن کا تھا، سامنے لٹکا ہوا تھا اب وہ گاؤن وہاں نہ تھا۔

اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ خود بخود ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلک آئے۔ پہلی بار خوف کی سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی سے نکل کر سارے جسم میں دوڑ گئی۔

وہ سائنس کا آدمی تھا۔ مافوق الفطرت چیزوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن اس وقت سائنس وغیرہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ سوچنے لگا۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

پھر وہی آواز کمرے میں پھیلی۔

''سر......ر......ر......ر......''

جیسے کپڑا سرسرایا ہو۔ اس نے جلدی سے آواز کی طرف دیکھا۔ آواز کرسی کی طرف سے آئی تھی اور اچانک جمشید کو ایسا محسوس ہوا، جیسے اس کی سانس رک جائے گی۔ اس کے سارے جسم میں دہشت کی پھریریاں دوڑ گئیں۔

وکٹوریہ عہد کی بڑی سی منقش آبنوسی کرسی خالی تھی لیکن کرسی کے دستے سے باہر ایک انسانی کہنی اس طرح باہر نکلی ہوئی تھی، جیسے کوئی شخص کرسی میں بیٹھا ہوا اور اس نے ہاتھ دستے پر رکھ لیا ہو۔

عجیب بات یہ تھی کہ کہنی پر جو آستین تھی، وہ عینی کے اس گون کی آستین تھی جس پر مور کے پنکھوں جیسی شوخ ڈیزائننگ تھی

اگر کوئی دوسرا شخص اس وقت جمشید کو دیکھتا تو ضرور حیران ہوتا کیونکہ اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید پڑ چکا تھا۔

اچانک جمشید اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''کون ہے......کرسی پر......کون ہے؟''

اس کے اٹھتے ہی کہنی غائب ہو گئی۔

جمشید نے آنکھیں ملیں۔ ہمت کر کے اٹھا اور کرسی کے پاس جا کر اسے چھوا۔ کرسی بالکل خالی تھی۔ اس نے کرسی کا رخ پھر آئینہ کی طرف کر دیا۔

''ضرور یہ میرا وہم ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''یا شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے تھک جانے کی وجہ سے بے داری میں خواب دیکھ رہا ہوں۔''

یہ سوچ کر وہ پھر بستر پر آ کر لیٹ گیا اور عجیب بات یہ ہوئی کہ فوراً ہی اسے نیند آ گئی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی چیز گری تھی۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک بار پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کو کسی نامعلوم ہاتھ نے مٹھی میں پکڑ لیا ہو۔

کرسی کا رخ اس بار آئینہ کی طرف ہی تھا۔ کرسی

خالی تھی لیکن عورت کے بال کرسی کی پشت پر اس طرح لٹکے ہوئے تھے، جیسے وہ عورت کرسی میں بیٹھی ہو اور تکیہ سے سر لگا رکھا ہو۔ ابھی وہ دم بخود لیٹا یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک زنانہ ہاتھ کنگھا لے کر کرسی کی حدود سے باہر نکلا۔

ہاتھ میں وہی گاؤن کی آستین تھی۔ کنگھا ایک بار بالوں میں پھرا۔

اس نے پھر ہمت کر کے کہا۔

''کون ہے......کون میں کون ہے؟''

اچانک وہ بال اور ہاتھ غائب ہو گئے۔

جمشید اٹھ کر آنکھیں ملنے لگا اور سوچنے لگا۔ یہ میں نے خواب دیکھا تھا یا حقیقت تھی؟

''کچھ بھی ہو۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ضرور اس تماشے کی کوئی معقول وجہ ہو گی جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ صبح میں سوچوں گا۔''

خود کو یہ سمجھا کر وہ پھر لیٹ گیا اور پھر اسے جلد ہی نیند آ گئی۔

اس بار وہ صبح تک سوتا رہا۔

صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا، دروازہ اور کھڑکیاں اسی طرح اندر سے بند تھیں لیکن فرش پر عینی کی ایک ساڑھی اور بلاؤز پڑے تھے۔ ساڑھی کے کناروں پر پڑی شکنوں سے پتا چل رہا تھا کہ اسے باندھا گیا ہے اور عینی کا مور کے پروں جیسا گاؤن کرسی پر پڑا تھا۔

''ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''لیکن میں بھوتوں سے ڈرنے والا نہیں۔ آج رات میں اسے دیکھوں گا کہ وہ کیسا یا کیسی بھوت ہے؟''

اس نے عینی کے کپڑے اٹھا کر تہہ کیے اور الماری میں رکھ دیے۔ دن کی روشنی میں اس کا خوف دور ہو چکا تھا لیکن ذہن میں الجھن ضرور تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بارے میں نوکرانیوں سے کچھ نہ کہے گا اور رات کو پستول لے کر سوئے گا۔

اس فیصلے سے اسے کچھ اطمینان ہو گیا۔

ناشتہ کی ٹیبل پر دونوں نوکرانیوں نے اسے متجسس نظروں سے دیکھا۔ صغرا نے پوچھا۔

''کیا آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا ہے۔''

''ہاں ساری رات میرے پیٹ میں درد رہا ہے۔'' اس نے جھوٹ بولا اور تھوڑا سا ناشتا کر کے اٹھ گیا۔

سارا دن اسٹوڈیو میں برش کے رنگ لیے بیٹھا رہا لیکن اس سے کام نہ ہو سکا۔ اس کا ذہن بار بار رات کے واقعات کی طرف چلا جاتا تھا۔

چار بجے کے قریب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا۔

دروازہ پر تار والا کھڑا تھا تب اس نے دیکھا آسمان پر گھنگھور بادل چھائے ہوئے تھے۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اس نے دستخط کر کے ٹیلی گرام لے لیا۔

تار عینی کا تھا۔ تار کیا تھا اچھا خاصا خط تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آج رات واپس آ رہی ہوں۔ ممی ٹھیک ہیں۔ اسٹیشن آنے کی ضرورت نہیں۔ میں ٹیکسی لے کر آ جاؤں گی۔ شام کی گاڑی سے چل کر ایک بجے تک پہنچ جاؤں گی تمہاری عینی!''

عینی کے آنے کی خبر سے اسے بہت خوشی ہوئی۔ اندر جا کر اس نے دونوں نوکرانیوں کو بتایا کہ رات کو ان کی مالکن آ رہی ہے۔

اب اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔ وہ بے چینی سے رات ہونے اور عینی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ آٹھ بجے اس نے بہت ہلکا سا کھانا کھایا۔ باہر بارش تیز ہو گئی تھی، اس لیے ٹہلنے کا ارادہ ترک کر کے اپنے سونے کے کمرے میں آ گیا۔

آج اس نے اٹیچی سے اپنا پستول نکال کر سامنے رکھ لیا تھا۔ اسے امید تو نہ تھی کہ آج رات اسے کوئی بھوت ستائے گا لیکن وہ ہر طرح تیار رہنا چاہتا تھا۔

وہ بستر پر لیٹے لیٹے بور ہونے لگا۔ گھڑی کی سوئی ہلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

آخر اکتا کر وہ کمرے سے باہر گیا اور اسٹور روم سے وہسکی کی ایک بوتل گلاس لے آیا۔ بیوی کے انتظار میں تنہائی سے چھٹکارا پانے کا اس سے بہترین شغل اور کیا ہوسکتا تھا۔

آہستہ آہستہ اسے نشہ ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ وقت کا احساس ختم ہوگیا۔ اسے پتا بھی نہ چلا وہ آدھی کے قریب بوتل ختم کر چکا ہے۔

پھر اسے نیند آنے لگی۔ وہ بستر پر لیٹ گیا۔ نا جانے کب اسے احساس ہوا کہ کسی نے کمبل اٹھایا اور اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔

اس کے نشہ میں بوجھل ذہن نے کہا۔

''عینی آ گئی ہے۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر عینی پر رکھ دیا۔

عینی کا جسم برف کی طرح سرد تھا۔ اس نے سوچا باہر طوفان ہے، بے چاری ٹھنڈ میں آئی ہے۔ سردی لگ رہی ہوگی۔ جمشید کو اپنے سارے جسم میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

عینی کا سارا جسم برف کے مجسمے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈا لحاف اپنے اوپر کھینچ لیا۔

نائٹ گاؤن میں عینی کے سینٹ کی خاص خوشبو بسی تھی لیکن جب جمشید نے اسے پیار کیا، ناک میں کافور ملے گلاب کی سی خوشبو بھی محسوس ہوئی۔

وہ حیران تھا، یہ خوشبو کیسی اور عینی نے یہ عجیب سی خوشبو کیوں لگائی ہے؟

اس سے پہلے بھی وہ ایک بار ایسی خوشبو سونگھ چکا تھا اور پھر اچانک اس کا سارا نشہ اتر گیا۔

ایسی خوشبو اس نے اپنے باپ کے مرنے پر سونگھی تھی، جب اس کے باپ کی میت کو قبر میں اتار کر اس پر گلاب اور کافور چھڑکا گیا تھا۔

اس کا سارا بدن پہلے جھنجھنایا اور پھر سن ہو کر رہ گیا۔ وہ عینی کو جھنجوڑ کر اس خوشبو کے بارے میں کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک باہر والا دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر سرہانے رکھی لیمپ کا بٹن دبایا لیکن کچھ ہی نہ ہوا۔ شاید بجلی چلی گئی تھی۔

پھر کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹا۔ وہ حیران تھا کہ رات کو اس وقت کون ہوسکتا ہے۔ اس نے اپنے برابر پڑی عینی سے کہا۔

''عینی!''

اسی وقت نیچے سے عینی کی آواز سنائی دی۔

''کیا تم لوگ سب گھوڑے بیچ کر سوتے ہو۔ جمشید کہاں ہے؟''

عینی باہر تھی۔ وہ ابھی ابھی اسٹیشن سے آئی تھی پھر اس کے پہلو میں کون تھا؟

وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے کمبل پکڑ کر الٹ دیا اور پاس پڑی عورت کو دبوچنا چاہا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا پھر بھی اس نے ایک سایہ چلتا ہوا محسوس کیا۔

''کون ہے؟'' وہ چیخا۔ ''کون ہے کمرے میں.....؟''

سایہ کرسی کے پاس جا کر غائب ہوگیا۔

اس وقت بجلی آ گئی۔ ٹیبل لیمپ کا بٹن دبا ہوا تھا، اس لیے یک دم کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ روشنی ہوتے ہی اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں۔

عینی کا گاؤن اس طرح فضا میں معلق تھا جیسے کسی نے اسے پہن رکھا ہو لیکن وہ جسم نظر نہ آ رہا تھا۔

پھر وہ جسم آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی زینے سے نیچے اتر رہا ہو۔ گاؤن کا نچلا سرا فرش سے چھوا۔ پھر آہستہ آہستہ اس طرح ڈھیر ہوتا چلا گیا، جیسے اس میں موجود جسم زمین میں سما گیا ہو۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں فرش پر صرف گاؤن پڑا رہ گیا۔ اب وہاں کچھ نہ تھا۔

اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ بے

ہوش ہو کر گر پڑا۔

عینی نے خواب گاہ کے دروازہ کو دھکیلا، دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے پکارا۔

''جمشید.....جمشید.....؟''

جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے زور زور سے دروازہ پیٹ کر جمشید کو جگایا لیکن جمشید تو بے ہوش تھا۔

بہت دیر تک جب جمشید نے جواب دیا تو وہ گھبرا گئی۔ جلدی سے بھاگ کر باہر آئی اور ٹیکسی والے کو اندر بلا کر لائی۔ اس کے پاس کرایہ کے کھلے پیسے نہ تھے، اس نے ڈرائیور سے کہا تھا کہ وہ ابھی اندر سے روپے لا کر دیتی ہے۔

ڈرائیور اور نوکرانی کی مدد سے اس نے دروازہ توڑا، اندر داخل ہونے پر اس نے دیکھا کہ اس کا گاؤن کرسی پر پڑا تھا اور جمشید بے ہوش تھا۔

لیکن خطرے کی بات نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جمشید کو ہوش آ گیا۔ جمشید نے سارا واقعہ عینی کو سنایا۔

چوتھے دن اپنے ایک دوست کے مشورہ پر اس نے دو مزدور بلا کر کمرے میں کھدائی کرائی۔ ایک گز گڑھا ہونے کے بعد نیچے سے لکڑی کا بکس نکلا۔

بکس میں ایک مردہ عورت کا ڈھانچہ تھا جس کا کفن تک خاک کی طرح ہو چکا تھا۔ اس دوست کے مشورے پر جمشید نے اس مردہ ڈھانچے کو جنگل میں دفن کرا دیا۔

اس سے دو دن پہلے پراپرٹی ایجنٹ نے اسے بتایا تھا کہ یہ مکان ایک بہت بڑے زمیندار کا تھا۔ اس کی بیوی کا ایک عاشق تھا جس سے وہ راتوں کو ملنے جاتی تھی۔ زمیندار کو اپنی بیوی کی بے وفائی کا پتا چل گیا۔

ایک دن اس کی بیوی غائب ہوگئی۔ زمیندار نے یہ بات اڑا دی کہ اس کی بیوی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی لیکن کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے اپنی عاشق مزاج بیوی کو قتل کر کے مکان ہی میں دبا دیا ہے۔

اس کے بعد بھی اس بھوت نے جمشید یا اس کی نوکرانیوں کو نہیں ستایا۔

☆☆

مسکرائیے!

منیر صاحب کے گھر کا دروازہ زور سے بجا۔ وہ غصے سے دروازے پر گئے اور بولے۔ ''کون گدھے کا بچہ ہے؟''

باہر سے ان صاحب کے بیٹے کی آواز آئی۔ ''ابو! میں ہوں۔''

☆☆

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔

''کیوں بھئی تم نے گانے کی مشق کیوں چھوڑ دی؟''

''اپنے گلے کی وجہ سے۔'' دوست نے آہ بھر کر کہا۔

''تمہارے گلے کو کیا ہوگیا؟'' اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

دوست نے افسردہ ہو کر جواب دیا۔

''کچھ نہیں بس پڑوسیوں نے دہانے کی دھمکی دی تھی۔''

☆☆

اسپتال میں ایک دل کے مریض سے مزاج پرسی کے لیے آنے والے دوست نے پوچھا۔

''یہاں دل کی دھڑکن کو کم کرنے کے لیے بھی تمہیں کچھ مل رہا ہے؟''

مریض نے جواب دیا۔ ''ہاں ایک بوڑھی نرس۔''

☆☆

کھانے کی ایک دعوت میں شریک خاتون نے دوسری سے پوچھا۔ ''تمہیں کون سی ڈش پسند آئی؟''

''اسٹیل کی۔'' دوسری نے جواب دیا۔

☆☆

''عاصم! تم اپنے مکان میں کیوں نہیں رہتے۔ دن رات ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہتے ہو۔''

کاشی۔ ''کیا کروں بھائی۔ میرے مکان کا کرایہ بہت زیادہ ہے۔''

☆☆

بارہ دری

عابد علی

بہن بھائی کے درمیان محبت کی اس کہانی میں
آپ کو حساسیت بھی ملے گی اور یاسیت بھی

ایک نہایت ہی حساس و دل گداز تحریر

ٹھاکر پاؤس کے بارے میں اگر کوئی قابل تعریف بات تھی تو یہ کہ سمندر کے کنارے سنگلاخ چٹانوں پر بنی ہوئی قلعہ نما اس وسیع و عریض عمارت کی تعمیر صدیوں پہلے مکمل ہوئی تھی۔

شیر شاہ سوری جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو شہنشاہ ہمایوں کو جان بچانے کے لیے راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ اپنے بادشاہ کو میدان چھوڑتے دیکھ کر اس کے معتمد سردار بھی بھاگ نکلے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اس افراتفری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مغل شہزادے سے جن کی وفاداریاں مشکوک تھیں وہ لوگ پہلے کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ موقع ملتے ہی جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔

ٹھاکر مان سنگھ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ ہمایوں کے دربار خاص کا ایک معتمد سردار تھا۔ بظاہر مسلمان ہو چکا تھا مگر اندرونی طور پر مغل بادشاہت کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھا۔ اسے جب اطلاع ملی کہ شیر شاہ ہندوستان کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنے مخبروں کے ذریعے شیر شاہ سے ہمایوں کے خلاف سازباز شروع کر دی شیر شاہ نے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ مغل شہزادے کو زیر کرنے میں اس سے تعاون کرے تو اسے بہت بڑی جاگیر کے علاوہ افغان دربار میں ایک معتبر سردار کی حیثیت بھی دی جائے گی۔

ہمایوں کا معتمد ہونے کی حیثیت سے ٹھاکر اس کے تقریباً ہر راز سے واقف تھا۔ شاہی محل کا تو ایک ایک راز اس کے سینے میں محفوظ تھا۔ محل کی چار دیواری میں ہونے والی کوئی بات ایسی نہ تھی جو اس کی نظروں سے پوشیدہ ہو۔ ہر جگہ اس کی آمد و رفت تھی۔ محل کے ملازمین اس کے اختیارات سے آگاہ تھے۔ کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ اسے ٹوک سکتا۔

میدان کارزار میں جب ہمایوں کی شکست کے آثار ظاہر ہونے لگے تو ٹھاکر نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور جب اسے بادشاہ کے فرار کی اطلاع ملی تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا لیکن اس کی یہ خوشی زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکی۔ اسے اطلاع ملی کہ شیر شاہ سوری ان سرداروں کی فہرست تیار کر رہا ہے جنہوں نے مغل شہزادے سے غداری کی تھی۔ اپنی فرمانروائی میں کسی غدار کا وجود اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ آج یہ سردار ایک شخص سے وفاداریاں بدل سکتے ہیں تو کل اسے بھی دھوکا دینے میں کوئی عار نہیں سمجھیں گے۔ اس لیے وہ ان غداروں کا نام ہی صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا۔

ٹھاکر مان سنگھ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کے خواب ٹوٹی ہوئی مالا کی طرح بکھر گئے۔ اب اسے جان کے لالے پڑ گئے تھے اور وہ فرار کے راستے تلاش کر رہا تھا۔

شیر شاہ دارالحکومت سے کئی منزل دور تھا لیکن یہ فاصلہ اتنا طویل نہیں تھا جسے طے کرنے میں مہینے لگ جاتے، اسے جو کچھ بھی کرنا تھا ایک دو روز کے اندر ہی کرنا تھا۔

ہمایوں کی قوت منتشر ہو چکی تھی۔ بچے کھچے سردار بھی اپنی جانیں بچانے کے لیے پناہ کی تلاش میں بھاگ اٹھے تھے شاہی محل میں افراتفری کی کیفیت موجود تھی۔ ٹھاکر نے اس بھگدڑ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور محل کی تمام قیمتی اشیاء، نقدی اور زیورات لے کر ایک رات اپنے خاندان سمیت چپکے سے غائب ہو گیا۔

اس کے خاندان کا یہ مختصر سا قافلہ چھپتا چھپاتا سندھ کا ریگزار عبور کرتا ہوا ساحل سمندر پر پہنچ گیا۔ ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی میں قیام کے دوران مان سنگھ نے مکران کے ساحل کی طرف نکلنے کے بارے میں سوچا مگر اس کی طرف اس کی حیثیت مشکوک ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس بستی میں ایک مکان خرید کر مستقل رہائش اختیار کر لی۔ یہاں اس نے اپنے آپ کو ایک تاجر کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا جو ہندوستان میں کاروبار تباہ ہو جانے کے بعد اس طرف آ نکلا تھا اور اب سمندر میں موتیوں کی تلاش کے کام کے بارے میں سوچ رہا

تھا۔

ماہی گیروں کی اس بستی میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ لیکن ٹھاکر مان سنگھ نے یہاں اپنے آپ کو ایک نومسلم ہی بتایا تھا۔ اس طرح بستی کے سیدھے سادھے مسلمانوں کی ہمدردیاں بھی حاصل ہوگئیں۔ وہ وقتاً فوقتاً ان لوگوں کی کچھ مالی امداد بھی کردیا کرتا تھا۔ بستی میں اس کی سخاوت اور دولت مندی کے چرچے ہونے لگے۔ لوگ یہ تو جانتے تھے کہ وہ ایک دولت مند تاجر ہے لیکن اس کی دولت کا صحیح اندازہ کسی کو بھی نہ تھا۔ اگر بستی کے باشندوں کو یہ علم ہوجاتا کہ مغل شہزادے کے شاہی محل کی آدھی دولت اس کے گھر میں موجود ہے تو شاید اس کی اصلیت چھپی نہ رہ سکتی۔

ٹھاکر مان سنگھ دن بدن بستی سے دور ساحل کے کنارے سنگلاخ چٹانوں میں بھٹکتا رہتا۔ شام کو کچھ دیر بستی کے کھیا کے پاس بیٹھ کر ہندوستان کی سیاست پر تبصرے کرتا۔ اس طرح اسے تازہ ترین حالات سے آگاہی ہوتی رہتی۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد اسے اطلاع ملی کہ ہمایوں اپنے حمایتیوں کی مدد سے ہندوستان کے تخت پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھگوڑے سردار بھی واپس دارالحکومت کا رخ کرنے لگے تھے لیکن ٹھاکر مان سنگھ کے دل میں دارالحکومت واپسی کا خیال کبھی نہیں آیا۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ ہمایوں سے دور رہے مغل شہزادہ بھی غداروں کو معاف کرنے کا عادی نہیں تھا۔ دارالحکومت سے ہزاروں میل دور ساحل پر یہ گمنام بستی اس کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوسکتی تھی۔

ہندوستان کے حالات معمول پر آچکے تھے۔ مغل شہزادہ شاید اسے بھول چکا تھا۔ مزید کچھ عرصہ انتظار کرنے کے بعد جب ٹھاکر مان سنگھ کو اطمینان ہوگیا کہ مغل دربار کے امراء اسے مردہ تصور کرچکے ہیں تو اس نے ماہی گیروں کی بستی سے کئی میل دور ساحل پر پہاڑی چٹانوں میں ایک قلعہ نما عمارت کی تعمیر کا کام شروع کردیا جو کئی برسوں میں مکمل ہوا۔

پتھروں اور چھوٹی سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی اس شاندار عمارت کو ٹھاکر محل کا نام دیا گیا۔ بستی کے غریب باشندوں پر ہی نہیں دور دراز کے رہنے والے لوگوں پر بھی اس کی دولت مندی کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پھیلنے لگیں لیکن کوئی اس کی حقیقت کو اب بھی نہ جان سکا کہ کیا وہ واقعی ایک تاجر تھا یا کچھ اور؟

وقت گزرتا رہا۔ دور بدلتے رہے سلطنتیں لٹتی رہیں۔ ہندوستان پر کئی حکمران آئے اور چلے گئے مگر ٹھاکر محل کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ آبادیوں سے ہزاروں میل دور ویران ساحل پر بنی ہوئی اس عمارت میں کسی بادشاہ یا راجواڑے کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔

ماہی گیروں کی وہ مختصر سی بستی پھیلتی جارہی تھی۔ صدیاں گزرنے کے بعد اس بستی کا نام ونشان مٹ گیا۔ اب وہاں دنیا کا ایک خوب صورت اور جدید ترین شہر آباد تھا۔ بلند وبالا عمارتیں اور جگمگاتی ہوئی رنگ برنگی روشنیاں دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ صدیوں پہلے یہاں اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کچے مکانوں پر مشتمل ماہی گیروں کی ایک مختصر سی بستی رہی ہوگی۔ سمندر کے کنارے ریگزار پر نئی دنیا کے ہنگامے جنم لے چکے تھے مگر ساحلی چٹانوں پر ٹھاکر محل اب بھی جوں کا توں موجود تھا۔ صدیوں کے نشانات ٹھاکر محل پر ثبت تھے، دیواریں حوادث زمانہ سے سیاہ پڑ چکی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ سمندر کے رخ واقع بارہ دری کی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹ چکی تھی جس کی مرمت کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں دی اور دوسری تبدیلی یہ تھی کہ اس میں رہنے والوں نے آج سے تقریباً چالیس سال پہلے اس قلعہ نما عمارت کا نام ٹھاکر محل کی بجائے ٹھاکر ہاؤس رکھ دیا تھا اور عمارت کے گیٹ سے شہر تک ایک پختہ سڑک بھی تعمیر ہوچکی تھی جس پر صرف اس عمارت کے مکینوں کی کاروں ہی کی آمد ورفت ہوتی۔

ٹھاکر کی نسل سے اس دنیا میں اب صرف دو افراد ایسے تھے جن کا تعلق اس عمارت سے تھا۔ ایک آٹھ سالہ لڑکا قیصر اور دوسری تقریباً 35 سال کی ایک مدقوق سی عورت اس وسیع وعریض عمارت میں صرف یہی دو بہن بھائی مقیم تھے۔ کبھی کبھار کوئی ان کا ملنے والا ابھی آجاتا تو سکوت اور سناٹے سے گھبرا کر فوراً ہی واپس چلا جاتا۔ انہیں علم نہیں تھا کہ اس دنیا میں ان کا کوئی رشتہ دار بھی موجود ہے یا نہیں۔

قیصر تین سال کی عمر میں ہی باپ کے سائے سے محروم ہوگیا تھا اور جب اس نے ساتویں سال میں قدم رکھا تو ماں بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اب شاہینہ کے علاوہ قیصر کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ بھی اسے حد سے زیادہ چاہتی تھی۔ اس کی تمام تر محبت چھوٹے بھائی کے لیے وقف ہوکر رہ گئی تھی۔ لیکن وہ اپنی محبت کا اظہار کچھ اس انداز سے کررہی تھی کہ قیصر کے معصوم ذہن میں اس کے لیے چاہت کی بجائے نفرت کے جذبات جنم لے رہے تھے۔ بہن جتنا اس کی قریب ہونے کی کوشش کرتی وہ لاشعوری طور پر اتنا ہی اس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

سترہ سال پہلے شاہینہ کی شادی ہوئی تھی لیکن وہ زیادہ عرصہ تک ازدواجی زندگی کی خوشیاں نہ سمیٹ سکی۔ شادی کے تین ماہ بعد ہی اس کا شوہر ٹرین کے ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ یہ صدمہ ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے سہہ لیتی۔ بیوگی کا غم اس کی زندگی کو دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان سے بیگی کا غم دیکھا نہیں جاتا تھا۔ انہوں نے شاہینہ کو دوسری شادی کے لیے آمادہ کرنا چاہا مگر وہ ان کے کسی دباؤ میں نہیں آئی۔

بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ کر جب اس کی ماں نے ایک بیٹے کو جنم دیا تو اس کے چہرے پر ایک بار پھر زندگی کی رونق آگئی۔ اسے دل بہلانے کو ایک ننھا سا کھلونا مل گیا۔ ماں سے زیادہ پیار دیا اور جب سات سال کی عمر تک پہنچتے ہوئے قیصر ماں باپ کے سائے سے محروم ہوگیا تو وہ پہلے بھی زیادہ اس کا خیال رکھنے لگی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ قیصر جوں جوں بڑا ہوتا جارہا تھا اس کے دل میں بہن کے خلاف نفرت بڑھتی جارہی تھی۔ کسی کام میں روک ٹوک اسے بالکل اچھی نہ لگتی۔ کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ شاہینہ کو قتل کرڈالے۔ لیکن وہ اپنے اس ارادے پر کبھی عمل نہ کرسکا۔

خون تھوک تھوک کر شاہینہ زندگی کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں ڈاکٹر بھی مایوسی کا اظہار کرچکے تھے، ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اسے بہت پہلے مرجانا چاہیے تھا مگر وہ جانتی تھی کہ زندگی سے اس کا ناتا محض قیصر کے دم سے قائم ہے۔ قیصر کی محبت اس کے دل میں جینے کی امنگ پیدا کیے ہوئے تھی۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ جسے وہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ وہ اس سے شدید نفرت کرتا ہے۔ شاہینہ کو ہفتے میں ایک مرتبہ اپنی دوا اور سودا سلف لانے کے لیے شہر جانا پڑتا تھا۔ گھر کا سارا کام بھی وہ خود ہی کرتی ایک دو مرتبہ ملازمائیں رکھیں بھی تو وہ تنہائی اور جھیلی کے آسیب زدہ ماحول سے گھبرا کر واپس چلی گئیں۔ انہی دشواریوں کے پیش نظر شاہینہ سوچ رہی تھی کہ ٹھاکر ہاؤس کی سکونت ترک کرکے شہر میں کوئی مکان لے لیں۔ ایک مرتبہ جب اس نے اپنے ایک ملنے والے سے اس خیال کا اظہار کیا تو قیصر چونک گیا۔ وہ نہیں سمجھ پارہا تھا کہ اس کی باجی یہ پرسکون اور خوب صورت جگہ کیوں چھوڑنا چاہتی ہے۔ تازہ ہوا کے جھونکے چاروں طرف جھومتے ہوئے اونچے اونچے درخت، سمندر کا نظارہ، دل کو موہ لینے والے ایسے حسین مناظر انہیں اور کہاں ملیں گے۔ شہر کی گھٹی گھٹی فضا میں تو ان کا بھی دم گھٹ جائے گا اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ٹھاکر ہاؤس ان کے اسلاف کی یادگار تھی۔ اس کے در و دیوار سے ان کی آباؤ اجداد کی کرن پھوٹتی تھی۔ نہیں وہ ٹھاکر ہاؤس چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔

قیصر کا زیادہ وقت بارہ دری میں گزرتا۔ گرمیوں کے موسم میں تو یہ جگہ اس کے لیے گوشہ عافیت ہوتی۔ وہ ٹھنڈے فرش پر سینے کے بل لیٹا ٹوٹی ہوئی دیوار سے سمندر کی شوریدہ سر لہروں کو سنگلاخ چٹانوں سے

ٹکراتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ جھاگ اڑاتی ہوئی لہروں کا شور اسے موسیقی سے بھی زیادہ لطیف محسوس ہوتا اور جب سمندر میں طوفان کی کیفیت ہوتی تو یہ لطف اور بھی دوبالا ہو جاتا۔ بپھری ہوئی موجیں تیزی سے اس طرف بڑھتیں تو لگتا جیسے وہ اپنے ساتھ سب کچھ کر لے جائیں گی۔ لیکن جب یہی لہریں ساٹھ فٹ بلند چٹانوں سے سر ٹکرا کر لوٹ جاتیں تو اس کے پورے بدن میں عجیب سی گدگدی ہونے لگتی۔ وہ فرش پر پیٹ کے بل لیٹا دیوار کے ٹوٹے ہوئے حصے سے سر باہر نکالے یہ سب کچھ دیکھتا رہتا۔

بارہ دری کی دیوار کا وہ ٹوٹا ہوا حصہ بہت خطرناک تھا۔ کسی وقت کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ لیکن آج تک چونکہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا اس لیے اس کی مرمت کی طرف کبھی توجہ بھی نہیں دی گئی تھی۔ شاہینہ قیصر کو اکثر اس طرف جانے سے منع کرتی رہتی۔

شہر سے ٹھاکر ہاؤس میں آنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی کبھار ان کا کوئی ملنے والا آ جاتا تو شاہینہ اس کے سامنے بھی قیصر کی شرارتوں کا رونا روتی رہتی۔ ایسے موقعوں پر قیصر کے دل میں اپنی بہن کے لیے نفرت کچھ اور بڑھ جاتی۔ وہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہا تھا۔ جب کبھی وہ ماں یا باپ کی تصویر کے سامنے کھڑا حسرت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہوتا تو شاہینہ اسے کھینچتی ہوئی وہاں سے لے جاتی، اسے بہن کی اس سنگدلی پر رونا آ جاتا اور اس کا دل چاہتا کہ اسے بارہ دری کی ٹوٹی ہوئی دیوار سے دھکا دے کر ہلاک کر ڈالے لیکن اپنے اس ارادے پر وہ کبھی بھی عمل نہ کر سکا۔

ایک روز ایسے ہی جب وہ ماں کی تصویر کے سامنے کھڑا یاس آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاہینہ بھی اس کمرے میں آ گئی۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بڑبڑائی۔

''اب مجھے شہر میں کسی مکان کا انتظام کرنا ہی پڑے گا ورنہ یہاں کی ایک ایک چیز سے وابستہ یادیں تمہیں میری طرح ہی ٹی بی کا مریض بنا دیں گی۔''

قیصر نے اس کی بڑبڑاہٹ کا کوئی جواب نہیں دیا اور ایک جھٹکے سے بازو چھڑا کر خاموشی سے ایک طرف چل دیا۔

''کہاں جا رہے ہو قیصر؟'' شاہینہ نے پوچھا۔

''بارہ دری میں۔'' قیصر نے رکے بغیر مختصر سا جواب دیا۔

''ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ آخر وہاں کیا ایسی دلچسپی ہے جو تم ہر وقت وہاں گھسے رہتے ہو۔'' شاہینہ کہتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

قیصر رک گیا اور جب شاہینہ اس کے برابر پہنچ گئی تو وہ دوبارہ آگے چلنے لگا۔ بارہ دری عمارت کے آخری حصے میں تھی وہاں تک کا راستہ بہت ناہموار اور جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ جب تک قیصر کا باپ زندہ رہا وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس کی زندگی میں کہیں کوئی فالتو جھاری دکھائی نہیں دیتی تھی۔ سلیقے سے بنی ہوئی کیاریاں رنگ برنگے پھولوں کے پودوں سے آراستہ رہتیں۔ لیکن اس کی موت کے بعد کسی نے باغبانی کی طرف توجہ نہ دی۔ شاہینہ کو تو ان چیزوں سے سرے سے دلچسپی تھی ہی نہیں۔

شاہینہ نے قیصر کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور وہ اس ناہموار راستے پر بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی۔ بارہ دری میں پہنچ کر شاہینہ نے سمندر کی طرف جھانکا تو اس کا دل دہل گیا۔ تقریباً ساٹھ فٹ نیچے منہ زور لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ جس چٹان پر بارہ دری بنی ہوئی تھی وہ بالکل عمودی تھی۔ اگر یہاں سے کوئی گرے تو سیدھا ان پتھروں پر جا کر گرتا جو پانی میں ڈوب جاتے اور کبھی آسمان کی طرف تنکتے ہوئے نظر آتے۔

''اف! کتنا خوف ناک منظر ہے۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کا یہ حصہ تو بہت ہی خطرناک ہے۔ میں پہلی فرصت میں شہر سے مزدور بلا کر اس کی مرمت کرواؤں

گی۔'' شاہینہ اس کا بازو تھام کر خوف زدہ لہجے میں بولی۔

نیچے بہت نیچے لہروں کے چٹانوں سے ٹکرانے کی آوازیں ابھر رہی تھی، یہ آوازیں سن کر دفعتاً قیصر کے دل میں یہ خیال ابھرا کہ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر شاہینہ کو نیچے دھکا دے دے۔ ایسا بہترین موقع اسے زندگی میں پہلی بار مل رہا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ذہن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ لیکن جس سرعت سے یہ خیال اس کے ذہن میں آیا تھا اسی تیزی سے نکل گیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا تھا جو آ کر گزر گیا۔ اس نے شاہینہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کچھ کہے بغیر مڑا اور تقریباً دوڑتا ہوا واپسی کے راستے پر چل دیا۔ حویلی تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھول گیا۔ جسم پسینے میں تر ہو گیا، سینے میں ننھا سا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر گر گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ شاہینہ اس کے پیچھے نہیں آئی۔ اس نے چادر اوڑھ لی اور اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا..... چادر کے نیچے اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

☆☆☆

وقت نے ٹھاکر ہاؤس کی دیواروں پر ربع صدی کی ایک اور تہہ چڑھا دی۔

قیصر نے ۲۶ ویں سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس پر بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ معمولی سے بخار نے ٹائیفائیڈ کی صورت اختیار کر لی تو اسے شہر لے جا کر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ شاہینہ پریشان ہو کر رہ گئی۔ گو ہسپتال میں قیصر کی بڑی اچھی دیکھ بھال ہو رہی تھی مگر وہ بھی دن میں دو تین چکر ضرور لگا لیتی۔

قیصر تقریباً ڈیڑھ ماہ ہسپتال میں رہا۔ اب وہ صحت کی طرف لوٹ رہا تھا مگر نقاہت اس قدر آ گئی تھی کہ وہ کسی کے سہارے کے بغیر اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہسپتال میں خالدہ اس کی نرس تھی جسے شاہینہ کی ہدایت پر اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ لیکن جب اسے گھر لایا گیا تو شاہینہ نے اس کی دیکھ بھال کے لیے خالدہ کو بھی وہیں بلا لیا۔ اس کے کہنے پر خالدہ نے ہسپتال سے تین ماہ کی رخصت لے لی تھی۔

ٹھاکر ہاؤس خالدہ کے لیے بڑی عجیب و غریب جگہ ثابت ہوئی۔ اسے یہ جان کر بھی حیرت ہوئی کہ اس قلعہ نما عمارت میں ان دونوں بہن بھائیوں کے علاوہ کسی تیسرے فرد کا وجود نہیں۔

خالدہ کی عمر اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اتنی حسین تو نہیں تھی مگر اسے قبول صورت کہاں جا سکتا ہے۔ ہسپتال اور پھر گھر پر قیصر کی دیکھ بھال کے دوران وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے عجیب سے جذبات محسوس کرنے لگے تھے۔ قیصر نے اسے ٹھاکر ہاؤس اور اپنے خاندان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ لیکن شاہینہ سے اپنی نفرت پر پردہ ڈالے رکھا۔ تین چار ماہ بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ کسی کے سہارے، چل پھر سکے۔ اس کی خواہش پر خالدہ اسے سہارا دے کر بارہ دری میں لے جاتی جہاں وہ گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔

قیصر اب مکمل طور پر صحت یاب ہو رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر خالدہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تو اس کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو جائے گا۔ اس نے شاہینہ کے سامنے خالدہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے، لیکن اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور قیصر کے مکمل صحت کے ایک ہفتہ بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد خالدہ پہلے سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ شاہینہ پر بھی پوری توجہ دے رہی تھی جو خون تھوکتے تھوکتے زندگی کے آخری موڑ پر پہنچ چکی تھی۔

شادی کے بعد کچھ عرصہ تک تو شاہینہ اس سے خوش رہی لیکن پھر اس کے ہر کام میں کیڑے نکالے جانے لگے۔ شہر سے کوئی ملنے والا آتا تو خالدہ کی موجودگی میں اس کے سامنے اس کی برائیاں کی

جاتیں اور بے چاری خالدہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ وہ شاہینہ کے بدلتے ہوئے رویہ کی وجہ نہیں سمجھ سکی تھی۔

''ایک روز قیصر جب شہر سے لوٹا تو شاہینہ فوراً ہی اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔''

''قیصر! آج میں صاف صاف تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

قیصر اس کا لہجہ محسوس کر کے چونک گیا۔ اسے شاہینہ اور خالدہ کے مابین کشیدگی کا آج تک پتا نہیں چل سکا تھا وہ یہی سمجھا کہ شاہینہ ایک بار پھر ٹھاکر ہاؤس سے شہر منتقل ہونے کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہے۔

''کہیے باجی میں متوجہ ہوں۔''

''جب تم نے خالدہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو مجھے تمہاری تجویز بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ لیکن تمہاری خوشی کی خاطر مجھے اجازت دینا پڑی۔''

''میں سمجھا نہیں، شاہینہ باجی۔ کیا خالدہ آپ کو پسند نہیں آئی۔'' قیصر حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''نہ وہ مجھے پہلے پسند تھی اور نہ اب ہے۔''

''کیوں، وہ تو آپ کو بہت پسند کرتی ہے۔ آپ کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتی ہے۔ وہ جب سے ٹھاکر ہاؤس میں آئی ہے اس نے آپ کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کی ہے۔''

''یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں اور پھر میں اپنے آرام اور تمہاری خوشی کی خاطر خاندان کی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' قیصر الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''نالی کے کیڑے نالی ہی میں اچھے لگتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ کیا آپ کو خالدہ کی کوئی بات ناگوار گزری۔'' قیصر بری طرح چونک گیا۔

''ہسپتالوں میں کام کرنے والی نیچ گھرانوں کی یہ لڑکیاں خدمت اور انسانی ہمدردی کا جذبہ لے کر مسیحا کا لباس نہیں پہنتیں۔ ان کا مقصد شکار پھانسنا ہوتا ہے۔ وہ موقع کی تلاش میں رہتی ہیں۔ تم جیسے سیدھے سادھے نوجوانوں کو پھانس کر وہ ان کی دولت پر قابض ہو جاتی ہیں لیکن ان کی ہوس ختم نہیں ہوتی۔''

''آپ نے مجھے بھی بری طرح الجھا دیا ہے شاہینہ باجی..... خالدہ میں آج تک مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اس نے محض دولت کی خاطر مجھ سے شادی کی ہے۔''

''اسے تم سے زیادہ میں جانتی ہوں۔ بہرحال میں نے کہہ دیا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہے گی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اس طرح کہ میں خاندان کی عزت کو اس طرح سرِعام نیلام ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

''آپ نے دوسری مرتبہ خاندان کی عزت کا نام لیا ہے لیکن ابھی تک اس کی وضاحت نہیں کر سکی ہیں۔''

''وضاحت مجھ سے نہیں اس سے طلب کرو جو تمہاری عدم موجودگی میں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ منہ مارے اڑائی پھر رہی ہے۔''

یہ خالدہ پر بہت بڑا الزام تھا۔ قیصر ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اسے خاموش پا کر شاہینہ دوبارہ کہنے لگی۔

''تم جانتے ہو کہ ڈاکٹر رشید کا خالدہ سے کوئی رشتہ نہیں لیکن ہسپتال چھوڑنے کے بعد بھی خالدہ سے اس کے تعلقات بدستور ہیں۔ پہلے وہ تمہیں دیکھنے کے بہانے آتا رہا پھر وہ میری بیماری کا بہانہ کرنے لگا۔ لیکن میں دیکھتی رہی ہوں کہ میرا علاج بھی ایک بہانہ ہے۔ وہ دراصل خالدہ سے ملنے آتا ہے۔ میں اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں اور وہ دونوں چٹانوں میں گھومتے رہتے ہیں۔''

قیصر کوئی جواب بھی نہ دے پایا تھا کہ اس وقت باہر کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ قیصر، شاہینہ کی طرف دیکھتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی باہر نکلا اسے خالدہ ایک طرف جاتی ہوئی

نظر آئی۔ وہ محض اس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ خالدہ ان کی ساری گفتگو سن چکی ہے۔

وہ ڈاکٹر رشید تھا۔ قیصر نے مہذبانہ انداز میں معذرت کر کے اسے لوٹا دیا لیکن اس سے اگلے روز خالدہ بھی ٹھاکر ہاؤس سے رخصت ہو گئی۔ قیصر نے لاکھ اسے روکنا چاہا مگر جس طرح وہ اچانک اس کی زندگی میں آئی تھی اسی طرح اچانک ہی نکل گئی۔

ڈاکٹر رشید کے بارے میں نہ تو قیصر نے کچھ پوچھنے کی کوشش کی اور نہ ہی خالدہ نے اس سے اپنے تعلقات کی وضاحت کی۔ طلاق کے بعد انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر رشید، خالدہ کا سوتیلا بھائی تھا۔ رشید کی والدہ مر چکی تھی۔ خالدہ کی ماں سوتیلے بیٹے کو برداشت نہ کر سکی۔ شوہر سے لگائی بجھائی کر کے بالآخر اسے گھر سے ہی نکلوا دیا۔ رشید اپنی محنت اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس مقام تک پہنچا تھا۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ خالدہ بھی اس ہسپتال میں نرس کی حیثیت سے ملازم ہو گئی جہاں وہ ڈاکٹر تھا ان دونوں کے درمیان رشتے کا انکشاف بہت عرصہ بعد ہو سکا تھا، خالدہ اسے سگے بھائی کی طرح چاہنے لگی۔ لیکن ماں کی ناراضی کے خوف سے اس نے گھر میں کبھی اس کا ذکر نہیں کیا اور ہسپتال میں اس سے ملتی رہی۔ شادی کے بعد وہ اس سے ملنے کے لیے ٹھاکر ہاؤس آتا رہا۔ شاہینہ ان کے تعلقات کو غلط سمجھی اور اس نے خالدہ کو طلاق دلوا دی۔

☆☆☆

قیصر ایک بار پھر تنہا رہ گیا۔ خالدہ کے بارے میں اس انکشاف کے بعد شاہینہ کے لیے اس کے دل میں نفرت کچھ اور بھی بڑھ گئی۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ بہن کا گلا گھونٹ دے مگر وہ اپنے اندر کبھی اتنا حوصلہ پیدا نہ کر سکا۔

قیصر کے دفتر میں لیڈی سیکریٹری کی آسامی خالی تھی۔ اس کے لیے اخبار میں ضرورت کا اشتہار دیا گیا۔ انٹرویو کے لیے سب سے پہلے آنے والی لڑکی سعیدہ تھی۔ قیصر اسے دیکھ کر چونک گیا۔ کالج میں وہ اکٹھے ہی تعلیم حاصل کر چکے تھے اور آج دو سال بعد اس انداز میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ قیصر نے بلا حیل و حجت اسے ملازم رکھ لیا۔

کالج کے زمانے میں قیصر اسے پسند کرتا تھا مگر کالج کا ساتھ چھوٹتے ہی وہ اس کے ذہن سے محو ہو گئی۔ اس ملاقات نے پرانی یادوں کو تازہ کر دیا۔ قیصر اسے ملازمہ سے زیادہ دوست کی حیثیت دینے لگا۔ وہ جلد ہی ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ فلم اور تفریح ان کا تقریباً روز کا معمول بن گیا۔

دفتر والی عمارت کی چوتھی منزل پر قیصر نے ایک فلیٹ بھی لے رکھا تھا۔ جب بھی گھر جانے کی نیت نہ ہوتی تو اس فلیٹ میں رہ لیتا۔ اس رات وہ فلم کا آخری شو دیکھ کر آئے تھے۔ فلیٹ میں پہنچتے ہی قیصر نے والہانہ انداز میں اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

''ہمیں ایک حد کے اندر رہنا چاہیے قیصر! میں ڈرتی ہوں کہ تمہیں جب میرے بارے میں کچھ حقائق کا علم ہو گا تو تم شاید مجھے پسند نہ کرو۔ اس لیے بڑھتے ہوئے قدم اسی جگہ روک لینے چاہئیں تاکہ واپسی میں دشواری نہ ہو۔'' سعیدہ نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

''کیسے حقائق؟'' قیصر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہیں شاید علم نہیں کہ گزشتہ سال میری شادی ہو گئی تھی لیکن.....''

''لیکن کیا.....؟''

''میرے شوہر نے مجھے چند ماہ بعد ہی طلاق دیدی کیونکہ میں اس کی توقع کے مطابق اپنے ساتھ ڈھیروں جہیز نہیں لا سکی تھی اور اب میں سمجھتی ہوں کہ کوئی بھی مرد کبھی مطلقہ عورت کے بارے میں مثبت انداز میں نہیں سوچ سکتا۔''

"وہ بے وقوف تھا جس نے تم جیسی خوب صورت لڑکی کو ٹھکرادیا، میں تمہارے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔" قیصر نے اسے دوبارہ اپنے سینے سے لگالیا۔ سعیدہ کسمسا کر رہ گئی۔

"اگر آج رات تم یہاں رہ جاؤ تو تمہارے گھر والوں کو اعتراض تو نہ ہوگا؟" قیصر اس کے بال چومتا ہوا بولا۔

"نہیں میری امی بڑی وسیع النظر ہیں انہیں معلوم ہے کہ میرا زیادہ وقت تمہارے ساتھ گزرتا ہے۔" سعیدہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ رات گئے تک باتیں کرتے رہے اور جب قیصر نے بتایا کہ وہ بھی شادی کر چکا تھا تو سعیدہ چونک سی گئی۔ قیصر نے اسے خالدہ کے بارے میں تمام تفصیلات بتا دیں آخر میں ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے بولا۔

"یہ سب کچھ میری بہن شاہینہ کی وجہ سے ہوا۔ خالدہ اس کے عائد کردہ الزامات کو برداشت نہیں کر سکی تھی۔"

"اوہ! کیا شاہینہ کو بعد میں اس کا افسوس نہیں ہوا؟" سعدیہ نے پوچھا۔

"نہیں بلکہ خالدہ کے جانے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا تھا جیسے سر سے کوئی بلا ٹل گئی ہو۔"

"یہ تو تمہارے ساتھ واقعی بہت زیادتی ہوئی۔"

"میرا خیال ہے کہ اب اس زیادتی کی تلافی ہونے والی ہے۔" قیصر نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سعیدہ بھی جواب دینے کے بجائے مسکرادی۔

تین چار روز بعد قیصر سعیدہ کو ٹھاکر ہاؤس لے گیا شاہینہ اس سے بڑے تپاک سے ملی تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ پھر قیصر اسے ٹھاکر ہاؤس کی سیر کراتا رہا۔ وہ اسے اپنے اسلاف اور اس قلعہ نما عورت کی تاریخ بتا رہا تھا۔ آخر میں وہ اسے بارہ دری میں لے گیا اور سمندر کے رخ پر ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"دیوار کا یہ حصہ نہ جانے کب ٹوٹا تھا۔ میرے بزرگوں میں سے کسی کو اس کی مرمت کا خیال نہیں آیا۔ شاہینہ باجی کئی مرتبہ اسے مرمت کروانے کے بارے میں کہہ چکی ہیں لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ آج تک اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ پورے ٹھاکر ہاؤس میں یہی جگہ ہے جہاں پہنچ کر مجھے سکون ملتا ہے۔ میں کئی کئی گھنٹے یہاں لیٹا چٹانوں سے سر ٹکراتی ہوئی موجوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔" وہ کہتا ہوا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا پھر آہستہ آہستہ سینے کے بل لیٹ گیا اور سر ٹوٹے ہوئے حصے سے نکال کر بولا۔

"میرے پہلو میں لیٹ جاؤ اور دیکھو نیچے کتنا دلفریب منظر ہے۔"

سعیدہ نے بلا حیل وحجت اس کے کہنے پر عمل کیا اور دونوں بچوں کی طرح لیٹے نیچے جھانکتے رہے جہاں جھاگ اڑاتی ہوئی شوریدہ سر لہریں سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

"اوہ! کتنا دلفریب منظر ہے۔ تم واقعی خوش قسمت ہو جو ہر روز ایسے دلکش نظروں سے لطف اندوز ہوتے ہو۔" سعیدہ ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولی۔

"چاہو تو تم بھی میری اس خوش قسمتی میں حصے دار بن سکتی ہو۔" قیصر مسکرایا۔

سعیدہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی اس نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور سرک کر اس کے قریب آ گئی۔ ان کے بدن ایک دوسرے کو چھونے لگے۔ قیصر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"دلفریب ہونے کے ساتھ یہ منظر خوف ناک بھی ہے۔ وہ دیکھو! کتنی اونچی لہر چلی آ رہی ہے، لگتا ہے جیسے اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو بہالے جائے گی۔" سعیدہ دور سمندر میں اٹھتی ہوئی ایک بلند موج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"مگر یہ چٹانیں اس کا راستہ روک لیں گی اور وہ طوفانی لہر ان سے ٹکرا کر خود ہی پاش پاش ہو جائے گی۔ چاندنی رات میں یہاں کا منظر اور بھی دلفریب ہوتا ہے۔"

"کیا تم اسی بہانے آج رات مجھے یہاں روکنا چاہتے ہو؟" سعیدہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"چاہو تو۔" قیصر کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ سعیدہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی چپک گئی۔

کئی روز بعد جب قیصر نے شاہینہ کو بتایا کہ وہ سعیدہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ اس اطلاع پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"کیا تم اس کے بارے میں پوری طرح اطمینان کر چکے ہو۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ جو بھی قدم اٹھاؤ پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو، جلد بازی سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تم پہلے بھی ایک بہت بڑی غلطی کر چکے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ سعیدہ کو تو آپ بھی پسند کرتی ہیں۔" قیصر نے جواب دیا۔

"بے شک میں اسے پسند کرتی ہوں۔" شاہینہ نے دلی تاثرات چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ماضی کے تلخ تجربات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ سعیدہ شہر کے ہنگاموں کو چھوڑ کر یہاں خوش رہ سکے گی۔"

"شادی کے بعد وہ یہاں نہیں رہے گی۔ اس کے لیے شہر میں مکان لے لیا جائے گا۔ میں بھی وہیں رہوں گا۔ ہفتے میں دو تین دن کے لیے ہم یہاں آ جایا کریں گے۔"

شاہینہ خاموشی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ابھر آئے جیسے قیصر کی اس بات پر وہ چیخنا چلانا شروع کر دے گی۔ لیکن جب اس نے بات شروع کی تو لہجہ معمول کے مطابق تھا۔

"قیصر! تم جانتے ہو کہ میں زندگی کے آخری موڑ پر پہنچ چکی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہوں گی اس لمبی چوڑی عمارت کی دیکھ بھال اب زیادہ عرصہ تک مجھ سے نہیں ہو سکے گی۔ میرا خیال تھا کہ تم شہر میں کوئی بڑا مکان لے کر مجھے بھی وہیں لے چلو گے لیکن بہر حال، ٹھیک ہے جو تم نے سوچا ہے وہ بہتر ہی ہوگا۔"

قیصر نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔

اس روز کے بعد اس کا زیادہ وقت شہر ہی میں گزرنے لگا۔ شاہینہ کے کام میں مدد کے لیے اس نے ایک ملازمہ کا انتظام کر لیا تھا۔ سعیدہ کے ہمراہ وہ خود بھی اکثر و بیشتر وہاں آتا رہتا۔

اس رات وہ اپنے شہر والے فلیٹ میں سو رہا تھا کہ دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے دماغ چکرا رہا ہو۔ کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کنپٹیوں میں جیسے انگارے بھر گئے تھے۔ دماغ کی رگیں اس طرح تنی ہوئی تھیں جیسے خون کے دباؤ سے پھٹ جائیں گی۔ وہ کتنی دیر تک دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔ جب اس کیفیت میں ذرا نرمی پیدا ہوئی تو اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے حواس قدرے بحال ہوئے تو وہ کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اس کی اس کیفیت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

اسے یاد آیا کہ کل شام وہ ٹھاکر ہاؤس گیا تھا۔ اس نے سعیدہ کو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ناگوار سے لہجے میں انکار کر دیا تھا۔ اس کی ناگواری کی وجہ وہ نہیں سمجھ سکا تھا لیکن ذہن میں یہ خیال ضرور ابھرا تھا کہ ممکن ہے شاہینہ اور اس کے درمیان کوئی بات ہو گئی ہو۔ وہ اکیلا ہے ٹھاکر ہاؤس پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ رات وہاں رہ کر صبح شہر واپس چلا آئے گا۔ لیکن ٹھاکر ہاؤس میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ سعیدہ کے بغیر یہاں رات نہیں رہ سکے گا۔

اس کے ذہن میں سعیدہ کا خیال ابھر آیا۔ وہ اس وقت کہاں ہو گی؟ کیا کر رہی ہو گی؟ کس کے ساتھ ہو گی؟ سعیدہ کے ساتھ دوسرے مرد کا تصور آتے ہی اس کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

رات کے کھانے پر تقریباً خاموشی ہی رہی۔ شاہینہ نے نہ تو سعیدہ کے بارے میں کچھ پوچھا اور

نہ ہی اس کے کاروبار کے سلسلے میں کوئی بات کی۔ اس کے اعصاب میں ایک بار پھر تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ شاہینہ کا رویہ بھی اسے بہت بدلا بدلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ دفعتاً وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔ بار بار کھلتی اور بند ہوتی ہوئی مٹھیاں اس کی ذہنی انتشار کی غمازی کر رہی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد شاہینہ بھی ڈرائنگ روم سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔

''قیصر! کیا بات ہے۔ تم ٹھیک تو ہو؟''

''بات!'' قیصر اپنے جذبات کو قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''بات کچھ نہیں۔ میں اب اس اذیت سے نجات حاصل کر لینا چاہتا ہوں۔''

''اذیت سے نجات؟ میں کچھ نہیں قیصر؟'' شاہینہ نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

قیصر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ جب اس کی حالت کچھ اعتدال پر آئی تو وہ برآمدے کے سامنے کھڑی کار کی طرف بڑھ گیا۔

''میں شہر واپس جا رہا ہوں۔ مجھے اس وقت سعیدہ کی ضرورت ہے۔''

قیصر کو اب گزشتہ رات کے تمام واقعات یاد آ رہے تھے وہ انتہائی خوف ناک رفتار سے کار چلاتا ہوا شہر واپس آ گیا تھا۔ سعیدہ کی امی گزشتہ دو تین روز سے اپنے بھائی کے ہاں گئی ہوئی تھیں اور ان دنوں سعیدہ اکیلی ہی تھی۔ وہ جب ان کے مکان پر پہنچا تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک جگہ سے سعیدہ کے تمام دوستوں کو فون کیے لیکن ہر ایک نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر وہ ایک شراب خرانے میں گھس گیا اور بے تحاشا پینے لگا۔ اس کا ذہن مدہوشی میں ڈوبتا چلا گیا۔ شراب خانے سے نکل کر وہ گھر آ گیا۔ لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ گھر آنے سے پہلے وہ کہیں اور بھی گیا تھا یا نہیں۔

وہ کرسی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ ایک عجیب سی ذہنی اذیت تھی جس نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کا ذہن صاف ہوتا چلا گیا اور اسے یاد آ گیا کہ وہ شراب خانے سے نکلنے کے بعد گھر آنے سے پہلے کہاں گیا تھا۔ جب وہ شراب خانے سے نکلا تو نشے میں دھت تھا۔ اسے اپنی ہستی کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کار میں بیٹھا اور اسٹیرنگ سنبھالتے ہی اسے تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑا دیا تھا۔

اس پہاڑی سڑک پر جگہ جگہ انتہائی خطرناک موڑ تھے مگر وہ اندھا دھند تیز رفتاری سے کار چلاتا رہا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ لیکن جب کار ایک جھٹکے سے رکی تو اسے احساس ہوا کہ وہ ٹھاکر ہاؤس پہنچ چکا ہے۔ شاہینہ اس وقت برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اسے شراب کے نشے میں دھت دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔ اسے معلوم تھا کہ شہر جانے کے بعد قیصر نے شراب نوشی بھی شروع کر دی تھی۔

''واپس کیا لینے آئے ہو قیصر؟'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

''مم، میں، ایک بات بھول گیا تھا آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں میرے، میرے ساتھ آیئے بارہ دری میں۔'' قیصر نے رک رک کر جواب دیا۔

شاہینہ چند لمحوں تک الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی، تاریکی میں ناہموار رات طے کرتے ہوئے خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ مگر وہ جیسے تیسے بارہ دری میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں سمندر کے رخ پر دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔

''تم مجھے کیا دکھانا چاہتے ہو قیصر؟'' شاہینہ نے پوچھا۔

''یہ، نیچے دیکھو۔'' قیصر نے اس کے کمزور کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا سا آگے جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں بھی اپنی مرضی کا مختار ہوں۔''

دفعتاً میز پر پڑے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی کی

آواز نے قیصر کو اس کے خیالات سے چونکا دیا۔ فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ لیکن اس نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ کئی مرتبہ گھنٹی بجنے کے بعد فون خاموش ہو گیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن پر اب بھی شراب کا نشہ طاری تھا۔ نیم مدہوشی کی سی کیفیت تھی۔ نجانے کتنی دیر گزری ہو گی کہ گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آنکھیں بند کر لینے سے تو حقیقت نہیں بدل سکتی تھی۔ گھنٹی اب بھی بج رہی تھی لیکن یہ فون کی نہیں دروازے کی گھنٹی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر زوردار دستک کی آواز ابھری اس کے ساتھ ہی قفل میں چابی گھمائے جانے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت تک قیصر اٹھ کر بیٹھ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا اور سعیدہ اسے پکارتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا بات ہے قیصر! تم پریشان نظر آ رہے ہو۔ پہلے میں کتنی دیر تک فون کرتی رہی جب کوئی جواب نہ ملا تو خود چلی آئی۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''اوہ! کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔'' قیصر نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔

سعیدہ اس کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ اس کی پشت سہلانے لگی۔

☆☆☆

شاہینہ ٹی بی کی مریضہ تو تھی ہی، ایک روز اسے اچانک ہی تیز بخار نے آ لیا۔

سعیدہ اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے لیے مستقل طور پر ٹھاکر ہاؤس میں رہ رہی تھی۔ دس بارہ روز بعد جب شاہینہ تندرست ہوئی تو سعیدہ اپنا تختہ تڑوا بیٹھی۔ اس روز قیصر بھی شہر سے آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں بارہ دری کی طرف جا رہے تھے کہ سعیدہ کا پیر پھسل گیا۔ گرنے سے اس کا پیر دہرا ہو گیا اور وہ بے اختیار چیخنے چلانے لگی۔ قیصر اسے اٹھا کر کمرے میں لے گیا اور شہر جا کر ڈاکٹر کو بلا لایا۔

شخنے کے قریب ہڈی کریک ہو چکی تھی اور ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے ٹھیک ہونے میں کئی روز لگیں گے۔ سعیدہ اس خیال سے ہی پریشان ہو گئی کہ اس کا پیر ٹھیک ہو بھی جائے گا یا نہیں اگر پیر ٹھیک نہ ہوا تو اسے بیساکھی کا سہارا لینا پڑے گا۔ یہ تصور ہی روح فرسا تھا کہ وہ لنگڑی ہو گئی ہے۔

اب شاہینہ کی باری تھی کہ وہ سعیدہ کی تیمارداری کرے اس نے واقعی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ خود بیمار ہونے کے باوجود وہ بڑی مستعدی سے اس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس کے انداز میں بے رخی اور سرد مہری آتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سعیدہ پلنگ پر پڑی چیختی چلاتی رہتی مگر شاہینہ کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

سعیدہ کا پیر اب ٹھیک ہو رہا تھا۔ چند روز بعد وہ لکڑی کے سہارے چلنے لگی۔ شاہینہ کا رویہ اب اس کے لیے قطعی ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ جب اس کی قوت برداشت بالکل ہی جواب دے گئی تو وہ قیصر کے سامنے پھٹ پڑی۔

''قیصر! یہ ٹھیک ہے کہ شروع میں تمہاری بہن مجھ پر بڑی مہربان رہی ہے۔ لیکن اب اس کا رویہ میری برداشت سے باہر ہے اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس نے چند روز جو میری دیکھ بھال کی ہے وہ محض ہمدردی اور خدا ترسی کی بنا پر تھی اور میں بھیک میں ملنے والی کوئی چیز قبول نہیں کرتی..... میں یہاں نہیں رہ سکتی قیصر۔'' کہتے ہوئے سعیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میرا خیال تھا کہ ہم علیحدہ مکان لے کر کسی کی مداخلت کے بغیر ہنسی خوشی اپنی زندگی گزار دیں گے۔ لیکن تم دیکھ رہی ہو کہ شاہینہ بیمار ہے۔ ہم اسے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' قیصر نے مدہم لہجے میں جواب دیا۔

''نہیں میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو تمہیں اپنی بہن کو چھوڑنا پڑے گا۔'' سعیدہ چیخی۔

''جلد بازی سے کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت

نہیں سعیدہ میں شاہینہ آپا سے بات کروں گا۔ وہ دل کی اتنی بری نہیں۔'' قیصر یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

شاہینہ اپنے کمرے میں موجود تھی۔ وہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی کمزور نظر آ رہی تھی۔ چہرے کی رنگت کپاس کے پھول کی طرح زرد ہو رہی تھی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی ویرانی بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

''اچھا ہوا تم آ گئے قیصر۔ مجھے سہارا دے کر باہر لے چلو میں تازہ ہوا کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔'' شاہینہ اسے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

قیصر نے خاموشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ حدت آمیز ہوا کے جھونکے کچھ اور بھی بے چینی پیدا کر رہے تھے۔ وہ چند لمحے برآمدے میں کھڑے رہے۔ پھر شاہینہ نے بارہ دری کی طرف چلنے کو کہا۔ قیصر نے اس کے حکم کی تعمیل میں قدم اٹھا دیے۔

''میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہوں قیصر۔''

''کہیے میں سن رہا ہوں۔''

''سعیدہ نے آج میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اس کی باتوں نے مجھے گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔ اس نے مجھے خود غرض تک کہہ دیا ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ میں تمہیں اپنے مفاد کی خاطر اپنا پابند رکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے تمہیں پال پوس کر جوان کیا ہے قیصر۔ کیا میرا تم پر کوئی حق نہیں۔'' کہتے ہوئے شاہینہ کی گرفت قیصر کے بازو پر سخت ہو گئی۔

قیصر کو اس کی انگلیاں اپنے گوشت میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ جواب میں کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بارہ دری میں پہنچ گئے۔ ٹوٹی ہوئی دیواران سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر تھی اور شاہینہ اس کا بازو تھامے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

آج سمندر کی لہروں میں کچھ زیادہ ہی شوریدہ سری تھی۔ پاگل لہریں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ تیز ہوا سفیدے اور چیڑ کے اونچے درختوں سے ٹکرا کر سائیں سائیں کی خوف ناک آوازیں پیدا کر رہی تھی۔

قیصر ایک بار پھر ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گیا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ پیشانی پر پسینے کے قطرات نمودار ہونے لگے۔ اس نے ایک ہاتھ سے شاہینہ کا بازو تھام لیا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر کے گرد حمائل کر کے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ اور ایک قدم بڑھا کر بارہ دری کے اس کنارے پر پہنچ گیا جہاں دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔

''کیا آپ سعیدہ کو پسند نہیں کرتیں؟'' قیصر نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں ہر اس عورت سے نفرت کرتی ہوں جو تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرتی ہے۔ تم میری چاہت کا اندازہ نہیں لگا سکتے قیصر۔ میں اپنی محبت میں کسی کی شرکت برداشت نہیں کر سکتی۔'' شاہینہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا۔

قیصر چند لمحوں تک خاموش رہا پھر اس طرح اچانک قہقہے لگانے لگا جیسے اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ شاہینہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ قیصر کے قہقہے دفعتاً تھم گئے۔ وہ چند لمحوں تک گہری نگاہوں سے شاہینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ شاہینہ کی کمر پر اس کی گرفت کچھ اور بھی مضبوط ہو گئی اور پھر دوسرے ہی لمحہ اس نے شاہینہ کو سینے سے لگا لیا اور اپنے دونوں بازو مضبوطی سے اس کے گرد لپیٹ کر بارہ دری سے باہر چھلانگ لگا دی۔

☆☆

برگشتہ بخت

سید علی ارسلان

سچی محبت قربانی کی متقاضی ہوتی ہے۔ ایک اعلا کردار شخص کا قصہ، جس نے شک رفع کرنے کے لیے اپنی محبت قربان کر دی۔

انسان اگر شک میں مبتلا ہو جائے تو اس کی زندگی عذاب بن جاتی ہے

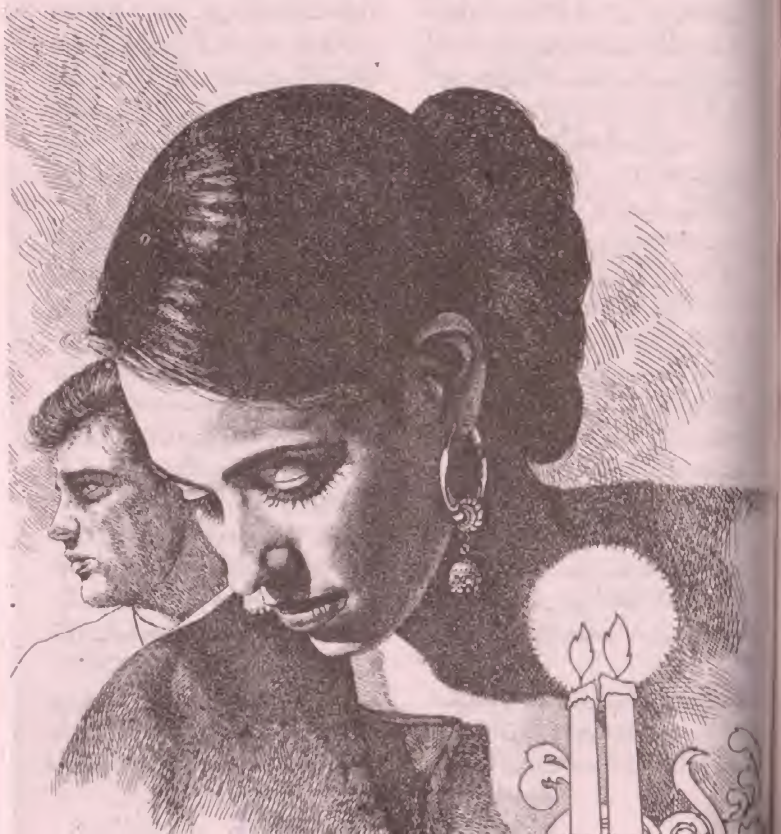

جب میں انگلینڈ کے رائل آف سرجری کالج سے دل کے امراض کے سلسلے میں ایف آر سی ایس کی ڈگری لے کر آیا تو میری اماں گھر کے افراد میں اضافے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ انہیں ایک عدد بہو کی سخت ترین ضرورت تھی۔ ضرورت تو مجھے بھی تھی مگر ابھی میرے ذہن پر انگلینڈ کی شاموں کا نشہ اور وہاں کی دھوپ کا سرور باقی تھا۔

سفید، گوری، چٹی ٹیمیں لگاتار چار سال تک دیکھنے کے بعد مجھے اپنے ملک کی کالی پیلی رنگ برنگی لڑکیاں بالکل بے کیف لگیں اور میں یہ سوچ سوچ کر پچھتانے لگا کہ کیوں نہ میں نے کرسٹینا سے شادی کرلی بے چاری مرتی تھی مجھ پر اور ساتھ پاکستان آنے پر بھی رضامند تھی۔ بہرحال اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئیں کھیت۔ اماں کا اصرار دن بدن بڑھتا جارہا تھا اور میں برابر ٹالے جارہا تھا۔ لیکن آخر کب تک۔

ایک روز اماں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں انہیں اپنی پسند بتادوں، ورنہ وہ اپنی مرضی سے میری شادی طے کردیں گی اور نہ صرف طے کریں گی بلکہ بہو بھی اپنے گھر لے آئیں گی۔ میں کانپ اٹھا۔ پتا نہیں اماں کیسی لڑکی میرے پلے باندھ دیں۔ میرے معیار کی ہو نہ ہو۔ آخر میں ایک ہارٹ اسپیشلسٹ تھا، ولایت پلٹ، اور میری بیوی کو بھی کم از کم میرا ہم پلہ ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اماں سے اگلے دن جواب دینے کا وعدہ کرلیا۔

ساری رات میں سوچتا رہا کہ اماں کو کیا جواب دوں؟ اپنی پسند کیا بتاؤ؟ کبھی سوچتا کہ ایم اے پاس یا ایم ایس سی پروفیسر مناسب رہے گی۔ کبھی خیال آتا سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہی کامیاب بیوی ثابت ہوسکتی ہے مگر پھر وہی بات معیار والی۔

آخر میں بڑی دیر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے لیے کوئی لیڈی ڈاکٹر مناسب ہے۔ ہم پیشہ ہوگی تو ذہنی ہم آہنگی بھی پیدا ہوگی۔ پہلے میں میاں اور بیوی دونوں کے ڈاکٹر ہونے کے سخت خلاف تھا، کیونکہ اس طرح بیوی بھی اکثر میں رہتی ہے اور شوہر بھی۔ دونوں ہی احساس برتری کا شکار ہوتے ہیں۔ نتیجتاً شوہر اپنے کو کمتر محسوس کرتا ہے اور گھر جہنم بن جاتا ہے۔ پتا نہیں ان مردوں کو کیا ہوگیا ہے۔ ہمیشہ عورت (خاص کر بیوی) کو اپنے سے کمتر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ برابر بھی نہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ پہلے میں ان ہی مردوں میں شامل تھا لیکن اب میری سوچوں کا انداز بدل چکا ہے۔ کیونکہ میں چار سال انگلینڈ میں گزار آیا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ کہ مجھے اپنی بیوی کا صرف ایم بی بی ایس ہونا منظور تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ پھر وہی برابری والی بات آجاتی اور میری شخصیت، بیوی کی شخصیت تلے دب کر رہ جاتی۔

میں نے اپنے فیصلے پر ہر پہلو سے غور کیا۔ گھریلو نقطہ نگاہ سے بھی اور معاشی نقطہ نگاہ سے بھی۔

معاشی پہلو یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ میں چند سال بعد اللہ کو پیارا ہوگیا یا کسی ایسے حادثے کا شکار ہوگیا کہ کمانے سے معذور ہوجاؤں تو کم از کم میرے بچے کسمپرسی کے عالم میں زندگی نہیں گزار دیں گے۔ بیوی کے کماؤ ہونے میں یہی تو فائدہ ہے۔

دوسرے دن میں نے اماں کو اپنا فیصلہ سنادیا اور اماں لڑکی کی تلاش میں ہمہ تن مصروف ہوگئیں۔

مجھے مقامی میڈیکل کالج کے شعبہ کارڈیالوجی کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کردیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف اسپتالوں سے میں نے آپریشنز کے معاہدے بھی کررکھے تھے۔ نیز شام کو پرائیویٹ پریکٹس بھی کرتا تھا مطلب یہ کہ دولت کی ری پیل ہورہی تھی۔

میں اس دولت کو خرچ کرنے کے مختلف طریقے سوچ ہی رہا تھا کہ اماں نے آکر مجھے جھنجوڑ دیا۔

"سور ہے ہو کیا؟ یہ دیکھو۔" اماں کے ہاتھ میں تصویر تھی۔

میں سمجھ گیا کہ میری ماں نے کہیں نشانہ تاک لیا ہے۔ چنانچہ میں نے وہ تصویر جھپٹ لی۔

اچھی خاصی خوب صورت لڑکی تھی مگر شکل سے

کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہوتی تھی۔

"یہ تو بالکل بچی ہے ماں۔"

"بھئی، بچی ہو یا بڈھی۔ ڈاکٹری پاس کرچکی ہے اور مجھے پسند بھی ہے۔"

"پسند تو مجھے بھی ہے۔" اب اماں کو کیا بتاتا کہ بارہا اس لڑکی کو اسپتال میں ہاؤس جاب کرتے دیکھ چکا ہوں، پسندیدگی کی نظر سے۔ اور خیالوں ہی خیالوں میں اس کے ساتھ ہنی مون مناتے ہوئے اٹلی اور روم کی سیر بھی کرچکا ہوں۔

"لیکن اماں اس کا نام کیا ہے؟" میں قطعی انجان بن گیا۔

"شہلا رفیق۔ کرنل رفیق حسین کی بیٹی ہے اور اسی سال ایم بی بی ایس پاس کیا ہے۔" اماں نے جواب دیا۔

"ویری گڈ۔ ویری گڈ!" میں سر ہلا کر بولا۔

"تو پھر رشتے کی بات پکی کروں نا؟" اماں بے تابی سے بولیں۔

"نہیں اماں، ابھی نہیں۔ میں ذرا اطمینان کرلوں۔ کچھ دن بعد آپ کو بتاؤں گا۔"

"بات کیا ہے۔ کیسا اطمینان؟" اماں گھبرا گئیں۔ "لڑکی پسند نہیں تو کوئی اور گھر دیکھوں؟"

"ارے نہیں اماں! ایسا غضب مت کیجیے گا۔" میں بوکھلا گیا۔ پھر اپنی بوکھلاہٹ پر خود ہی ہنس پڑا۔

اماں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ "عجیب لڑکا ہے۔ پتا نہیں کیسا اطمینان چاہتا ہے۔"

میں اماں کو کیا بتاتا کہ میں کیسا اطمینان چاہتا ہوں۔ اس بات کا مجھے عملاً تجربہ تھا کہ زمانہ طالب علمی میں اور خصوصاً جب تعلیم مخلوط ہو تو قدم قدم پر لوافیئر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

خود میں بھی اپنی دو تین کلاس فیلوز پر دل و جان سے فریفتہ ہوچکا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ ایسے ماحول میں بہت کم لڑکیاں اور لڑکے ایسے ہوتے ہیں جن کے دل اکیلے اور صرف اکیلے دھڑکتے ہیں۔ ان کا ساتھ دینے والا اور کوئی نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے کہ شہلا رفیق ان "بہت کم" لڑکیوں میں سے نہ ہو اور شادی کے بعد میری زندگی اجیرن کردے۔

لہٰذا میں نے طے کرلیا کہ شہلا کے بارے میں مکمل تفتیش کرنے کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کروں گا۔

پہلے میرا ارادہ ہوا کہ شہلا کی کسی کلاس فیلو سے اس کے بارے میں رائے لوں مگر پھر یہ ارادہ بدلنا پڑا۔ کیونکہ مجھے اپنے ایک دوست کا مقولہ یاد آگیا تھا۔ جو کہا کرتا تھا۔ "یہ لڑکیاں نہایت چھپی رستم ہوتی ہیں اور ان میں اتحاد بھی غضب کا ہوتا ہے۔ کبھی اپنی کسی سہیلی کا راز کسی دوسرے پر عیاں نہیں کرتیں۔"

چنانچہ اب میں کسی ایسے لڑکے کی تلاش میں تھا جو شہلا رفیق کا کلاس فیلو رہا ہو۔

کئی دن کی تلاش کے بعد آخر میری محنت رنگ لائی اور میں اپنی ہونے والی بیوی کے کلاس فیلو لڑکے کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ڈاکٹر شہاب تھا جو ہاؤس جاب کررہا تھا۔ خوش قسمتی سے شہاب بھی امراض قلب کے وارڈ میں لگا ہوا تھا۔ یعنی میرا ماتحت تھا۔

ایک روز میں نے اسے بلا بھیجا۔

"جی سر۔" اس نے نہایت سعادت مندی سے پوچھا۔

"بیٹھو۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر سکڑ کر بیٹھ گیا مجھے اس کے اس انداز پر قطعی تعجب نہ ہوا۔ ہر ماتحت اپنے افسر کے سامنے یونہی سکڑا کر بیٹھتا ہے۔ میں نے بغور ڈاکٹر شہاب کا جائزہ لیا۔ وہ عام نوجوانوں سے قطعی مختلف تھا۔ نہ اس کے بال کانوں کی لوؤں کو چھو رہے تھے۔ نہ مونچھیں تھوڑی تک لٹکی ہوئی تھیں اور نہ ہی اس نے شوخ رنگوں کے پھول دار کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ کافی اسمارٹ لگ رہا تھا۔ سادگی کی وجہ سے اس وقت وہ استاد اور میں شاگرد لگ رہا تھا کیونکہ میرے بال کانوں تک بڑھے ہوئے تھے اور میں نے جدید فیشن کے کپڑے زیب تن کررکھے تھے۔

"ڈاکٹر شہاب! آپ سے ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے۔" میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"فرمائیے سر!" وہ سراپا خدمت بن گیا۔

"آپ نے پچھلے سال امتحان پاس کیا ہے نا؟"

میں نے شرلاک ہومز کی طرح پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''آپ کے ساتھ ایک لڑکی شہلا رفیق بھی پڑھتی تھی؟''

''جی بالکل۔'' اس کے چہرے پر سوالیہ نشان ابھر آیا۔

''مجھے اسی لڑکی کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''لیکن کیوں؟ میرا مطلب ہے سر! آپ کا اس سے کیا تعلق؟'' اس نے عجیب سی شکل بنا کر سوال کیا۔

''وہ عنقریب میری بیوی بننے والی ہے۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''اسی لیے مجھے اس کے بارے میں کچھ تفصیلات درکار ہیں۔''

''اوہ' اچھا اچھا، خدا آپ کو شادی مبارک کرے سر۔ شہلا بہت اچھی لڑکی ہے۔ عام لڑکیوں سے بالکل مختلف۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''لیکن میں نہیں چاہتا کہ آئندہ کبھی مجھے اپنی شادی کے ناکام ہونے کے احساس ہو۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ شہلا رفیق کے بارے میں مجھے ایک ایک بات تفصیل سے بتادیں۔''

''مثلاً سر؟''

''مثلاً یہ کہ ہوسکتا ہے کہ اسے کوئی اور شخص پسند ہو۔ زمانہ طالب علمی میں عام طور پر ہر لڑکے اور ہر لڑکی سے عشق جیسی حماقت سرزد ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے شہلا نے بھی کسی لڑکے کو منتخب کر رکھا ہو۔''

''نہیں، نہیں سر! شہلا ایسی لڑکی نہیں ہے۔ کالج کے زمانے میں بہت سے لڑکے اس کے اردگرد منڈلاتے رہے مگر اس نے کسی کو ذرا بھی لفٹ نہیں دی۔''

اس جواب سے میرے دل کا کوئی تقویت پہنچی۔ پھر بھی میں نے پوچھا۔

'اچھی طرح یاد کر کے بتایئے۔ مخلوط تعلیم کے پانچ سال بہت ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہو اور ہماری آئندہ زندگی جہنم بن جائے۔''

''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کی ازدواجی کی کامیابی کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ شہلا جیسی لڑکیاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ وہ بہت مختلف لڑکی ہے۔''

''اوکے۔ تھینک یو ویری مچ۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر شہاب رخصت ہوگیا۔

میرے دل سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں ہوا میں اڑنے لگوں۔

گھر آکر میں نے تقریباً گاتے ہوئے اماں سے کہا۔

''اماں مبارک ہو، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ کل ہی کرنل رفیق حسین کے ہاں آپ رشتہ لے کر چلی جائیں۔''

اور پھر ایک دن شہنائیوں کی گونج اور مبارک، سلامت کے شور میں شہلا، شہلا رفیق سے شہلا جہاں بخت بن گئی۔

جب میں نے قبلہ عرسی میں اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور رنگ سونے کی طرح چمکدار۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زیورات اس نے پہنے ہوئے نہ ہوں بلکہ اسی کے جسم کو تراش کر زیورات کی شکل دے دی گئی ہو۔

پھر مجھے وہ یوں بھی پسند آئی کہ میری پہلی پہلی بیوی تھی اور اس کی طرف سے ابھی میرے دل میں کوئی پھانس نہیں لگی تھی۔ پہلے کی چبھی ہوئی ایک باریک سی پھانس ڈاکٹر شہاب نکال چکا تھا۔

کئی دن کی مسلسل کوششوں کے بعد جب کالج سے میری چھٹی کے درخواست منظور ہوئی تو میں شہلا کو ساتھ لے کر ہنی مون منانے نکل کھڑا ہوا۔

گھر سے نکل کر شہلا کا تکلف کافی حد تک دور ہوگیا تھا اور وہ مجھے ''اے جی'' کے بجائے ''ڈارلنگ'' کہنے لگی تھی۔ جواب میں میں نے بھی اسے پیار سے ''شیلی'' کہہ کر پکارنا شروع کردیا۔

حیدرآباد، ملتان اور لاہور سے ہوتے ہوئے ہم دونوں مری کے ''ہوٹل سیسل'' میں قیام پذیر ہوئے۔ یہ ہوٹل نو بیاہتا جوڑوں میں بے حد مقبول ہے اور عام طور پر سے لوگ ہنی مون یہیں مناتے ہیں۔

ہم دونوں صبح کے نکلے ہوئے رات گئے ہوٹل میں لوٹتے۔ سارا دن تفریح میں گزارنے کے بعد بھی ہمیں قطعی تھکن محسوس نہ ہوتی۔ غرض یہ ہے کہ چھٹیاں بڑے مزے سے گزر رہی تھیں۔ اب شہلا مجھ سے بہت بے تکلف ہوگئی تھی۔ جب میں مری کے ''مال روڈ'' پر چلتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیتا تو وہ پہلے کی طرح برا نہ مانتی بلکہ میرے ہاتھ کو اپنی گرم ہتھیلیوں میں زور سے بھینچ لیتی اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس دیتی۔ کشمیر پوائنٹ پر ٹہلتے ہوئے وہ مجھ سے کہتی۔ ''جہاں بخت! تم کتنے اچھے ہو۔ آئی ایم ویری لکی۔'' تو میں شرما جاتا اور اپنی انگلی مروڑنے لگتا۔ پھر میں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور اس کے موتیوں جیسے دانت دھوپ پڑنے سے چمک اٹھتے۔

اس دن صبح میں شیڈ بنا رہا تھا اور شہلا اخبار پڑھ رہی تھی۔ دفعتاً اس کے منہ سے ''اوہ! چچ چچ'' کی آواز نکلی۔ میرے لیے یہ آواز نئی نہیں تھی۔ وہ جب بھی کوئی اخبار یا رسالہ پڑھتی تو کسی کے قتل یا موت کی خبر پر اس کا یہی ری ایکشن ہوتا تھا۔

پھر بھی میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ افسوس کرتے ہوئے بولی۔ ''ایک شخص نے اپنی بیوی کو شک و شبہ کی وجہ سے قتل کردیا۔'' پھر میرے چہرے پر نظریں جما کر عجیب سے لہجے میں کہنے لگی۔

''جہاں بخت! تمہیں تو مجھ پر بھروسا ہے نا؟''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔'' میں نے برش چلاتے ہوئے کہا۔

''اور ہمیشہ رہے گا؟'' اس نے بچوں کی طرح سوال کیا۔

''بالکل۔'' میں نے ریزر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہائے سچ! تو تمہیں مجھ پر اعتماد ہے؟'' وہ اچھل کر میرے گلے سے لپٹ گئی۔ میرا گال ریزر سے کٹ گیا اور خون نکل آیا۔ پھر بھی میں مسکرا کر بولا۔

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' اس کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ پیچھے ہٹ کر سراسیمہ لہجے میں بولی۔

''تو پھر کیا بات ہے؟''

''دراصل میں نے شادی سے پہلے تمہارے بارے میں مکمل تفتیش کرلی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' وہ الجھ سی گئی۔

جواب میں، میں نے اسے اپنی اور ڈاکٹر شہاب کی گفتگو کا حال تفصیل سنا دیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے تکیہ اٹھا کر مجھ پر دے مارا۔ اس کے بعد جو چیز اس کے ہاتھ میں آتی رہی۔ وہ مجھ پر پھینکتی رہی۔ اس نے میری چیزوں کی ذرا بھی پروا نہ کی۔

جب پھینک کر مارنے کے قابل کوئی چیز نہ بچی تو وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں بھی تولیے سے منہ پر لگا ہوا صابن پونچھتا اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلی ثابت ہوئی۔ جب میں سڑک تک پہنچا تو وہ غائب ہوچکی تھی۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ شہلا مجھ سے کیوں ناراض ہوگئی ہے۔ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی کہ وہ یوں خفا ہوکر چلی جائے۔ ماہر امراض قلب ہونے کے باوجود میں اس کے دل کی بات کیوں جان سکا۔

جب رات گہری ہوگئی اور وہ واپس نہ آئی تو مجھے فکر ہوئی۔ ساری رات میں اس کے انتظار میں جاگتا رہا۔ وہ رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح ہر ممکنہ جگہ پر میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر بیکار۔ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ واپس کراچی اپنے میکے چلی گئی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں شام کی فلائٹ سے کراچی پہنچا اور بے تابانہ اپنے گھر آیا لیکن میری بیوی یہاں بھی نہ تھی۔ تب میں نے کرنل رفیق حسین کے گھر فون کھڑکھڑایا۔

فون کرنل صاحب ہی نے اٹھایا اور میری آواز سن کر بولے۔ ''کہوں میاں اچھے تو ہو۔ چھٹیاں کیسی گزریں۔ مری کا موسم کیا ہے؟'' ان کے لہجے میں ناراضی ذرا بھی نہیں تھی۔

''اس کا مطلب ہے ابھی شہلا نے مری کوئی شکایت نہیں کی۔'' میں نے سوچا پھر اپنے مسرسے بولا۔

''سب ٹھیک ہے انکل۔ میں بھی اور میری کا موسم بھی۔ آپ ذرا شہلا کو بلا دیں۔''

''ہیں، کیا کہہ رہے ہو تم۔ وہ ابھی یہاں کہاں پہنچی ہے۔ تم نے پھر اسے رکشے میں بٹھا دیا ہوگا۔ میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ میری بیٹی کو رکشا میں مت بھیجا کرو۔ خطرناک سواری ہے۔''

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کروں اور کرنل صاحب سے کیا کہوں۔ ہمت کر کے میں نے کرنل صاحب کو اپنی داستان غم سنا ہی دی۔ جواب میں زوردار ڈانٹ کے بجائے ان کا قہقہہ سنائی دیا۔

''ارے میاں کمال ہے اور تم گھبراہٹ میں کراچی چلے آئے۔ شہلا ضرور اپنی کسی سہیلی کے ساتھ مری کے کسی اسنیک بار میں بیٹھی ہوگی۔ وہ بڑی عجیب لڑکی ہے۔''

میں نے جھلا کر فون بند کر دیا۔ اب ان سسر صاحب وک کیسے سمجھاؤں کہ کتنے غصے میں تھی۔

فون رکھ کر میں واپس مڑا تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

میرے سامنے شہلا کھڑی تھی۔ میری اپنی شہلا۔ میری بیوی۔ مگر اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ہونٹ غصے سے پھڑپھڑا رہے تھے۔

''شیلی ڈیئر! تم کہاں چلی گئیں تھیں؟'' میں بے تاب ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور تقریباً چیخ اٹھی۔

''خبردار! مجھے ہاتھ مت لگانا۔ گھٹیا، کم ظرف،'' میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''یہ لو ان پر دستخط کر دو۔'' اس نے کچھ کاغذات میری طرف بڑھا دیے۔

''یہ..... یہ کیا ہے؟'' میں نے بمشکل پوچھا اس کے غصے سے میری جان پر بنی ہوئی تھی۔

''طلاق کے کاغذات اب میں ایک پل بھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

''لل..... لیکن کیوں ڈارلنگ؟''

''اپنی گندی زبان سے مجھے مت پکارو۔ میں تمہارے منہ سے اپنا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔ چلو جلدی سے دستخط کرو۔''

''لیکن مجھے میرا قصور تو بتا دو؟'' میری آواز پھنس پھنس کر نکلی اور وہ غصے میں کانپتے ہوئے کہنے لگی۔

''تم نے مجھے ایک عام لڑکی سمجھتے ہوئے میرے کردار کے بارے میں تفتیش کی لیکن ڈاکٹر جہاں بخت! میں عام لڑکی نہیں ہوں۔ میں بہت مختلف ہوں۔ اسی بات کا مجھے احساس ہے اور اب میں نے اپنے لیے عام لوگوں سے مختلف شوہر تلاش کر لیا ہے۔ تم تو عام آدمی سے بھی پست نکلے جہاں بخت! تم جہاں بخت نہیں بلکہ کم بخت ہو۔ کم بخت، برگشتہ بخت۔'' آخری جملے کہتے ہوئے وہ چلانے لگی۔

میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''وہ کون خوش نصیب ہے جس کا تم نے انتخاب کیا ہے؟''

''ڈاکٹر شہاب!'' اس نے تن کر کہا۔

''کیا؟'' میرے سر پر حیرتوں کے ساتوں آسمان ٹوٹ پڑے۔

''ہاں، شہاب پورے پانچ سال مجھے چاہتا رہا۔ مجھ سے محبت کرتا رہا لیکن میں نے اسے ہمیشہ ایک عام چھچھورا لڑکا سمجھا اور اس کی محبت کا مذاق اڑاتی رہی۔ پھر وہ دونوں ہاتھ صوفے کی پشت پر رکھ کر بولی۔ ''لیکن اب مجھے اس کی سچی محبت اور اعلا کردار کا یقین ہو گیا ہے۔ اگر اس کی محبت میں ہوس شامل ہوتی تو وہ کبھی تم سے میری تعریف نہ کرتا۔ اس نے میرا مستقبل بنانے کے لیے اپنی محبت قربان کر دی۔ میں ایسے شخص کی ساری عمر پرستش کروں گی اور تم! میں نے تو تم سے اور صرف تم سے اپنی پہلی محبت کی ابتدا کی تھی جہاں بخت۔ مگر تم مجھے اعتماد تک نہ دے سکے اور اعتماد کے بغیر محبت کا تصور میرے نزدیک قطعی بیکار ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

آج کل میں ایک بار پھر کنوارا ہوں اور مجھے ایک بار پھر ایک عدد بیوی کی ضرورت ہے لیکن اب.....اب میں ایک قطعی ان پڑھ، جاہل اور گنوار بیوی کی تلاش میں ہوں۔

☆☆

نیند آنکھوں میں نہیں

محمد سلیم اختر

محبتوں کے پڑانو میں وفا کے سائبان نہ ہوں تو راستہ کٹھن ہو جاتا ہے۔ ایک وفا شعار کا قصہ الم اس نے خیانت کی پاداش میں اپنے جگر گوشے سے انتقام لے لیا۔

پس دیوار زنداں سے بیاں، محمد سلیم اختر کا ایک نشتر

میں جیل کی آہنی سلاخوں کا باسی ہوں۔ دنیا مجھے اپنے چہیتے، لاڈلے اور اکلوتے بیٹے کے قاتل کے نام سے جانتی ہے۔ پس دیوار زنداں، تنگی ایام کو ہنس کر گزارنے کی خواہش میں اکثر میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں، اور اس انجام تک کیسے پہنچا؟ اس کے لیے آپ کو میرے ساتھ میرے ماضی کے دروازے پر دستک دینا ہوگی۔

☆☆☆

پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل میں جالندھر میں پیدا ہوا۔ جہاں مسلمان، سکھ اور ہندو سب مل جل کر رہتے تھے۔ جالندھر کے نواح میں ہماری ایک سو ایکڑ سے بھی زیادہ زمین تھی۔ میں اور میرا بڑا بھائی عبدالخالق کھیتی باڑی کر کے رزق کماتے اور حلال کی کمائی کماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں کسی قسم کی فکر نہ تھی۔ گھر میں خوش حالی تھی۔ سب صحت مند تھے۔ اسی صحت مندی اور خوش حالی کا نتیجہ ہے کہ ہم دونوں بھائی ابھی تک زندہ اور سلامت ہیں۔ بھائی عبدالخالق تو پرسکون اور خوش حال ہیں، مگر میں جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اپنے دن پورے کر رہا ہوں۔

جالندھر میں ہمارا پڑوسی وکرم سنگھ تھا۔ اس کا ہمارے ابا سے یارانہ بھی تھا۔ وہ بھی زمینداری ہی کرتا تھا۔ وکرم سنگھ کی بیٹی نیتو میری ہم عمر تھی۔ ہم بچپن میں اکٹھے ہی کھیلا کرتے تھے۔ نیتو گھر کی اکلوتی اور لاڈلی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ بہت ہی نڈر بھی تھی۔ اگر میرا محلے کے کسی بچے سے جھگڑا ہوا جاتا تو نیتو میرا ساتھ دینے کی خاطر خم ٹھونک کر سامنے آ جاتی اور ہم دونوں مخالف کی درگت بنا دیتے۔

جب ہم جوانی کی حدود میں داخل ہوئے تو بچپن کی دوستی نے محبت کا روپ دھار لیا۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے مابین مذہب کی اونچی اور مضبوط دیوار حائل ہے اس لیے ہم کبھی ایک نہ ہو سکیں گے۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ نیتو سے دور ہی رہوں، مگر نیتو کے حسن اور بچپن کی محبت نے ایسا نہ ہونے دیا۔ وہ تھی ہی اتنی سندر کہ پارہ بن کر میری نس نس میں سما چکی تھی۔

وہ مجھے اکثر کہتی تھی۔ ”سرور! تم میری پہلی اور آخری چاہت ہو۔ میں جانتی ہوں ہمارے درمیاں مذہب کی خلیج حائل ہے، مگر محبت رنگ و نسل نہیں دیکھتی۔ وقت آیا تو میں تمہاری خاطر مسلمان ہو جاؤں گی۔“

نیتو کی باتوں میں سچائی تھی۔ میں اس کی محبت کا معترف تھا۔ یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب دوسری عالم جنگ شروع ہوئی تھی۔ لوگوں کی فوج میں زبردستی بھرتی کی جانے لگی۔ تو میں بھی فوج میں ملازم ہو گیا۔ یہ 1937ء کی بات ہے اس وقت میری تنخواہ بارہ روپے ماہوار تھی۔ جب برطانیہ نے ہندوستان سے بھرتی کیے گئے سپاہیوں کو برما بھیجنا شروع کیا تو ہندوستان نے اس کے خلاف احتجاج کیا مگر اس کی ایک نہ سنی گئی جب کئی اور سپاہیوں کو برما جانے کے لیے تیار رہنے کا وقت آیا تو تمام گھر والے مجھے مل کر رو پڑے کہ نہ جانے یہ جنگ کب ختم ہوگی اور کوئی زندہ بچے گا بھی یا نہیں۔

نیتو نے بھی مجھے برستی آنکھوں سے الوداع کہتے وقت کہا۔ ”سرور! تم سے جدائی بڑی اذیت ناک ہے پر کیا کروں مجبوری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم زندہ سلامت واپس آؤ گے۔ فکر نہ کرنا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں تمہاری ہوں اور مرتے دم تک تمہارا انتظار کروں گی۔“

میں بھی نیتو سے ایسے ہی عہد و پیاں کر کے برما روانہ ہو گیا۔ اس وقت برما میں بہت زیادہ گھنے جنگل تھے۔ ہمارے مورچے انہی جنگلوں میں تھے۔ ان جنگلوں میں ہم نے جنگلی جانوروں اور پرندوں کے سوا کسی انسان کو نہ دیکھا تھا۔ عجیب بے بسی اور بے کسی کی زندگی تھی۔ لگتا تھا جیسے دنیا سے ہمارا رابطہ کٹ گیا ہے۔ ہماری خوراک ہیلی کاپٹر کے ذریعے پہنچائی جاتی تھی۔ انہی گھنے جنگلات میں رہتے ہوئے ایک دن ہم پر انکشاف ہوا کہ ان جنگلوں میں ایسے انسان بھی آباد ہیں جنہوں نے کبھی جنگل سے باہر کی فضا تک نہیں دیکھی۔ یعنی جنگل سے شروع ہو کر ان کی زندگی جنگل میں ہی ختم ہو جاتی تھی۔ انہوں نے جب ہم لوگوں کو یہاں دیکھا تو گھبرا کر ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم

نے مجبوراً اپنے کیمپ خالی کر دیے۔ جنگلیوں نے ہمیں تلاش نہ کیا البتہ کیمپ سے کھانے پینے کی اشیاء اٹھا کر بھاگ گئے۔ رات تو ہم نے جنگل میں چھپ کر ہی گزاری اگلے روز ہم نے محفوظ مقامات کو اپنا مسکن بنایا۔ دن یوں ہی گزرتے رہے۔ نیتو کی یادوں میں بھرے صبح و شام خوب صورت تھے ورنہ اس جنگل میں رہنے کے لیے کیا تھا۔ خدا خدا کر کے جنگ ختم ہوئی اور ہم ہندوستان لوٹ آئے۔

برسوں بعد نیتو سے میرا سامنا ہوا تو وہ پھول کی مانند کھل اٹھی۔ وہ بے قراری سے میرے پاس آئی اور بولی۔ ”سرور! میں نے کہا تھا ناں کہ میرا پیار سچا ہے۔“ وہ فخر سے کہنے لگی۔ ”میرا یہی سچا پیار تمہیں زندہ سلامت واپس لے آیا ہے۔“ پھر وہ افسردہ لہجے میں کہنے لگی۔ ”باپو نے میری منگنی برادری ہی کے ایک شخص رنجیت سے کر دی ہے۔ رنجیت سنگھ بڑا اکھڑ اور بدمعاش قسم کا انسان ہے۔“

”کیا تو اس بدمعاش سے شادی کرے گی؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں نیتو سے پوچھا۔

”نہیں سرور! میں رنجیت سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ میں تو اپنی زندگی کی سانسیں تمہارے نام کر چکی ہوں۔“ یہ کہہ کر نیتو نے اپنی مرضی سے میری زبانی کلمہ شریف پڑھا اور مسلمان ہو گئی۔ میں نے اس کا اسلامی نام بانو رکھا۔ نیتو کے مسلمان ہونے کا راز صرف ہم دونوں کو معلوم تھا اور فی الحال ہم نے اسے راز میں ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ نیتو تو مجھ سے خفیہ طور پر شادی بھی کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔

اس نے میرے انکار کا برا منایا اور کہنے لگی۔ ”لگتا ہے تمہیں مجھ سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی میں تم سے کرتی ہوں۔“

”نہیں بانو ایسی بات نہیں ہے۔ تم میری مجبوریوں کو سمجھو۔ مناسب وقت آنے پر میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا۔“

انہی دنوں حصول پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی اور جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے سکھ اور ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ اس عالم میں، میں کوئی بھی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا مگر نیتو کو کسی بات کی پروا نہ تھی۔ وہ کہتی تھی۔

”سرور! تمہارے پیار نے مجھے بہادر بنا دیا ہے۔ اب میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“

بالآخر پاکستان بن گیا تو ہم نے بھی پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا۔ نیتو کو معلوم ہوا تو وہ بھی میرے ہمراہ پاکستان جانے کو تیار ہو گئی۔ میں انکار نہ کر سکا اور اسے ساتھ لے جانے پر رضا مند ہو گیا کہ میں پاکستان جا کر اس سے شادی کر لوں گا۔ ہماری تیاری میں تاخیر ہو گئی۔ ہندوستان بھر سے مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں آ رہی تھیں۔ ہندو اور سکھ لوٹ مار اور قتل و غارت گری پر اتر آئے تھے۔ ہمیں بھی ایسی ہی موت اور ذلت نظر آ رہی تھی مگر پھر بھی ہم پر پاکستان جانے کی ہی دھن سوار تھی۔

نشان سنگھ ہمارے محلے کا ہی رہنے والا تھا۔ وہ بد لحاظ، بدتمیز اور نیتو کے بہت سارے چاہنے والوں میں سے ایک تھا، مگر نیتو اسے گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ نیتو کی بے اعتنائی پر وہ جل کر اکثر کہتا تھا۔ ”اتنا غرور نہ کر، کہ جانے کب تقدیر تجھے میرا محتاج بنا دے۔“

جب سے میری اور نیتو کی محبت کی خبر لوگوں کو ہوئی تھی نیتو کا منگیتر رنجیت سنگھ میرا دشمن بن گیا تھا۔ دوسری طرف رنجیت اور نشان سنگھ کی بھی آپس میں نہ بنتی تھی۔

پاکستان روانگی سے ایک دن قبل سکھوں نے مسلمانوں کے قافلے پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں جہاں کئی مسلمان مارے گئے وہاں رنجیت سنگھ بھی زندگی ہار گیا۔ شاید مسلمانوں نے مقابلہ کیا ہوگا مگر نیتو کا کہنا تھا کہ رنجیت کو نشان سنگھ نے قتل کیا ہوگا۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھایا ہے تاکہ اس پر کوئی بھی شک نہ کر سکے۔ میں اور نیتو رنجیت سنگھ کے مارے جانے پر مطمئن ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا کہ نیتو اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ مسلمان ہو گئی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے وہ بھی ہمارے ساتھ پاکستان جائے گی۔ میرے گھر والے بھی نیتو کو جانتے اور پسند کرتے تھے۔ اس لیے سب نے

میرے اس فیصلے کی حمایت کی۔

آدھی رات کا وقت تھا جب ہم ایک ٹرک پر سوار ہو کر سرحد کی جانب روانہ ہوئے۔ اس ٹرک میں ہمارے خاندان کے علاوہ کے اور لوگ بھی شامل تھے۔ نیتو کو میں نے برقع پہنا دیا تھا تاکہ وہ مسلمان دکھائی دے اور پہچانی نہ جائے۔ ٹرک ڈرائیور بڑی احتیاط سے منزل کی طرف بڑھ رہا تھا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہماری روانگی کی خبر سکھوں کو ہو گئی۔ ابھی ہم نے ایک گھنٹے کا ہی سفر طے کیا ہو گا کہ سکھوں کے ایک دستے نے ہمارا راستہ روک لیا اور ہم سب کو ٹرک سے نیچے اتار لیا۔ ان کا سردار نشان سنگھ تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ نیتو ہمارے ساتھ پاکستان جا رہی ہے۔ میں نے نشان سنگھ کو دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور موت مجھے آنکھوں کے سامنے ناچتی نظر آنے لگی۔ نشان سنگھ نے بھی ہمیں پہچان لیا تھا۔ جب اس نے عورتوں کے جسم اور سر سے چادریں اور برقعے اتروائے تو نیتو کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔

''ان سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔'' نشان سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

''نشانے!'' نیتو بلند آواز میں کہہ کر آگے بڑھی اور سینہ تان کر نشان سنگھ کے مقابل جا کر کہنے لگی۔ ''یہ ظلم مت کر۔ ہم سب کو جانے دے۔''

''میں ان سب کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' نشان سنگھ نے چیخ کر کہا۔

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''خاص کر سرور کی تو بوٹی بوٹی کر ڈالوں گا۔ یہ میرے پیار کا دشمن ہے۔ تم نے اسی کی وجہ سے ہمیشہ مجھے ذلیل اور نظر انداز کیا۔ آج تقدیر تم دونوں کو ایسے عالم میں میرے سامنے لائی ہے کہ آج میں تم دونوں کا غرور مٹی میں ملا دوں گا۔''

''نشانے! ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ اس سے قبل کے تمہارا ہاتھ میری طرف بڑھے میں جان دے دوں گی، مگر تمہاری خواہش پوری نہ ہونے دوں گی۔''

نیتو نے اتنا ہی کہا تھا کہ نشان سنگھ نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے نشانے پر لے لیا۔

''نشانے!'' نیتو ہاتھ باندھ کر اس سے کہنے لگی۔ ''تم سرور کچھ نہیں کہو گے۔ اس کو پاکستان جانے دو، میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تم سے شادی کر لوں گی۔''

نیتو کے یہ الفاظ سن کر نہ صرف میں بلکہ نشان سنگھ بھی حیران رہ گیا۔ اس نے نیتو کی بات مان کر مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

''سرور! مجھے معاف کر دینا میں اپنا وعدہ نہیں نبھا سکی۔'' نیتو میرے قریب آ کر آنکھوں میں آنسو لیے کہنے لگی۔ ''مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے اور تمہاری جان کی خاطر میں اس سے بڑی قربانی بھی دے سکتی ہوں۔'' یہ کہہ کر نیتو نشان سنگھ کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ نشان سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو تاکید کی کہ وہ ہمارے ٹرک کو نہایت ہی حفاظت سے سرحد پار کرا دیں۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور ہمیں حفاظت سے پاکستان کی سرحد تک پہنچایا۔ میں ابھی تک حیران تھا کہ نیتو کیسی عورت تھی کہ میری زندگی کی خاطر اس نے اپنے آپ کو جہنم میں جھونک لیا تھا۔ اس نے اپنی منزل گم کر کے مجھے میری منزل دلا دی۔

☆☆☆

ہمیں پاکستان میں بورے والا میں زمین اور رہنے کی جگہ مل گئی۔ ہم یہاں ہی آباد ہو گئے۔ جالندھر میں ہماری بہت زیادہ زمین تھی۔ یہاں ہمیں اس کی نسبت کم رقبہ ملا تھا۔ ہم دونوں بھائیوں نے یہاں بھی خوب محنت کی اور مزید زمین خرید لی۔ چند سال بعد میں نے شادی کر لی۔ میری بیوی کا خاندان پہلے ہی بورے والا میں آباد تھا۔ میری بیوی ان پڑھ، سادہ لیکن نہایت ہی شریف خاتون تھی۔

زندگی کا نیا سفر شروع ہوا اور میں اتنے عرصے میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔ وحید سب سے بڑا اور لاڈلا تھا۔ چھوٹی بیٹی نذیراں ابھی دو سال ہی کی تھی کہ میری بیوی رضائے الٰہی سے فوت ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد میں نے دوسری شادی کر لی۔ جس میں سے میرا ایک بیٹا اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

نیتو کو میں ابھی تک بھلا نہ پایا تھا۔ اس کی قربانی مجھے یاد تھی۔ میں اپنی زندگی کو اس کا مرہون منت سمجھتا تھا۔ ایک روز نہ جانے میرے من میں کیا سمائی کہ میں نے ایک خط نشان سنگھ کے نام لکھا اور جالندھر کے پتے پر پوسٹ کر دیا۔ اور اس سے درخواست کی کہ وہ ماضی کو بھلا کر مجھے موجودہ حالات سے آگاہ کرے۔ میں نے اسے اپنے تمام حالات، شادی اور بچوں کے متعلق بھی لکھا اور ساتھ ہی اسے پاکستان آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔

دو ماہ بعد میرے اس خط کا جواب آ گیا۔ وہ خط نیتو کی بیٹی بلونت نے لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کا باپ نشان سنگھ فوت ہو گیا ہے۔ ماں زندہ ہے اور میں اسی کے کہنے پر خط لکھ رہی ہوں۔ میری ماں نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں اور سلام کہہ رہی ہیں۔ آپ کا خط پا کر ماں بہت خوش ہوئی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اگر زندگی ہوئی تو ایک بار ملاقات ضرور ہو گی۔ یوں نیتو اور اس کی بیٹی سے میری خط و کتابت شروع ہو گئی۔ انہوں نے مجھے جالندھر آنے کی دعوت دی مگر میں نے انہیں لکھا کہ پہلے وہ میرے پاس آئیں اس کے بعد میں بھی جالندھر آؤں گا۔

☆☆☆

میری زمین اب دس ایکڑ کے لگ بھگ ہو گئی تھی۔ زمینداری ہی چل رہی تھی۔ میں نے اب مزارعے بھی رکھ لیے تھے۔ ان کی رہائش کا بندوبست گاؤں سے باہر ڈیرے پر تھا۔ میں ان کا بہت خیال رکھتا تھا، انہیں کوئی تکلیف اور پریشانی نہ ہونے دیتا تھا، مگر پھر بھی وہ ہیرا پھیری کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ نزد کی گاؤں کے چوہدری دلاور سے میرا زمینوں کا جھگڑا چل رہا تھا۔ وہ نہایت ہی کمینہ خصلت شخص تھا اس نے میری کی زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ نوبت لڑائی، مار کٹائی تک بھی جا پہنچی تھی۔ تھانے اور عدالت کے چکر لگتے رہتے تھے۔ چوہدری دلاور ہمیشہ مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہتا اور میرے مزارعوں کو میرے خلاف اکساتا بھی تھا۔ کئی کو تو وہ لالچ دے کر اپنے پاس لے گیا تھا۔ میں دلاور کی طرف سے ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ میں ایک صلح جو انسان تھا۔ لڑائی جھگڑے اور تھانے کچہریوں کو ناپسند کرتا تھا مگر مجبوراً ان کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

میری اولاد! اب جوان ہونے لگی تھی۔ میرا بڑا بیٹا میری ہی طرح گھبرو جوان تھا۔ شکل و صورت بھی اس کی خوب تھی، مگر پڑھائی کے معاملے میں وہ صفر تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے فوج میں بھرتی کراؤں گا مگر اس کا دھیان زمینداری کی طرف ہی تھا۔ میں نے بھی زبردستی نہ کی اور اسے زمینداری کی طرف لگا دیا۔ میں نے اس پر اعتماد کر کے لین دین کے معاملات بھی اس کے سپرد کر دیے مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ ہیرا پھیری کرنے لگا ہے۔

بعض اوقات وہ گھر سے بھی رقم چرا لیتا۔ میں نے کبھی اس سے باز پرس نہ کی۔ مزارعوں کے ساتھ اس کی خوب بنتی تھی۔ وہ زیادہ وقت باہر کھیتوں میں اور ان کی رہائش گاہ پر ہی گزارتا تھا۔ مجھے جلد ہی اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ دو مزارعوں کی بیویاں نہایت خوب صورت تھیں مگر ان کا کردار ایسا نہ تھا۔ ان کی دو جوان بیٹیاں تھیں۔ وحید ان کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ وہ ان کو اناج بھی دیتا تھا اور رقم بھی۔ انہوں نے وحید کو بے وقوف بنا رکھا تھا اور اس سے مال بٹور رہی تھیں۔

میں نے وحید کو سمجھانے اور منع کرنے کی بجائے ان مزارعوں کو ہی نکال دیا۔ وہ چوہدری دلاور کے پاس فریاد لے کر گئے کہ میں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ چوہدری دلاور نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا مگر وحید پھر بھی باز نہ آیا۔ وہ چوہدری دلاور کے گاؤں جا کر بھی ان سے ملنے لگا۔ وہاں ہی اس کی ملاقات چوہدری دلاور کی بیٹی حضوراں سے ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پسند بھی کر لیا۔ یہ خبر چوہدری دلاور کو بھی مل گئی۔ اس نے حضوراں کو منع کیا اور نہ ہی وحید کو اپنے گاؤں آنے سے روکا، بلکہ اس نے وحید کی حوصلہ افزائی اور خاطر تواضع شروع کر دی۔

ایک روز وہ اسے کہنے لگا۔ ''اگر تمہارا باپ تمہارے لیے حضوراں کا رشتہ مانگنے آئے تو میں انکار نہ کروں گا۔''

جب وحید نے میرے سامنے چوہدری دلاور کی بیٹی کے رشتے کی بات کی تو میں غصے میں آگ بگولا ہوگیا۔ میں نے اس روز وحید کی خوب خبر لی اور اسے احساس دلایا کہ دلاور میرا جانی دشمن ہے اور میں دشمن کی بیٹی کو بہو بنالوں یہ ناممکن ہے۔

''میری سگی ماں زندہ ہوتی تو وہ میری خاطر رشتہ مانگنے چوہدری دلاور کے پاس ضرور جاتی۔'' میرا انکار سن کر وحید نے باغیانہ لہجے میں کہا۔ ''ابا جان! آپ میرے ارمانوں کے قاتل نہ بنیں۔''

میں نے تحمل سے اسے اونچ نیچ سمجھائی اور کہا کہ تم گاؤں میں کسی بھی لڑکی کا نام لو، میں تمہاری شادی اس سے کرادوں گا، مگر چوہدری دلاور کے گھر میں کبھی نہیں جاؤں گا۔

وحید نے بہت ضد کی، مگر میں نے اس کی بات نہ مانی..... اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وحید نے راتیں بھی ڈیرے پر گزارنی شروع کردیں۔ وہ گھر آتا بھی تو کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ جس کی وجہ سے گھر کا ماحول افسردہ سا رہنے لگا۔ میں نے گھر میں کشیدگی دیکھی تو سوچا اپنی ضد چھوڑ دوں اور وحید کے رشتے کے لیے بات کرلی لوں۔ میں نے اپنی بیگم کو ہمراہ لیا اور دلاور کے پاس چلا گیا۔ دلاور نے میرے دست سوال کو پھیلا دیکھ کر کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر میری کچھ شرائط ہیں۔''

''کہو کیا شرائط ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری جن زمینوں پر میرا قبضہ ہے وہ میرے پاس رہیں گی۔ اس کے علاوہ تم اپنی جائیداد کا آدھا حصہ حضوراں کے نام کردو گے۔''

''میں تمہاری کوئی شرط نہیں مان سکتا۔'' میں نے دوٹوک جواب دیا۔

''تو پھر رشتے سے انکار سمجھو۔'' دلاور بولا۔

میں نے مزید کوئی بات نہ کی اور واپس آ گیا۔ وحید نے ساری باتیں سن کر کہا۔ ''ابا جان! آپ چوہدری دلاور کی شرائط مان لیں۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

میرا جواب سن کر وحید کا چہرہ لٹک گیا۔ اس نے پھر گھر آنا چھوڑ دیا اور رات ڈیرے پر گزارنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے گاؤں کے لوگوں سے میرے خلاف ہی باتیں کرنا شروع کردیں۔ میں اس کی ہر بات سنتا مگر خاموش رہتا کہ اس طرح لوگ تماشا دیکھیں گے اور اپنی ہی رسوائی ہوگی، مگر وحید کو کون سمجھاتا۔ گاؤں کے لوگ تو تماشائی تھے، کوئی بھی اسے سیدھی راہ دکھانے والا نہ تھا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھ سے الجھ پڑتا۔

وہ جب بھی حضوراں اور مزارعوں کی بیویوں سے ملتا تھا وہ اسے میرے خلاف بھڑکا دیتیں۔ وہ وہاں سے سیدھا گھر آتا اور الٹی سیدھی باتیں کرکے ڈیرے پر چلا جاتا۔ مجھے روزانہ کی رپورٹ ملتی رہتی تھی۔ ڈیرے پر اس کے لفنگے دوست بھی آنے لگے تھے۔ جوئے اور نشے کی لت میں لتھڑے یہ جوان رات دن وہاں محفلیں جمائے رکھتے۔

ایک روز وحید چوہدری دلاور کے گاؤں حضوراں سے ملنے گیا تو چوہدری دلاور نے اسے ڈانٹ دیا اور آئندہ اسے گاؤں آنے سے منع کردیا۔ کچھ ہی عرصے بعد پتا چلا کہ دلاور نے حضوراں کی شادی کردی ہے۔ اس کے بعد وحید اس کے گاؤں نہ گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وحید کی شادی برادری میں کردوں مگر وہ نہ مانا۔ اب تو اس کے انداز ہی بدل گئے۔ وہ بدمعاش کہلانے لگا۔ اسے دوست بھی ایسے ہی مل گئے۔

میرا ڈیرا اب عیاشی کا اڈہ بن گیا تھا۔ جس نے مجھے گاؤں بھر میں رسوا کر ڈالا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ میں نے تنگ آ کر ایک روز تھانے میں اطلاع کردی۔ تھانے والوں نے چھاپہ مارا اور وحید اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر لے گئے مگر جلد ہی انہوں نے ان کو رہا کردیا۔ شاید تھانے والوں سے ک مکا ہوگیا تھا اور پھر سے پرانے دن لوٹ آئے۔

اسی دوران میں نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی کردی تھی۔ وحید کی طرف سے میں پریشان رہنے لگا تھا۔ میری تمام اولاد نہایت شریف اور فرمانبردار تھی مگر نہ

جانے وحید کس پر چلا گیا تھا۔ اس نے تو میری ناک کٹوا دی تھی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔

☆☆☆

ان ہی دنوں نیتو کی بیٹی کا خط ملا کہ وہ پاکستان آ رہی ہے۔ ان دنوں حسن ابدال میں پنجہ صاحب کا میلا آ رہا تھا۔ بلونت اس میں شرکت کے لیے آنے والے ایک قافلے کے ساتھ پاکستان آ گئی اور جب میلہ ختم ہوا تو میرے گاؤں چلی آئی۔ نیتو بیماری کی وجہ سے نہ آ سکی تھی۔ میرے تمام گھر والوں نے بلونت کی بہت خدمت کی اور اس کا بے حد خیال رکھا۔ بلونت ہو بہو اپنی ماں نیتو پر گئی تھی۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی اور نہایت ہی ذہین اور سمجھ دار تھی۔ جلد ہی علاقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ چوہدری سرور کے گھر ایک سکھنی آئی ہے۔ جو بہت ہی خوب صورت ہے۔ یہ سچ تھا کہ بلونت حسن اور خوب صورتی میں لاکھوں میں ایک اور بے مثال تھی۔

☆☆☆

اس روز چوہدری دلاور والے مقدمے کے سلسلے میں مجھے عدالت جانا تھا۔ لہٰذا میں صبح ہی صبح شہر چلا گیا۔ واپسی شام ڈھلے ہوئی۔ گھر پہنچا تو گھر کے ہر فرد کو پریشان دیکھا۔ پوچھنے پر جو خبر سنی اسے سن کر میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ بلونت کو میرا بیٹا وحید اور اس کے ساتھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

میں دیوانہ وار ڈیرے کی طرف بھاگا مگر وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ میں تمام رات دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتا رہا مگر بلونت کا نام و نشان نہ ملا۔ میں نے قسم کھائی کہ اگر بلونت کو کچھ ہوا تو میں وحید کو کبھی معاف نہ کروں گا۔

اگلے روز میں نے تھانے میں بلونت کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی۔ وہ دن بھی گزر گیا مگر بلونت کا پتا نہ چلا۔ اگلی رات بھی میں نے تڑپتے ہوئے گزار دی۔ میں سوچتا اور شرمندہ ہوتا کہ میں نیتو کو کیا جواب دوں گا کہ میں اس کی امانت کی حفاظت بھی نہ کرسکا۔ ندامت اور پشیمانی سے میرے آنسو بہنے لگے۔ نیتو نے میرے ساتھیوں کی زندگی کی خاطر زندگی بھر کا عذاب مول لیا تھا۔ ایک میں تھا کہ میرے ہی گھر سے اس کی بیٹی اغوا ہوگئی تھی۔

اگلے روز صبح کے وقت بلونت کی نوچی کھسوٹی لاش گاؤں کے باہر پڑی ہوئی ملی تو اسے دیکھ کر میں غصے سے پاگل ہوگیا۔ میں اس کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری بیٹی بے آبرو ہوگئی ہو۔ میری بیٹی قتل ہوگئی ہو۔

پورے علاقے میں بات پھیل گئی۔ میں رسوا ہو کر رہ گیا۔ مجھے کسی پل چین نہ تھا۔ وحید اور اس کے ساتھی غائب تھے۔ میں نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کرلی اور یوں چپ سادھ لی کہ جیسے کے ہوا ہی نہ ہو۔ یوں ہی کئی ماہ بیت گئے۔ لوگ بھی اس کہانی کو بھول گئے۔ وحید واپس آ گیا۔ اس کے ڈیرے کی رونقیں پھر لوٹ آئیں۔ میں اس صدمے کو نہیں بھولا تھا میرے اندر تو کئی ماہ سے آتش فشاں ابل رہا تھا۔

وہ دسمبر 1986ء کی ایک سرد رات تھی۔ میں اٹھا اور ڈیرے کے اردگرد پیٹرول چھڑکا اور پھر اسے آگ دکھادی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈیرا جل کر راکھ ہوگیا اس میں میرا بیٹا وحید اس کے ساتھی بھی کوئلہ بن گئے۔

صبح ہوئی تو میں خود ہی تھانے گھومنڈی پیش ہوگیا کہ میں چھ انسانوں کے قتل کا اقرار کرتا ہوں۔ جن میں میرا بیٹا بھی شامل تھا۔ مجھے گرفتار کرلیا گیا اور میرا کیس خصوصی عدالت میں بھیج دیا گیا۔ میں نے وہاں بھی اقبال جرم کرلیا۔ عدالت نے مجھے کئی بار سزائے موت کا حکم سنایا۔ میرے گھر والوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کی لیکن وہاں بھی میری سزائے موت بحال رہی۔ آج میں سزائے موت کے انتظار میں دن کاٹ رہا ہوں مگر مجھے اپنے جرم پر کوئی ندامت نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ روزِ محشر میں نیتو سے سرخرو ہو کر ملوں گا۔ میں اسے بتادوں گا کہ میں تمہاری بیٹی کی حفاظت تو نہ کرسکا مگر اسے برباد کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچا آیا ہوں۔ محبت اور امانت میں، میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ کیا میں نے غلط کیا ہے۔

☆☆

تهی دست

یاسمین ہاشمی

ایک قلم کار کا قصہ حالات نے اس کی زندگی میں مشکلات ہی مشکلات پیدا کردی تھیں۔ اس نے بہت جدوجہد کی اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے اور آخر کار وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جس کا ہر کوئی خواب دیکھتا ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی میں زمانے کی ٹھوکروں میں پلنے والی ایک خاتون داخل ہوئی تھی جو بعد میں نجانے کہاں گم ہوگئی تھی۔ اس کے دل میں اس کی محبت کا چراغ روشن تھا اسے امید نہ تھی کہ اس کا سامنا عمر کی اس منزل میں اس سے ہوجائے گا۔ پہلے وہ اس کے قابل نہ تھی اور اب جبکہ وہ بہت کچھ حاصل کرچکا تھا...... شاید وہ اس کے قابل نہ تھا۔

نیکی اور بدی دونوں ہی کو دل میں داخل ہونے کے لیے ایک لمحہ درکار ہوتا ہے

اس اجنبی، بے مہر و بے مروت شہر کی سڑکوں پر تین ماہ تک جوتیاں چٹخانے کے بعد جب میں بالکل ہی تنگ آ گیا تو میرا دوست عاشق میرے کام آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس بار جو بھی مالک مکان تم سے شادی کے متعلق پوچھے، کہہ دینا کہ شادی شدہ ہوں اور یہ کہ کمرہ ملتے ہی بیوی میرے پاس آجائے گی!

''مگر بیوی ہے کہاں......؟'' میں نے چڑ کر کہا۔

''وہ میں فراہم کردوں گا......''

''کیا؟'' میں قریب قریب چیخ کر بولا۔ ''تم......تم بیوی فراہم کردو گے؟''

''ہاں...... ہاں حیران کیوں ہوں؟''

''حیران کیوں ہوں۔'' میں چیں بہ جبیں ہوکر بولا۔ ''تم بیوی فراہم کردو گے۔ گویا بیوی نہ ہوئی سگریٹ کی ڈبیا ہوئی کہ جب جی چاہا، بازار سے خرید لائے۔''

''یار جمال بابو۔'' عاشق جھنجلا گیا، ''کمرہ لینا ہے تو جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو، خالی پیلی کا ہے کو مغز خراب کرتے ہو۔''

مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق عمل کرنا ہی پڑا۔ دو تین دن کے بعد پتا چلا کہ آشیانہ بلڈنگ میں ایک کمرے کا فلیٹ خالی ہے۔ میں فوراً سیٹھ عابد علی، زاہد علی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ضروری باتیں ہوگئیں تو حسب توقع اس نے پوچھا۔

''اور ہاں جناب آپ کی شادی ہوگئی ہے......؟''

میں نے سانس روک کر اور جبڑے بھینچ کر گویا بڑی ہمت سے کہا۔ ''جی ہاں......''

''اپنے میکے میں، لیکن جونہی کمرہ ملے گا۔ وہ آجائیں گی......''

''تو پھر ٹھیک ہے، آپ تین ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کردیجیے اور جیسے ہی آپ کی وائف آجائیں، آکر چابی لے جایئے گا۔''

تین ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کرتے وقت میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ میں کیا کررہا ہوں۔ کہیں

...ی بھی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ بھلا عاشق کا ...ا۔'' مانا کہ میرا دوست ہے لیکن شہر کا چھٹا ہوا ...عاش بھی تو ہے۔ پولیس کی بلیک لسٹ میں اس کا ...سب سے اوپر ہی ہوگا۔ تین چار بار جیل ...کا ہے۔ جیب کاٹنا مار پیٹ اور دھوکا دینا گویا اس ...بائیں ہاتھ کے کھیل ہیں۔ میں بھی کتنا گاؤدی ...ں کہ اس کی باتوں میں آگیا اور اس پر یقین کر بیٹھا ...وہ ایک عدد بیوی ایک زندہ اور ٹھوس حقیقت ہوتی ...۔ جوتے کی پالش نہیں کہ کسی بھی جنرل اسٹور سے ...ید لی۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ رقم ہاتھ سے نکل چکی ...ی اور...... اور اگر عاشق نے کچھ نہ کیا تو گویا یہ رقم ...ب ہی جائے گی اور اس میں کچھ بھی نہ کرسکوں گا۔

مگر یہ تو محض میرے اندیشے تھے۔ عاشق سچ مچ ...ت کا پکا نکلا۔ تیسرے ہی دن اس نے ایک عورت ...ے سامنے لاکر کھڑی کردی۔ سیاہ برقعے میں لپٹی ...ی اور بڑے اطمینان سے بولا۔

''لو یار جمال بابو یہ ہے تمہاری بیوی......''

کئی منٹ تک میں چپ چاپ کبھی عاشق کو اور کبھی سیاہ برقعے کو دیکھتا رہا۔ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے، ایک جیتی جاگتی عورت یوں کیسے کسی کی بیوی بن سکتی ہے۔ کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہا۔ کہیں یہ عاشق کا کوئی مذاق تو نہیں۔ مگر وہ سپنا نہیں تھا۔ وہ عورت سچ مچ میرے سامنے موجود تھی۔ سیاہ برقعے سے اس کے سانولے گداز ہاتھ جھانک رہے تھے۔ کنپٹی کے قریب چہرے کا کچھ حصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے تھوک نگل کر اور کچھ گھبرا کر بمشکل کہا۔

''مگر یہ ہیں کون......؟''

''مرجانہ......''

''مرجانہ......'' میں نے ایک بار اور تھوک نگلا...... ''مگر یار عاشق یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ میرے ساتھ کیسے رہ سکتی ہیں؟''

''رہ سکتی ہیں......'' عاشق نے اطمیان سے بیڑی جلائی۔

''تم پہلے جا کر چابی لے کر آؤ۔ پھر تم کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔''

بعد میں مجھے پتا چلا کہ میری بیوی دراصل شہر

کے بازار حسن سے آئی تھی۔ یہ بات تعجب خیز تھی کہ وہ اپنے ''کاروبار'' کو کچھ دن کے لیے ترک کر کے میرے ساتھ رہنے پر رضا مند ہو گئی تھی۔ مگر اس کی دو وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ اس کے عاشق کے ساتھ اچھے دوستانہ مراسم تھے۔ دوئم یہ کہ چند دن پیشتر اس کا ایک بدنام اور خطرناک غنڈے قربان سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ قربان نے دھمکی دی تھی کہ وہ مرجانہ کا چہرہ داغدار کر دے گا۔ مرجانہ خوف زدہ ہو کر کسی جگہ روپوش ہو گئی تھی مگر وہ وہاں زیادہ محفوظ نہیں تھی۔ خدشہ تھا کہ قربان کسی بھی وقت اسے تلاش کر لے گا۔ چنانچہ عاشق نے اس کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ کچھ وقت کے لیے میری بیوی بن کر میرے ساتھ رہے۔ اس تجویز کا فائدہ یہ تھا کہ ایک طرف تو مجھے فلیٹ مل جاتا اور دوسری طرف مرجانہ کو اچھی پناہ گاہ بھی میسر آ جاتی۔ اسے اس وقت تک میرے ساتھ رہنا تھا۔ جب تک قربان کے ساتھ صلح کی کوئی صورت نہ نکل آتی۔ چونکہ مرجانہ کے لیے یہ تجویز ہر طرح سے مفید اور قابل قبول تھی اس لیے وہ راضی ہو گئی۔ مرجانہ کی بات تو خیر الگ ہے۔ سوال میری ذات کا تھا میں بھلا ایک عورت کے ساتھ کیسے رہوں گا...... میں تو ویسے ہی عورت کے معاملے میں بے حد شرمیلا اور کسی حد تک بزدل ہوں۔ کسی اچھی بھلی شریف عورت سے بھی بات کرتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں۔ ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ جبکہ یہاں سامنا کسی شریف عورت سے نہیں۔ ایک منجھی ہوئی طوائف سے تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھی۔ شرم و حیات اور تہذیب و اخلاق نام کی کوئی چیز اس کے قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔ اس خاصے تیز و طرار مردوں کو چٹکیوں میں اڑا دینے والی ایک ہر فن عورت کے ساتھ مجھ جیسا بے وقوف آدمی بھلا کیسے رہے گا اور میرے اس خیال کی تصدیق ہونے میں دیر نہیں لگی۔ جب تعارف کے فوراً بعد مرجانہ نے نقاب الٹ دی اور بہت بے تکلفی کے ساتھ مسکرا کر بولی۔

''آداب عرض بابو جی......'' اس کی مسکراہٹ قطعی بازاری تھی بلکہ پیشہ ورانہ بھی۔

''آداب عرض......'' میں نے ذرا بوکھلا کر کہا۔ ''تت...... تشریف رکھیے۔''

مرجانہ کرسی پر بیٹھ گئی اور بغیر کسی جھجک کے اس نے میری سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر ایک سگریٹ نکالی۔ عاشق نے فوراً اس کی سگریٹ جلائی۔ مرجانہ نے ایک طویل کش لے کر دھواں فضا میں بکھیر دیا اور طائرانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتی ہوئی بولی۔ ''بابو جی عاشق کہتا تھا کہ تم کہانیاں لکھتے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں۔''

''تو پھر میری کہانی بھی لکھ دینا۔ میں کسی روز تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی۔''

''ضرور لکھ دوں گا۔''

عاشق کچھ دیر بعد چلا گیا تو میں نے مرجانہ کو بہارستان ہوٹل کی پیک زدہ دیواروں والے کمرے میں چھوڑ اور خود سیٹھ عابد علی، زاہد علی سے فلیٹ کی چابی لینے کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرے خیالات ابھی تک الجھے ہوئے تھے۔ مرجانہ کے ساتھ رہنا سوہان روح نظر آتا تھا۔ جانے وہ کیسی عورت ہے۔ پتا نہیں اس کا مزاج کیسا ہے۔ مجھے پہلے کبھی کسی طوائف سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں مرجانہ کے ساتھ نباہ کر بھی سکوں گا یا نہیں؟ وسوسے کیچوؤں کی طرح ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ مگر ساتھ ہی اس بات کی کسی حد تک خوشی بھی تھی کہ اب غریب الدین کے بوسیدہ دیواروں والے بہارستان ہوٹل کے گرد آلود کمرے اور بدمزا کھانے سے نجات مل جائے گی۔ چابی لے کر واپس آیا تو مرجانہ میری منتظر تھی۔ اتنی ہی دیر میں اس کا جی بہارستان ہوٹل سے اوب گیا تھا۔ میں نے بل ادا کر کے ایک رکشا پکڑا اور مرجانہ کو لے کر اپنے فلیٹ پر چلا آیا۔

مجبوری انسان کی زندگی میں جزو لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں، زندگی کے کسی موڑ پر کوئی مجبوری راستہ روک لیتی ہے اور آدمی کو وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ ایسی ہی صورت میرے ساتھ بھی

تھی۔ یوں شاید میں مرجانہ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتا۔ بدنامی کا خوف یا اپنی شرافت کے داغدار ہو جانے کا ڈر، بہرحال کوئی نہ کوئی جذبہ مجھے اس کی جانب دیکھنے سے بھی روک لیتا۔ لیکن اب مجبوری نے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ میں اس کے ساتھ فرضی ہی سہی لیکن شوہر بن کر رہنے پر تیار ہو گیا تھا۔

دراصل تین چار ماہ پہلے تک میں اپنے آبائی شہر میں تھا۔ کالج کی تعلیم ختم ہونے پر مجھے ایک کاغذ تھما دیا گیا تھا۔ جس پر سرٹیفکیٹ کے سنہرے الفاظ درج تھے۔ لیکن جب اس کاغذ کو جیب میں ڈال کر سڑکوں پر نکلا تو پتہ چلا کہ اس کاغذ کو دراصل فریم میں سجانا چاہیے۔ نوکری کے حصول کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں سڑکیں ناپتا رہا اور نوکری نہیں ملی۔ ماں باپ میری بے کاری سے پہلے ہی تنگ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ یہاں ہم کب تک تمہیں پالیں گے۔ کچھ کرو۔ مجبوراً میں نے اپنے شہر کو خدا حافظ کہا اور اس بڑے شہر میں چلا آیا۔ یہ شہر بہت بڑا ہے۔ آدمی کاہل اور کام چور نہ ہو اور خود نہ بھوکا رہنا چاہے تو دو روٹیاں پیدا کرنے کی صورت نکل ہی آتی ہے۔ مجھے بھی چند دن کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک دفتر میں قلم گھسنے کی نوکری مل گئی۔ مگر صرف نوکری ہی کافی نہیں تھی۔ اس شہر میں مستقل طور پر قدم جمانے کے لیے ایک مکان کا ہونا بھی ضروری تھا۔

لیکن جب فلیٹ یا کمرے کی تلاش شروع ہوئی تو پتا چلا کہ بیوی کا ہونا ضروری ہے۔ غیر شادی شدہ لوگوں کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شریف بھی ہوں گے۔ کیا پتا وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو تاکنا شروع کر دیں۔ چنانچہ جہاں بھی گیا، اس سوال نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر ماں باپ میرے پاس آنے پر راضی ہوتے تو اتنی دشواری نہ ہوتی۔ مگر انہوں نے صاف لکھ دیا تھا پہلے تم اچھی طرح قدم جما لو پھر ہم آنے کے بارے میں غور کریں گے۔ بدقسمتی سے عاشق کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ جس چھوٹے سے کوارٹر میں اس کی رہائش تھی۔ وہاں پہلے ہی دو آدمی اس کے ساتھ رہتے تھے اور مزید ایک آدمی کی گنجائش قطعی نہ تھی۔ ان حالات میں مرجانہ کی رفاقت ناگزیر ہو گئی۔ عاشق کا کہنا تھا کہ چند ہفتوں میں جب پڑوسیوں پر تمہاری شرافت کا ''سکہ'' بیٹھ جائے تو مرجانہ اپنے گھر چلی جائے گی اور تم اپنے ماں باپ کو بلا لینا۔ اس کے بعد کسی کو اعتراض نہ ہو گا۔

''اور اگر پڑوسیوں میں سے کسی نے اسے پہچان لیا تو......؟'' میں نے لرز کر عاشق سے پوچھا۔

''امید نہیں ہے۔ آشیانہ بلڈنگ میں سب شریف گرہست لوگ ہیں۔'' عاشق نے کہا۔ ''پھر بھی تمہاری احتیاط ضروری ہے میں نے مرجانہ کو بھی سمجھا دیا ہے۔''

وہ فلیٹ چھوٹا سا تھا لیکن دو افراد کے لیے اگر وہ میاں بیوی ہوں تو قطعی مناسب تھا۔ ایک کمرہ، چھوٹا سا صحن اور مختصر سا آنگن، کچن بھی چھوٹا لیکن خوب صورت تھا اور مرجانہ چونکہ سچ مچ میری بیوی نہیں تھی اس لیے میں نے صحن میں زمین پر بستر لگانے کا فیصلہ کیا۔ شام ہو چکی تھی اور مزید ایک چارپائی دوسرے دن ہی خریدی جا سکتی تھی۔ مختصر سامان قرینے سے رکھنے کے بعد میں نے مرجانہ سے کہا۔

''آپ تشریف رکھیں۔ میں بازار سے کھانا لے آتا ہوں۔ آج تو ایسے ہی چلے گا۔ کل سے گھر پر کھانا پکانے کا بندوبست کروں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' مرجانہ نے تکلفی سے کہا۔ ''بازار سے چار چھ پان اور قوام زردہ بھی لیتے آنا اور قینچی کے سگریٹ بھی۔ میں پان سگریٹ کے بغیر تو رہ ہی نہیں سکتی۔''

''بہتر ہے......'' میں نے سانس روک کر کہا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رات بھر مرجانہ کمرے میں سوتی رہی اور میں صحن میں کروٹیں بدلتا رہا۔ آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ ابھی تک یہ سب کچھ مجھے خواب سا نظر آتا تھا۔ کبھی فکر و تشویش میں گھر جاتا اور کبھی اپنے آپ پر ہنسی آنے لگتی۔ کیا کبھی کسی کی زندگی میں ایسا ہوا

ہوگا؟ کیا کبھی کوئی اجنبی عورت اس طرح کسی کی بیوی بنی ہوگی؟ شاید نہیں! مگر میرے ساتھ تو ہوا ہے اور وہ عورت اس وقت اس گھر میں موجود ہے اور ''میری بیوی'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ عورت بازارِ حسن کی سجی ہوئی طوائف ہے۔ اگر ایک بار یہ عورت میرے ساتھ باہر چلی جائے اور لوگ دیکھ لیں تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔ لوگ مجھے کیا سمجھیں گے۔ یہ خیال ہی اذیت ناک تھا۔ میں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ مرجانہ کو لے کر کبھی باہر نہیں جاؤں گا۔

نہ جانے مرجانہ کو کب تک میرے ساتھ رہنا پڑے۔ جب جائے گی تو شاید کچھ نہ کچھ رقم بھی دینی پڑے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اسے پان سگریٹ کا شوق بھی ہے۔ ممکن ہے شراب سے بھی دلچسپی رکھتی ہو۔ اگر اس نے کبھی فرمائش کی تو کیا میں انکار کرسکوں گا۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ ہر چند کہ ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر بھی شاید میں انکار نہ کرسکوں۔ تب پھر میں کیا کروں گا ہوسکتا ہے کہ لب اسٹک پاؤڈر وغیرہ بھی مہیا کرنا پڑے۔ گویا اگلے ایک دو ماہ کی آمدنی غرق ہوئی۔ یکایک مجھے عاشق پر غصہ آنے لگا۔ کم بخت نے یہ کیسا ظلم کیا ہے میرے ساتھ، ایک عورت ہی مہیا کرنا تھی تو کسی بوڑھی عوت کو میری ماں بنا کر لے آتا۔ بیوی کیا ضروری تھی اور وہ بھی طوائف، معاشرے کا سب سے گندہ طبقہ۔ اپنی عزت اور عصمت کو کوڑیوں کے مول بیچنے والی عورتیں۔ مرجانہ بھی اسی طبقے کی ایک فرد ہے۔ کوٹھے سے اتر کر میرے گھر میں چلی آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی وہ تمام برائیاں موجود ہوں گی جو ''کوٹھے'' کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مرجانہ کی چال ڈھال سے لے کر مسکراہٹ اور بات چیت تک ۔ ہر عادت سے بازاری پن ٹپکتا ہے۔ میں نے تصور میں مرجانہ کا سراپا دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کا رنگ سانولا تھا، قد ذرا نکلتا ہوا۔ چہرے کے نقش ونگار میں کوئی انفرادیت نہ تھی۔ عام سا چہرہ تھا۔ جیسا عموماً قبول صورت عورتوں کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پیشے کی پختہ کاری اور سوقیانہ پن چہرے سے جھلکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ البتہ اس کا جسم بہت خوب صورت تھا۔ بڑے دلاویز پیچ وخم تھے۔ گداز اور سڈول جیسے سانچے میں ڈھالا گیا ہو۔ اس کا جسم کسی طرح بھی ''بازار'' کی چیز نظر نہیں آتا تھا۔

پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آئی۔ یہ سب میں کیا سوچ رہا ہوں۔ کیا مجھے ایسی باتیں سوچنی چاہئیں، اگر ہاں تو پھر ان تمام کہانیوں کا کیا ہوگا جو میں نے جسم فروش عورتوں کے متعلق لکھی تھی۔ ان کہانیوں میں میں نے طوائفوں کو بہت مظلوم بنا کر پیش کیا تھا۔ طوائفیں پیدائشی طور پر آبرو باختہ نہیں ہوتیں۔ جنس کے بازار میں وہ خود کو دکان اس لیے نہیں بناتیں کہ آبرو ان کے نزدیک بے معنی شے ہے بلکہ اس لیے بناتی ہے کہ سماج نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ طوائفیں بھی بہرحال انسان ہیں۔ شرافت اور آبرو ان کے لیے بھی انمول چیزیں ہیں۔ وہ بھی اچھی بننا چاہتی ہیں۔ چادر اور چار دیواری کی قدر و قیمت انہیں بھی معلوم ہے۔ لیکن انہیں دھتکارنے والے تو قدم قدم پر ہیں، آگے بڑھ کر گلے لگانے والا کوئی نہیں۔ طوائفیں بری نہیں۔ یہ سماج برا ہے۔ یہ نظام اور اس کے قوانین برے ہیں۔ اس نظام کو بدل ڈالو۔ معاشرے کی یہ گندگی خود بخود ختم ہوجائے گی۔

''مگر اب ایک طوائف ہی اس کے گھر کے اندر والے کمرے میں موجود تھی اور میں لرزہ براندام تھا کہ کہیں میری شرافت داغدار نہ ہوجائے۔

رات یونہی بیت گئی۔ صبح اٹھ کر میں نے ناشتا تیار کیا اور پھر مرجانہ کو آزاد دی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی کسمسائی ہوئی بوجھل سی آواز سنائی دی۔

''کون ہے..... کیا بات ہے؟''

میں کافی نروس ہو رہا تھا۔ آواز سنبھال کر بولا۔

''میں ہوں ناشتا تیار ہوچکا ہے۔ آکر کرلیجیے۔''

چند لمحے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید مرجانہ کھڑی دیکھی ہوگی۔ پھر اس نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابھی تو صرف آٹھ ہی بجا ہے۔ تم کرلو۔ میں تھوڑی دیر بعد اٹھوں گی۔''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کس قدر گاؤدی

ہوں میں بھی۔ ایک طوائف سے صبح آٹھ بجے اٹھنے کی توقع کرتا ہوں۔ جبکہ دراصل یہ اس کے سونے کا وقت ہے۔ میں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ آئندہ کبھی مرجانہ کو صبح نہیں جگاؤں گا۔

پھر ناشتا کرکے میں دفتر چلا گیا۔

☆☆☆

شام کو دفتر سے آتے ہوئے میں ضروری سامان اور ایک چارپائی لیتا آیا۔ مرجانہ صحن میں کرسی پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں نے سامان رکھا اور اس سے پوچھا۔

''آپ نے دوپہر کا کھانا کھالیا تھا؟''

''ہاں۔'' اس کے جواب میں کافی روکھا پن تھا۔

''پڑوسیوں سے ملاقات ہوئی۔ کیا خیال ہے ان کے بارے میں؟''

''دو تین عورتوں سے ملاقات ہوئی۔ اچھے لوگ ہیں۔''

دراصل یہ ایک بڑی عمارت تھی۔ اس میں آٹھ فلیٹ تھے اور ہر فلیٹ میں درمیانے طبقے کے گھر گرہست لوگ آباد تھے اور اسی بنا پر سیٹھ عابد علی زاہد علی کسی غیر شادی شدہ کو فلیٹ نہیں دیتا تھا۔ سیٹھ جی نے مجھ سے کہا تھا۔ ''جو سچ پوچھیے جناب تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر کیا کیا جائے۔ میرے کرائے دار شریف اور وضع دار لوگ ہیں۔ وہ ابھی تک پرانے سماجی اور تہذیبی خیالات پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے جذبات کا احترام کرنا میرا فرض ہے اسی لیے میں غیر شادی شدہ لوگوں کو کرائے دار بنانے سے احتراز کرتا ہوں۔'' مگر بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ اصل وجہ کچھ اور ہی تھی۔ دراصل کچھ عرصہ پیشتر سیٹھ عابد علی زاہد علی خود بھی آشیانہ بلڈنگ ہی کے دو فلیٹوں میں اپنی پہلی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ اس وقت وہ اتنے زیادہ دولت مند نہیں تھے۔ مگر جب ان کی دولت میں اضافہ ہوا تو انہوں نے ایک ایسی لڑکی سے دوسری شادی کرلی جوان کی بڑی لڑکی سے صرف چار سال بڑی تھی۔ ان دونوں آشیانہ میں ایک غیر شادی شدہ نوجوان رہتا تھا۔ جو کہا جاتا ہے کہ بڑا بانکا سجیلا نوجوان تھا۔ آتے جاتے سیٹھ جی کی نئی نویلی بیوی کی نگاہ اس نوجوان سے لڑ گئی (نگاہوں میں یہ بڑی خرابی ہے کہ کہیں نہ کہیں لڑ جاتی ہیں) اور چونکہ نئی نویلی بیوی کو سیٹھ جی کا آشیانہ پسند نہ تھا۔ اس لیے ایک دن اس نے اپنے سارے زیور اور چند ہزار روپے بطور زادِ راہ ساتھ لیے اور اس سجیلے نوجوان کے ساتھ محبت کے سفر پر روانہ ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد سیٹھ جی نے تین کام کیے۔ اول یہ کہ انہوں نے ایک وسیع وعریض بنگلا بنوایا اور اس میں منتقل ہوگئے۔ دوئم یہ کہ انہوں نے تیسری شادی کی اور دو چوکیدار ملازم رکھے اور سوئم یہ کہ غیر شادی شدہ نوجوان سے شدید نفرت کرنے لگے۔ کیونکہ غیر شادی شدہ نوجوان، اگر وہ بانکے سجیلے بھی ہوں تو دوسروں کی بیویوں اور بیٹیوں کو ناکتے ہیں اور موقع ملے تو بھگا بھی لے جاتے ہیں۔ سیٹھ جی کو تو خیر میں دھوکا دے چکا تھا۔ لیکن اب سوال پڑوسیوں کا تھا۔ ان سے بہتر طور پر نباہ کرنا بہرحال مرجانہ کی ذمہ داری تھی۔ اس کی ذرا سی غلطی سارا راز فاش کرسکتی تھی اور گو کہ میں اسے اچھی طرح سمجھا چکا تھا مگر ایک بازاری عورت کا کیا بھروسا۔ کسی بھی وقت کوئی حماقت کرسکتی ہے۔ ایک طوائف کے ساتھ شریف آدمیوں کے درمیان رہنا مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے تلوار کی دھار چل رہا ہوں۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک اس دھار پر یونہی چلنا پڑے گا۔

چائے کے بعد میں نے کمر ہمت باندھی اور گھر کے کاموں میں جت گیا۔ مرجانہ کو صرف میرے ساتھ رہنا تھا اور کسی قسم کی ذمہ داری اس کے اوپر نہیں تھی ۔ ویسے بھی رقص وموسیقی کا جادو جگانے والی عورت سے جھاڑو برتن کی توقع کرنا حماقت تھی وہ یقیناً مجھے یہ بتا سکتی تھی کہ بھیرویں میں کتنی مرکیاں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ ارہر کی دال کو کہن سے بگھارنا چاہیے یا زیرے سے ۔ سب سے پہلے میں نے جھاڑو دی، پھر برتن دھوئے اور اس کے بعد باندی چڑھائی۔ مرجانہ کرسی پر بیٹھے مجھے دلچسپ

نظروں سے دیکھ رہی تھی اور میں خود اچھا خاصا مسخرہ محسوس کر رہا تھا۔ اپنا کھانا پکانا بری بات نہیں۔ میں پہلے بھی اس تجربے سے دوچار ہو چکا تھا۔ لیکن ایک عورت کے سامنے ہانڈی چلاتے اور روٹیاں بیلتے وقت خواہ مخواہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سر بازار سارے کپڑے کسی نے اتار دیے ہوں۔

کھانا تیار ہوا تو عاشق بھی آ گیا۔ ہم سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ پھر عاشق نے تاش کی گڈی نکالی اور رمی کی بازی جم گئی۔

عاشق میرا بچپن کا دوست ہے۔ برسوں پہلے جب ہمارا لڑکپن تھا۔ ہم اپنے آبائی شہر کے ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ہماری دوستی محلے میں مثالی بھی جاتی تھی۔ اسکول میں بھی ہم کئی جماعتوں میں ساتھ ہی رہے۔ مگر پھر اس نے اسکول چھوڑ دیا۔ وہ شروع ہی سے بہت شریر اور تند خو تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑائی جھگڑا کرنا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ جیسے جیسے وہ عمر کی منزلیں طے کرتا گیا۔ اس کا رجحان غنڈہ گردی کی طرف بڑھتا گیا۔ کئی آوارہ لڑکوں سے اس کے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ ابتداء میں اس نے سنیما کے ٹکٹوں کی بلیک کا دھندا اختیار کیا۔ کبھی کبھار چھوٹی موٹی چوریاں بھی کیں۔ پھر جب جوان ہوا تو باقاعدہ بدمعاش بن گیا۔ چوری اور بلیک چھوڑ کر غنڈہ گردی کرنے لگا۔ شہر کے نامور بدمعاشوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ عورت، جوا اور شراب اس کی زندگی کا جز بن گئے۔ میں ان دونوں کالج میں تھا اور ہر چند کہ ہمارے راستے الگ ہو گئے تھے۔ تاہم دوستی میں ذرا برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ بات اگرچہ عجیب ہے مگر سچ ہے۔ بچپن کی طرح جوانی میں ہم دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ عاشق اکثر مجھ سے کہتا تھا۔

''جمال تو میرا یار ہے۔ جس دن بھی میرے دل میں تیرے متعلق کوئی برا خیال آیا۔ اسی دن یہ رامپوری چاقو اپنے پیٹ میں گھونپ لوں گا۔''

اور اس میں شک نہیں کہ عاشق یاری نبھانا جانتا ہے.....!

پھر اسے آبائی شہر چھوڑنا پڑا۔ ہوا یہ تھا کہ بدمعاشوں کے دو گروہوں میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں طرف سے چاقو زنی کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا۔ نتیجے میں پولیس کو مداخلت کی زحمت برداشت کرنی پڑی گرفتاریاں ہوئیں۔ پھر مقدمہ چلا اور دو تین غنڈوں کو سزائیں ہوئیں جن میں عاشق بھی شامل تھا۔ سزا کاٹ کر واپس آیا تو شہر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ پولیس بات بات پر تنگ کرنے لگی تھی۔ مجبوراً اس نے شہر ہی چھوڑ دیا اور اس بڑے شہر میں چلا آیا۔ ہم دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا اور درحقیقت یہ عاشق ہی تھا جس نے مجھے اس شہر میں آنے اور ملازمت تلاش کرنے کی صلاح دی تھی۔ ورنہ اپنے شہر میں ہوتا تو شاید اب تک جوتیاں چٹخا رہا ہوتا.....!

یہاں بھی عاشق کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ دو تین جرائم میں ماخوذ بھی ہو چکا تھا اور ایک بار دو ماہ کی سزا بھی ہوئی تھی۔ میں ایک اچھا دوست ہونے کے ناتے اکثر اس کے طرز زندگی پر اعتراض کرتا تھا لیکن ایسے ہر موقعے پر عاشق ہنس دیتا۔ اس طرح مجھے دیکھتا گویا میں کوئی احمقانہ بات کہہ رہا ہوں۔ پھر کہتا۔

''یار جمال بابو تم پڑھ لکھ کر بھی جاہل ہی رہے.....''

''وہ کیوں.....'' میں جز بز ہو کر پوچھتا۔

''اس لیے کہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو اور خوابوں کی بات کرتے ہو۔ کبھی حقیقت کی دنیا میں آ کر دیکھو تو تمہیں پتا چلے کہ زندگی صرف ایک رومانی افسانہ ہی نہیں، بھوک کی جلن بھی ہے۔ بیکاری کا آسیب اور غریبی کا گناہ بھی ہے۔ ایک غریب آدمی صرف اس لیے اناج کے ایک ایک دانے کو ترستا ہے کیونکہ وہ کم علم اور مفلس ہے لیکن شریف ہے۔ اس لیے وہ اپنا حق صرف مانگتا ہے اور نہ ملنے پر شکوہ کرتا ہے۔ اگر میں بھی شریف بن جاؤں اور دکھوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ اسی اس لیے میں اپنا حق مانگتا نہیں، جھپٹ کر چھین لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے.....''

''وہ کیا.....؟''

''وہ یہ کہ اگر دنیا میں مجھ جیسے برے نہ ہوں تو

تمہاری شرافت بھی بے معنی ہو جائے گی۔ تم جیسے شرفا کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے!''

''عاشق کا یہ آخری استدلال اتنا وزنی ہے کہ میں پھر کچھ نہیں کہتا۔ چپ ہو جاتا ہوں اور اب تو یہ عادت تقریباً ترک ہی کر چکا ہوں۔ عاشق لاکھ برا سہی، بہرحال میرا دوست ہے اور دوستی میں شرطیں نہیں ہوتیں۔ یہ تو محض دلوں کے رابطے کا نام ہے۔ ہم دونوں مزاج اور خیالات کے اعتبار سے مانا کہ فاصلے پر ہیں مگر ہمارے دل بہرحال ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

زندگی ایک لگی بندھی ڈگر پر چل پڑی۔ ہر صبح دفتر جانا، شام کو واپسی، پھر بادر چی خانے کا دھندہ۔ یہ سوچ کر ڈ ھارس بندھی رہتی کہ جلد ہی اس صورت حال سے نجات مل جائے گی۔ میں نے اماں باپ کو مکان ملنے کی اطلاع دے دی تھی۔ یقین تھا کہ چند ہفتوں تک وہ میرے پاس آ جائیں گے اور گر نہ بھی آئے تو ہو سکتا ہے کہ رہائش کا کوئی دوسرا بندوبست ہو جائے۔ خود مرجانہ کا ارادہ بھی میرے ساتھ زیادہ دن رہنے کا نہیں تھا۔ وہ بہت بے زاری سے وقت گزار رہی تھی۔ سارا دن پلنگ پر لیٹی میری کتابیں پڑھتی رہتی۔ رات بھر لمبی تان کر سوتی۔ اس نے توقع کے مطابق کسی کام میں دلچسپی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جب میں الٹا سیدھا کھانا پکا کر اس کے آگے رکھتا تو بے دلی سے کھا لیتی۔ کبھی کبھار اعتراض بھی کرتی۔ اب ہمارے درمیان پہلی اجنبیت نہیں تھی۔ ہم کافی بے تکلف ہو گئے تھے اور ہونا بھی تھا کہ آخر ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہے تھے.....!

پھر ایک دن مرجانہ نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔

☆☆☆

اسے اپنے بچپن کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں تھا لیکن اتنا اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ ایک طوائف ہی کی لڑکی تھی۔ گھنگروؤں کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ کے درمیان اس نے آنکھ کھولی تھی۔ اور اسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ تھوڑی بہت کتابی تعلیم کے علاوہ اسے ناچ گانے کی تعلیم بھی دی گئی تھی۔ مگر یہ بیتے دنوں کی بات ہے۔ اس زمانے میں اس کے خاندان کا آبائی پیشہ ناچ گانا ہی تھا۔ کیونکہ ان دنوں قدر دان موجود تھے جو رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا مزاج اور مذاق رکھتے تھے۔ مگر اب وقت بدل گیا تھا۔ قدر دان نہیں رہے تھے۔ ناچ گانے کے فن کی قدر و منزلت ختم ہو گئی تھی۔ لہٰذا مجبور ہو کر اسے ناچ گانے کے ساتھ ساتھ عصمت فروشی بھی اختیار کرنی پڑی تھی۔

مرجانہ اس کا اصل نام نہیں تھا۔ جب میں نے پوچھا تو کہنے لگی۔ ''نام میں کیا رکھا ہے، میں جہاں سے آئی ہوں وہاں ناموں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہاں نام تو صرف پہچان کے لیے رکھ لیے جاتے ہیں، ورنہ اصل اہمیت صرف ناز و ادا، عشوہ و غمزہ اور حسن و جوانی اور جسم کے پیچ و خم کی ہوتی ہے۔ ایک طوائف کے لیے نام محض بے کار ہے۔ عاشقوں کی تعداد اصل چیز ہے۔'' پھر اس نے بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ ''ہم طوائفوں کا تعارف نام سے نہیں جسم سے ہوتا ہے۔''

وہ سچ مچ کسبی تھی۔ صرف پیشے کے اعتبار سے ہی نہیں۔ مزاج اور عادات کے لحاظ سے بھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی روح تک بازاری ہے۔ کیونکہ ان دونوں قدر دان موجود تھے جو اگرچہ وہ دھندا نہیں کر رہی تھی۔ گھر سے باہر جانے کا کوئی مواقع نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو اپنا آپ دکھانے کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ پھر بھی ہر صبح وہ بڑے اہتمام سے عامیانہ قسم کا میک اپ کرتی تھی۔ پاؤڈر کی گہری تہہ چڑھاتی، پلکیں بناتی۔ ہونٹوں پر اتنی گہری لپ اسٹک لگاتی خون کا دھوکا ہوتا۔ کپڑوں کا انتخاب بھی سوقیانہ ہی ہوتا۔ کبھی کبھی گھٹیا قسم کی غزلیں گنگناتی۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ وہ سخت بور ہو گئی تو کمرے کا دروازہ بند کر کے گھنٹوں رقص کرتی رہی اور مجھے مجبوراً تعریف بھی کرنی پڑی۔

اس نے کئی عشق کیے تھے اور اپنے ہر عاشق کو خوب جی بھر کر لوٹا تھا۔ وہ ان کا ذکر کرتی تو خوب ہنستی۔ ان کا مذاق اڑاتی۔ الو کے پٹھے میرے پاس محبت کی تلاش میں آئے تھے۔ ہم رنڈیاں اگر محبت کرنے لگیں تو ہو جائے چھٹی۔ سارنگی کھائیں اور تنبورا چبائیں اور پھر

بھی دنیا کی نظر میں برے کے برے ہی رہیں.....!

ایسے مواقع پر بڑا جز بز ہوتا۔ ایک بار میں نے جل کر کہا..... ”محبت کا مذاق نہ اڑایئے۔ یہ بڑی نازک اور خوب صورت شے ہے۔“

”بکواس ہے.....“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”محبت کیا ہے، محض رات کی عیاشی۔“

”نہیں، محبت صرف جسموں کا ملاپ ہی نہیں، کسی کے لیے مٹ جانے کا جذبہ بھی ہے۔ آپ نے بچپن سے صرف سکوں کی جھنکار سنی ہے۔ اس لیے دل کی آواز کو نہیں پہچانتیں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ جب ایک گھر گرہست عورت شام کو گھر آئے ہوئے اپنے تھکے ماندے شوہر کے سامنے چائے کا گرم گرم پیالہ رکھتی ہے تو اس کا دل اور اس کی روح کیسی لطیف اور پاکیزہ خوشی سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ ایک مزدور جب صبح سے شام تک منوں بوجھ ڈھوتا ہے تو یہ سوچ کر اس کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ اپنے بچوں کے لیے کر رہا ہے۔“

”میں یہ سب کچھ جانتی ہوں۔“ مرجانہ نے تنک کر کہا۔ ”لیکن محبت گندم کی گرم گرم روٹی نہیں ہے کہ اس سے پیٹ بھی بھرا جا سکے!“

مرجانہ کو قائل کرنا بہت مشکل تھا، اس لیے میں نے کبھی اس سے زیادہ بحث نہیں کی۔

عاشق روزانہ آتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق قربان بدستور مرجانہ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ کس بنا پر مرجانہ اور قربان کے درمیان ان بن ہوئی تھی۔ تاہم مرجانہ نے یہ ضرور بتایا تھا کہ قربان نے اسے دھمکی دی ہے کہ وہ یا تو مرجانہ کا چہرہ بگاڑ دے گا یا اسے اپاہج کر دے گا تاکہ وہ باقی ماندہ زندگی سسک سسک کر گزارے۔ مرجانہ پولیس کے پاس بھی نہیں جا سکتی تھی کہ اس میں کتنی قباحتیں تھیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ پولیس قربان کو اس کے ارادے سے صرف وقتی طور پر باز رکھ سکتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے نہیں۔ بہتر صورت یہی تھی کہ قربان کے ساتھ سمجھوتا ہو جائے۔ عاشق قربان کو روک سکتا تھا یہ کم از کم کوشش کر سکتا تھا کہ وہ خود بھی بدمعاش تھا۔ مگر مرجانہ نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑائی جھگڑے اور خون خرابے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح بات کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ وقت گزرے گا تو قربان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور صلح کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ عاشق سے وقتاً فوقتاً ملنے والی اطلاعات سے پتا چلتا کہ مرجانہ کے گھر والے یعنی اس کی بڑی اماں اور استاد بانکے ستار نواز قربان سے صلح جوئی کی کوشش کر رہے تھے۔

کوئی بیس پچیس دن گزر گئے۔ یہ دن مرجانہ نے کچھ اس طرح گزارے تھے گویا قید زنداں کاٹ رہی ہو۔ بقول اس کے گھر میں پڑے پڑے اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ چند ایک بار اس نے باہر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے پان سگریٹ اور ناچ گانے کے ساتھ ساتھ سینما کا بھی بے حد شوق تھا۔ مگر میں اسے باہر نہیں لے گیا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی اسے پہچان نہ لے۔ اگرچہ اس کے پاس برقعہ تھا اور وہ اسے استعمال کر سکتی تھی۔ لیکن چوروں ہی کا کل دن چھوٹا نہیں ہوتا۔ شرافت بھی اکثر بزدلی کا دوسرا روپ بن جاتی ہے۔ ان گنت وسوسے طرح طرح کے روپ بھر کر ڈراتے ہیں۔ مگر جب ایک دن مرجانہ نے بہت اصرار کیا تو میں نے اسے سینما لے جانے کا ارادہ کر لیا۔ سوفٹ کی بلندی سے موت کے کنویں میں چھلانگ لگانے والے بہادر کی طرح میں نے بھی اپنی ہمت بندھائی۔ ضمیر کو مضبوط کیا۔ کوئی دیکھ لے گا تو دیکھ لے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ میں معاشرے کا کوئی اہم ترین فرد نہیں ہوں۔ میں تو محض ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہوئے لاکھوں کلرکوں کی طرح ایک عام کلرک، میرا کیا بگڑے گا۔ مفلس کے گھر چوری نہیں ہو سکتی اور جب دامن نہ ہو تو داغ کیسے لگ سکتا ہے۔ میرے پاس دامن کہاں ہے! ہاں زمانے اور وقت کے دیے ہوئے..... ان گنت داغ ضرور ہیں۔ تو پھر ایک اور سہی!

لیکن میں اس دن مرجانہ کو سینما نہیں لے جا سکا۔ نہ جانے کیسے ہوا۔ بہر حال ہو گیا۔ صبح کو وہ اچھی طرح

بھلی تھی۔ مگر شام کو میں گھر آیا تو اسے تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ چہرہ حدت سے تپ کر سرخ ہو رہا تھا اور وہ بے سدھ سی پلنگ پر پڑی تھی۔ پہلے تو میں گھبرا گیا۔ اب کیا کروں۔ کسی عورت کی تیمارداری کرنے کا موقع زندگی میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ میں نے دو چار الٹی سیدھی حرکتیں کیں تو اس نے دوا لانے کے لیے کہا اور تب میری سمجھ میں آیا کہ کیا کرنا چاہیے چنانچہ ڈاکٹر سے دوا لا کر اسے پلائی۔ پھر گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ دیا تو اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں وہیں اس کے سرہانے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تاکہ اس کا دل بہلا رہے۔

مرجانہ اس سے نہ جانے کیوں بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی میک اپ نہیں تھا۔ کپڑے بھی سادے تھے اور آواز میں پیشہ ورانہ کرختگی نہیں تھی۔ بلکہ نقاہت کے باعث خود بخود ایک نرمی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ مرجانہ اگر میک اپ اور بھڑکیلے کپڑوں سے بے نیاز رہے تو اس کی شخصیت میں خاصا نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ نگاہوں کو زیادہ بھلی لگتی ہے۔

وہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی اور اور میں سرد پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پر رکھتا رہا۔ کچھ دیر میں اس کا بخار کافی ہلکا ہو گیا تو میں نے کہا۔ ”آج کا فلم کا پروگرام تو خود بخود ملتوی ہو گیا۔“

”کوئی بات نہیں.....“ مرجانہ مسکرائی۔ ”کل یا پرسوں چلیں گے۔“

”ضرور، لیکن پھر نہ بیمار پڑ جایئے گا۔“

مرجانہ ہنس دی۔

میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کیا احساسات تھے۔ مگر مجھے اس کی تیمارداری کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ میرے پاس آئی تھی تب سے آج پہلی بار وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ اتنی اچھی کہ نگاہ بار بار اس کے چہرے پر جم جاتی تھی۔ میں نے سرد پانی کی ایک اور پٹی اس کی پیشانی پر رکھی اور پھر پوچھا۔

”مگر یہ ہوا کیسے؟ صبح تو آپ اچھی بھلی تھیں.....“

”پتا نہیں.....“ اس نے کہا۔ ”صبح طبیعت کچھ سست تھی۔ میں نے سوچا، شاید تھکن کی بنا پر ہے۔ لیکن دوپہر ہوتے ہوتے بخار ہو گیا۔“

”مجھے علم ہوتا تو آج دفتر نہ جاتا۔“

”کیوں؟“ اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے جواب دینا چاہا، لیکن خاموش رہا۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مرجانہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور نظریں جھکا لیں، اسے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ممنونیت کا تاثر اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔ ہم دونوں نے کچھ کہے بغیر بھی اپنے احساسات کا اظہار کر دیا تھا۔ چند لمحے بعد میں نے کہا۔

”آپ نے کھانا تو کھایا نہ ہو گا.....“

”نہیں.....“

”کوئی بات نہیں میں ابھی آپ کے لیے مونگ کی کھچڑی پکاتا ہوں۔“

اس روز پہلی بار مرجانہ نے تکلف سے کام لیتے ہوئے مجھے منع کیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں خوامخواہ زحمت کرو گے جو کچھ ہے۔ وہی کھا لوں گی۔“

مگر میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ مونگ کی کھچڑی پکا کر اسے کھلائی۔ نو بجے دوا کی دوسری خوراک دی۔ دس بجے گرم دودھ کا ایک پیالہ گیارہ بجے تک اس کا بخار نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ طوفان کی طرف جس تیزی سے بخار آیا تھا۔ اسی تیزی سے اتر بھی گیا۔ بس معمولی سی کمزوری رہ گئی تھی۔ میں نے اسے سو جانے کا مشورہ دیا تو وہ کہنے لگی۔

”اب تم بھی جا کر سو جاؤ، میں ٹھیک ہوں.....“

”آپ بھی آرام سے سو جایئے۔ صبح تک بالکل اچھی ہو جائیں گی.....“ میں اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں، رات میں اگر کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف آواز دے لیجیے گا۔“

لیکن مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔

آنکھیں جل رہی تھیں اور جسم و ذہن پر ایک الجھن سی طاری تھی۔ کیسی الجھن تھی، کیسی بے قراری

تھی۔ کیسی پیاسی تھی، میں خود نہیں سمجھ سکتا تھا۔ حالانکہ یہ وہی بستر تھا جس پر لیٹتے ہی میں بے خبر سو جاتا تھا۔ نیند آنکھوں میں امنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح گھستی آتی تھی۔ مگر آج کیا ہوا ہے۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ نیند آج کہاں چلی گئی ہے، کن جزیروں میں جا کر چھپ گئی ہے۔ صحن کے کھلے ہوئے در سے ستاروں بھرا آسمان یوں نظر آ رہا تھا جیسے کسی حسینہ کا سلمیٰ ستارے سے مزین آنچل فضا میں پھیل گیا ہو۔ میرے چاروں طرف رات کا طلسمی اندھیرا تھا اور نشاط انگیز سکوت تھا اور تنہائی تھی اور میرے رگ و ریشے میں بے چینی لہریں لے رہی تھی اور عقب مین صرف چند فٹ کے فاصلے پر مرجانہ تھی۔ خوب صورت، طرح دار، دلکش میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ابھی کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ ابھی مرجانہ نہیں سوئی تھی!

مرجانہ......مرجانہ!

میں نے زور سے کنپٹی سہلائی اور ایک سگریٹ جلا کر، زور سے کش لے کر دھواں فضا میں بکھیر دیا اور یوں ہوا کہ وہ دھواں دھیرے دھیرے پھیلتا گیا۔ بڑھتا گیا بدلتا گیا میں اک عالم محویت میں دیکھتا رہا۔ پہلے چہرہ بنا، پھر مرمریں بانہیں، پھر مخروطی گردن، پھر سانچے میں ڈھلا ہوا صندلی بدن اور پھر مرجانہ کا سراپا مکمل ہو گیا۔ وہ سراپا جو رنگوں اور نکہتوں اور لطافتوں سے معمور تھا اور پھر اس کی مسکراہٹ مکمل ہو گئی اور اس کا بلاوا واضح ہو گیا۔ مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہوا۔ کیا سوچ رہے ہو۔ کیا دیکھ رہے ہو، کس پس و پیش میں پڑے ہوئے ہو۔ چلو اٹھو۔ درمیان ایک دروازہ ہے اور ابھی اس کے کمرے کی بتی جل رہی ہے۔ کیا تم اتنا نہیں کر سکتے کہ اس اندھیرے سے نکل کر اس روشنی میں چلے جاؤ۔ صرف ایک دیوار ہی کی تو بات ہے۔ محض ایک دروازہ عبور کرنا ہے۔ اور یہ دروازہ موت کا نہیں ہے۔ زندگی کا ہے۔ راحت و مسرت کا ہے۔ تم آخر سمندر کے کنارے رہ کر کب تک پیاسے رہو گے۔

مرجانہ کے کمرے کی بتی جل رہی ہے۔ ممکن ہے وہ تمہارا انتظار کر رہی ہو۔ وہ تمہیں کچھ نہ کہے گی۔ کہہ بھی کیسے سکتی ہے۔ وہ تو محض ایک طوائف ہے۔ مگر وہ بیمار بھی تو ہے۔

یہ آواز میرے اندر سے آئی تھی ار اس آواز میں نہ جانے کیسا اثر تھا کہ وہ سارے جذبات جو لاوے کی طرح ابل رہے تھے یکا یک سرد ہو کر بیٹھتے چلے گئے۔ پشیمانی پسینہ بن کر ماتھے پر ابھر آئی اور میں معاً اپنے آپ پر ہنس پڑا۔ کتنا کمینہ ہوں میں بھی۔ وہ عورت طوائف ہی سہی، مگر بیمار ہے اور میں اس کے بارے میں کیسی عامیانہ باتیں سوچ رہا تھا۔ اگر ایسی کوئی حرکت کر بیٹھتا تو مرجانہ کیا سوچتی۔ اس کے دل میں میری شرافت کا کتنا بھرم باقی رہتا۔ یقیناً میں اس کی نظروں سے گر جاتا اور پھر یہ بھی تو ہے کہ میں اگر ایسی کوئی حرکت کرتا تو مجھ میں اور مرجانہ میں کیا فرق رہ جاتا۔

تھوڑی دیر میں ذہن کے اندر اتھل پتھل مچانے والا طوفان سرد ہو گیا تو مجھے نیند آئی۔

صبح آنکھ کھلی تو سب سے پہلے مرجانہ پر نظر پڑی اور میں بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ کچھ دیر تک تو یقین نہ آیا کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ سچ ہے؟ شاید مین ابھی تک حالت نیند میں تھا اور خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر نہیں، وہ خواب نہیں تھا۔ جو کچھ دیکھ رہا تھا اور واقعی سچ تھا۔ مرجانہ صحن میں باورچی خانے کے قریب بیٹھی دھڑا دھڑ ابرتن مانجھنے میں مصروف تھی۔ سفید سوتی ساڑھی کا پلو لاپروائی سے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ بالوں کی ایک موٹی سی لٹ ماتھے پر جھول رہی تھی اور چوڑیوں کی جھنکار سے چھوٹا سا صحن ترنم ریز تھا۔ میں یکا یک گھبرا کر لپکا۔

"ارے' ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" مرجانہ نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"کیوں......کیا ہوا؟"

"یہ......" میں نے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ آپ برتن کیوں مانجھ رہی ہیں؟"

"کوئی برائی ہے اس میں؟"

"نن ...... نہیں تو، مگر مطلب یہ ہے کہ آپ ......" میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔

مرجانہ مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑی

سادگی تھی۔ بڑا گھریلو پن تھا۔ ہولے سے کہنے لگی۔ "رات میں دیر سے نیند آئی تھی نا اور پھر صبح جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ طبیعت بڑی بوجھل سی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کچھ کام ہی کروں۔"

میں نے ذرا ندامت سے کہا۔ "پتا نہیں آج میں کیوں خلاف معمول دیر تک سوتا رہا۔"

"یہ بھی اچھا ہی ہوا اس بہانے میں نے کچھ کام تو کیا۔" مرجانہ نے جواب دیا۔ "چلو تم منہ ہاتھ دھو لو، میں اتنے چائے وغیرہ بناتی ہوں......" وہ ہاتھ دھو کر اٹھنے لگی۔

"لیکن......؟"

"لیکن کیا، ناشتا تو آج میں ہی بناؤں گی۔ تم اگر مگر نہ کرو۔" میں گومگو کی حالت میں کنپٹی کھجلانے لگا۔

ناشتا اچھا نہیں تھا اور مرجانہ اچھا ناشتا بنا بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے باورچی خانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ روٹیاں اس طرح آڑی ترچھی تھیں گویا مختلف ممالک کے نقشے ہوں۔ آملیٹ میں پیار کی کمی تھی۔ لیکن نمک ضرور سے زیادہ تھا۔ چائے بھی اچھی نہیں بنی تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ ناشتا مجھے بہت لذیذ معلوم ہوا۔ مرجانہ اس طرح مسرور دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی بچے نے اسکول میں پہلا امتحان پاس کیا ہو۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے تعریف کی تو کہنے لگی۔

"مجھے معلوم ہے کہ ناشتا اچھا نہیں بنا۔ مگر میں نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ آج تک میں نے آگ بھی نہیں جلائی۔ لیکن جب آج پہلے جھاڑو دی، برتن مانجھے اور پھر ناشتا تیار کیا تو یہ سب کچھ اتنا اچھا لگا کہ بس......مجھے تو آج تک پتا ہی نہ تھا۔"

"مگر اس کے باوجود آپ نے سارے کام بڑے سلیقے سے کیے ہیں......"

"آج سے باورچی خانے کا سارا کام میں ہی کروں گی۔ تم مجھے سکھانا۔"

میں نے ...... ذرا ٹھہر کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مرجانہ، عورت کی تکمیل اور اس کی نسوانیت کا حسن دراصل اسی میں ہے۔" مرجانہ کچھ نہیں بولی۔

ناشتے کے بعد چائے پیتے ہوئے میں نے سگریٹ جلائی تو مرجانہ کو بھی دی۔ لیکن اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کیوں......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"گلے میں خراش ہے نا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "سگریٹ سے اور تکلیف بڑھ جائے گی۔"

اشیاء کے بدلنے کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہوا تھا لیکن شخصیت کے بدلنے کا مشاہدہ پہلی بار ہوا۔ اگلے سات دنوں میں مرجانہ نے ایسے کئی کام نہیں کیے جو اس کے مزاج کا حصہ تھے۔ اس نے بھڑکیلے کپڑے نہیں پہنے۔ میک اپ نہیں کیا۔ سگریٹ میں بھی کافی کمی کر دی اور شراب تو ایک بار بھی نہیں پی اور جیسا کہ اس نے کہا تھا۔ گھر کا کام کاج وہی کرتی رہی۔ مجھے بڑا اتکلف سا محسوس ہوتا تھا مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوا۔ "ہدایت کاری کیا کرتا" مسالے کو اس حد تک بھونیے کہ سرخ ہو جائے اور جب آپ کو سوندھی سوندھی خوشبو محسوس ہو تو گوشت ڈال دیجیے۔ آگ ذرا دھیمی رکھیے، ورنہ ہانڈی جل جائے گی......نہیں، نہیں، نمک اور کم کیجیے، زیادہ ہے......اور ہاں آٹے میں تھوڑا سا گھی ڈال لیجیے، روٹیاں نرم رہیں گی۔" وغیرہ وغیرہ میں استاد اچھا نہیں تھا مگر مرجانہ بہت اچھی شاگرد ثابت ہوئی۔

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد بروز سنیچر میں مرجانہ کو "انسانیت" دکھانے لے گیا اور بروز اتوار قربان آٹھ انچ لمبا رامپوری چاقو لے کر نہایت حیوانیت کے ساتھ میرے گھر میں گھس آیا۔

اگرچہ مرجانہ برقعہ پہن کر باہر گئی۔ مگر بدقسمتی کسی کونے، کسی موڑ پر تاک لگائے بیٹھی ہوگی۔ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہم نے احتیاط کی تھی۔ مگر قربان کے ایک ساتھی نے ہمیں کہیں دیکھ لیا۔ شاید مرجانہ نے ایک آدھ لمحے کے لیے نقاب الٹی ہوگی۔ چنانچہ اس نے اسے پہچان لیا اور پھر ہمارے پیچھے لگ گیا۔ میرا گھر دیکھا اور بعد از اں بعد قربان کو مطلع کر دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے درانہ گھر میں گھستا چلا آیا۔ چھ فٹ لمبے اور کرخت چہرے والے قربان کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میرا دل جیسے رک سا گیا۔ چاقو کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ میں نے ذرا سنبھل تھوک نگل کر پوچھا۔

''کیا بات ہے.....؟''

''مرجانہ کہاں ہے.....؟'' چہرے کی طرح اس کی آواز بھی کرخت تھی۔

مرجانہ اتفاق سے اندر کمرے میں تھی۔ قربان کی آواز سنتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ میں نے اپنے لہجے میں سختی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ قربان کی طرف دو قدم بڑھ کر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''میں قربان ہوں.....'' وہ بے حد سفاکی سے مسکرایا۔

''یہاں کیوں آئے ہو.....؟''

''میں مرجانہ کی تلاش میں آیا ہوں.....''

''کون مرجانہ.....؟ میں کسی مرجانہ کو نہیں جانتا.....'' میں نے جھوٹ بولا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اس کوشش میں بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا.....!

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں جانتا ہوں مرجانہ یہیں ہے۔ اندر کمرے میں، اسے باہر نکالو۔''

''وہ مرجانہ نہیں ہے، میری بیوی ہے۔ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔'' میں اپنا اعتماد اور حوصلہ بحال کرنے کے لیے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

قربان باچھیں پھاڑ کر ہنسا۔ ''خوب تو وہ تمہاری بیوی ہے سنو بابو، احمق مت بنو اسے میرے حوالے کردو۔ ورنہ اس کے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔''

اس کے خطرناک ارادوں کا اظہار اس کی آواز سے ہو رہا تھا۔ میں نے تھوک نگلا اور ایک نظر اسے اور اس کے دونوں ساتھیوں کو دیکھا جو دروازے میں ستونوں کی ایستادہ تھے پھر میں نے قربان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جو عورت اندر کمرے میں ہے وہ مرجانہ نہیں ہے بلکہ میری بیوی ہے اور یہ کہ اس نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں اس کے آٹھ انچ لمبے چاقو سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ وہ فوراً چلا جائے۔ ورنہ اسے نقصان اٹھانا پڑے گا۔ مگر قربان وہاں میری باتوں کا اعتبار کرنے یا میرے الفاظ سے مرعوب ہونے نہیں آیا تھا۔ وہ تمسخر اڑانے والے انداز میں ہنسا اور آگے بڑھا۔ اس کے بعد مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ واقعات کیونکر پیش آئے۔ بس اتنا یاد ہے کہ قربان نے کمرے کے اندر جانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر روکنا چاہا تھا۔ اس نے ایک بھرپور تھپڑ میرے منہ پر مارا تھا اور جواباً میں نے ایک گھونسا اس کی پسلی میں جمادیا تھا۔

پھر جھگڑا شروع ہوگیا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی آگئے تھے اور سب کے سب مل کر گھونسوں اور لاتوں سے میری مرمت کررہے تھے۔ ظاہر ہے کہ مین اکیلا ان تینوں پر غالب نہیں آسکتا تھا۔ قربان بلاشبہ مجھے مار پیٹ کر کمرے میں گھس جاتا۔ مگر اس کا موقع نہیں مل سکا۔ بدقسمتی کی طرح خوش قسمتی بھی کبھی کبھی اچانک اور چپکے سے آجاتی۔ عاشق کی آمد بھی کچھ اس انداز سے ہوئی۔ اس نے قربان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا تو للکار کر بولا۔ ''قربان، مرجانہ کی بات الگ تھی مگر آج تم نے میرے یار پر ہاتھ اٹھایا ہے اس کے لیے میں تمہیں صاف نہیں کروں گا.....'' پھر وہ بھی جھگڑے میں شامل ہوگیا۔

اب وہ تین تھے اور ہم دو اور چھوٹے سے صحن میں زبردست مار پیٹ ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ ساتھ مغلظات کا تبادلہ بھی ہو رہا تھا۔ پھر مجھے پتا نہیں کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ کیونکہ قربان کا آٹھ انچ لمبا راپور چاقو میرے شانے میں اتر گیا اور میری آنکھوں کے سامنے لامحدود اندھیرے میں ہزاروں نیلے پیلے ستارے ناچنے لگے۔ درد کی لہر ریڑھ کی ہڈی کے اوپری سرے سے شروع ہوتی تو کمر سے نیچے تک چلی جاتی۔ اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ ٹانگوں نے جواب دیا تو میں فرش پر گر پڑا۔ مگر بے ہوش نہیں ہوا۔ پھر میں نے ایک چیخ سنی اور قربان کو

نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ عاشق نے غالباً کسی وزنی چیز سے اس کے سر پر بھرپور ضرب لگائی تھی۔

اس اثناء میں پڑوسیوں کو جھگڑے کو علم ہو چکا تھا اور ان میں سے کسی نے پولیس کو فون کردیا تھا۔ چنانچہ جب میں نے قربان کو گرتے ہوئے دیکھا اسی وقت دروازہ کھلا اور پولیس کے کئی جوان اندر آگئے۔ انسپکٹر انصاری ان کے ساتھ تھا۔ کچھ پڑوسی بھی اندر آگئے تھے اور کچھ تعجب اور کچھ خوف سے صحن میں پھیلی ہوئی افراتفری کو دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر انصاری نے صورت حال پر قابو پانے میں بڑی پھرتی اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے قربان اور اس کے ساتھیوں کے چاقوؤں اور انگلیوں میں پہنے والے آہنی حلقے قبضے میں کرلیے۔ عاشق کا چاقو بھی چھن گیا تھا۔ انصاری نے قربان اور اس کے دونوں ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ اس کارروائی کے دوران مرجانہ باہر آگئی تھی اور فرش پر میرے نزدیک بیٹھ کر اس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے چہرے پر پشیمانی، کرب اور خوف کے تاثرات تھے۔ یقیناً وہ پشیمان تھی کہ اس ساری خرابی کی ذمہ داری بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اسی کے سر ہے اور خوف اس بنا پر کہ اب وہ پہچان لی جائے گی اور جس راز کو ہم نے پچھلے کئی ہفتوں میں نہایت کامیابی سے چھپایا تھا۔ اب افشا ہو جائے گا۔ رسوائی طوائفوں کے لیے بے شک کوئی معنی نہ رکھتی ہو مگر حالات کبھی کبھی ایسی صورت اختیار کرتے ہیں کہ طوائفوں کو بھی بدنامی اچھی نہیں لگتی۔

انصاری ابتدائی کارروائی پوری کرچکا تو اس نے سب سے پہلے میرا بیان لیا۔ ''مجھے افسوس ہے۔'' اس نے کہا۔ ''مگر جب تک ایمبولینس آئے۔ تب تک آپ مجھے کچھ ضروری باتیں بتاسکتے ہیں۔''

ہر چند کہ مجھے بڑی نقاہت محسوس ہو رہی تھی تاہم حواس پوری طرح بحال تھے۔ میں نے رک رک کر قربان کی آمد اور جھگڑے کی تفصیلات بیان کیں۔ انصاری بڑے دھیان سے سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والی حیرت کو میں انگلیوں سے چھو کر محسوس کرسکتا تھا۔ جب میں اپنی بات پوری کرچکا تھا تو اس نے مرجانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پس وپیش کے ساتھ

''یہ.....یہ آپ کے ساتھ رہتی ہیں۔''

''جی ہاں''

''مگر یہ تو.....'' انسپکٹر شاید مرجانہ سے واقف تھا اور اس بات کا اظہار کرنے والا ہی تھا کہ میں نے اسے ٹوک دیا۔

''انسپکٹر صاحب پس منظر میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اس کے بغیر بھی اپنا فرض ادا کرسکتے ہیں۔''

''مگر آپ کے ایک دو پڑوسیوں نے بتایا ہے کہ یہ آپ کی بیوی ہیں۔''

''کیا اس میں کوئی برائی ہے.....؟''

''نہیں میرا خیال ہے بالکل نہیں۔'' انصاری نے قدرے جھجک کر کہا۔

''تو پھر آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قربان جو شہر کا مشہور بدمعاش ہے، انتہائی خطرناک ارادے کے ساتھ کھلا ہوا چاقو لے کر میرے گھر میں جبراً گھس آیا۔ وہ مرجانہ کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ میں نے مداخلت کی تو اس نے مجھے زخمی کردیا۔ اگر میرا دوست عاشق نہ آتا تو شاید یہ شخص ہم دونوں کو قتل کردیتا۔ کیا قربان کے اوپر فرد جرم عائد کرنے کے لیے یہ واقعات وحقائق کافی نہیں ہیں۔''

انسپکٹر کچھ دیر تفکر آمیز نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ ''میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

پھر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور دوسری پیشی میں ہی فیصلہ ہوگیا۔ قربان کا کیس اتنا کمزور تھا کہ اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے وکیل کا بھی یہی مشورہ تھا کہ وہ اقبال جرم کرلے۔ اسے اور اس کے دونوں ساتھیوں کو خاصی مدت کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ عاشق کو ایک خطرناک ہتھیار رکھنے کے جرم میں جرمانہ کی سزا بھگتنی پڑی۔ عدالت کی کارروائی میرے اور مجھ سے زیادہ مرجانہ کے لیے بے حد اذیت ناک ثابت ہوئی کیونکہ کارروائی کے دوران

اس کے ماضی کو کھنگالا گیا۔ اور یوں عدالت میں موجود لوگوں پر منکشف ہوگیا کہ وہ کوئی گھر گرہست اور باحیا عورت نہیں بلکہ ایک طوائف ہے۔ عدالت اس انکشاف پر صرف متعجب ہوسکتی تھی۔ اسے کوئی سزا نہیں دے سکتی تھی۔ کیونکہ شہری حقوق کے قانون کے تحت مرجانہ کو بہرحال یہ حق حاصل تھا کہ وہ جہاں اور جس کے ساتھ جی چاہے وہ جاسکتی ہے البتہ ہم دونوں کے اوپر فراڈ کے جرم میں مقدمہ چل سکتا تھا۔ کیونکہ ہم نے فلیٹ حاصل کرنے کے لیے نہ صرف آشیانہ بلڈنگ کے مالک کو، بلکہ تمام کرایہ داروں کو دھوکا دیا تھا اور میرا یہ خدشہ اس وقت سامنے آگیا جب فیصلے کے بعد میرا سامنا سیٹھ عابد علی زاہد علی سے ہوا۔

''جتنی جلد ہوسکے فلیٹ خالی کردو۔'' اس نے نفرت اور غصے سے گھورا۔ ''ورنہ جیل بھجوادوں گا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں چند دن میں فلیٹ خالی کردوں گا۔'' میں نے کہا۔

لیکن سیٹھ عابد علی زاہد علی کو دھمکی دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس واقعے کے بعد ہر شخص نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا تھا وہ نگاہیں جن سے دوستی جھلکتی تھی اب معاندانہ ہوگئی تھیں، مسکرا کر ملنے والے چہروں پر سرد مہری اور تنی پھیل گئی تھی۔ دروازوں پر کھڑی ہوئی عورتیں صرف مجھے ہی نہیں بلکہ مرجانہ کو دیکھ کر بھی ''پردہ'' کرلیتی تھیں۔ آشیانہ کے مکین اس طرح مرجانہ کے ساتھ سے دور بھاگتے تھے جیسے وہ ہیضے یا پلیگ کی بیماری ہو۔ ان حالات میں آشیانہ میں رہنا ممکن نہ تھا۔ ہم کب تک اس بے مہری اور بے مروتی کا سامنا کرتے۔ بمشکل چار چھ دن گزارے۔ پھر مرجانہ واپس جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

وقت رخصت اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرے پر اندرونی کرب کا عکس، میرے گھر سے رخصت ہوتی ہوئی مرجانہ، اس مرجانہ سے قطعی مختلف تھی جو میرے گھر آئی تھی۔ آنے والی مرجانہ نے مجھے ڈر اور تذبذب میں مبتلا کیا تھا۔ جانے والی مرجانہ دل میں کسک پیدا کررہی تھی۔ جب عاشق ٹیکسی لینے چلا گیا تو میں نے کہا۔

''آپ کا شکریہ مرجانہ۔ آپ مجھے ہمیشہ یاد آئیں گی.....''

وہ چند ساعت مجھے گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ ''میں بھی تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

''اب آپ گھر جارہی ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں گی۔''

''گھر.....'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''گھر کہاں ہے؟''

میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گھوم کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ در و دیوار پر ویرانی پھیل رہی تھی۔ کیا یہ گھر پھر ویران ہوجائے گا؟ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے سوچا پچھلے کئی دن سے میں مرجانہ سے ایک بات کہنے کی کوشش کررہا تھا لیکن کہہ نہیں پارہا تھا۔ الفاظ زبان تک پہنچنے پر ہمت جواب دے جاتی۔ وہ کیا کہے گی۔ وہ کیا سمجھے گی۔ مگر اب وہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اگر وہ چلی گئی تو دل کی بات دل ہی میں رہ جائے گی اور میں شاید ساری عمر پچھتاؤں میں مبتلا رہوں گا۔ بہتر ہے کہ کہہ دوں۔ یہ لمحہ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ میں نے سوچ سمجھ کر مناسب دموزوں الفاظ میں کہا۔

''مرجانہ کیا آپ واقعی گھر جانا چاہتی ہیں۔''

''کیا مطلب۔'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

مجھے گھبراہٹ نے گھیر لیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ایک بار پھر ہمت ڈانواں ڈول ہوئی لیکن دل کی بات کہنا ضروری تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ لیکن صاف الفاظ میں کہا۔ ''مرجانہ، میں نہیں جانتا کہ یہ بات مجھے کہنا چاہیے یا نہیں۔ لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے ساتھ ہی رہیں۔ ہر چند کہ اتفاقات نے ہمیں ملایا تھا۔ تاہم کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھی بن جائیں، دیکھیے، خفا مت ہوئیے گا۔ میرے دل میں ایک بات تھی سو کہہ دی۔ لیکن ہاں یا نہ کہنے کا اختیار بہرحال آپ کو ہے۔''

''تم مجھ سے شادی کروگے؟'' مرجانہ نے کچھ اس طرح کہا گویا اسے یقین نہ آیا ہو۔

میں نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

''مگر.....'' اس کی آواز کی کپکپاہٹ کو میں صاف محسوس کرسکتا تھا۔ ''مگر تمہیں ابھی طرح معلوم ہے کہ.....''

''ہاں مجھے معلوم ہے، مگر مجھے آپ کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کو بھی کسی دوسرے کی نجی زندگی پر معترض ہونے کا حق نہیں، ہم اپنے ماضی کو بھلادیں گے اور ایک نئی زندگی شروع کریں گے اور.....اور پھر۔''

لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا کہوں۔ چنانچہ ٹپٹا کر چپ ہوگیا اور امید وبیم کے عالم میں مرجانہ کو دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح چپ چاپ کھڑی تھی جیسے سکتے میں مبتلا ہو۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ ہونٹوں پر تھرتھراہٹ تھی اور آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی تھی۔ کئی لمحوں کی کرب انگیز کشمکش کے بعد آخر اس نے کہا۔ ''بابو جی تمہارا شکریہ، تم بہت اچھے ہو، تمہارے سینے میں بڑا خوب صورت دل ہے۔ مگر..... مگر تم سے شادی نہیں کرسکتی۔''

میرا دھڑ دھڑاتا ہوا دل یکا یک رک گیا۔ ''کیوں.....؟''

''کیونکہ میں جانتی ہوں، میں کیا ہوں۔'' اس کی آواز میں ہلکی ہلکی آنچ تھی۔ جیسے وہ اندر ہی اندر جل رہی ہو۔ ''میری کوئی سماجی حیثیت نہیں ہے۔ میرا کوئی کردار نہیں ہے۔ سکوں کی کھنک اور سونے چاندی کی چمک دمک کے عوض میں نے اپنی ذات اور ضمیر اور انفرادیت کو اتنی بار دنیا کے بازار میں بیچا ہے کہ اب میری کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی۔ کوٹھے پر رہنے والیوں کے پاس کوئی پھول نہیں ہوتا۔ ان کے پاس صرف نفرت، تحقیر اور تذلیل کے بدنما داغ ہوتے ہیں جو ان کی ذات کو بدصورت اور بے مایہ بناتے رہتے ہیں۔ اگر میں تم سے شادی کرلوں تو نہ صرف تمہیں ساری عمر دنیا کی تضحیک و تذلیل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بلکہ شاید تم خود بھی ہمیشہ اپنے آپ سے نادم رہوگے۔ میرے پاس تمہیں دینے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے اور جب آدمی اتنا تہی دست ہو تو اسے دوسروں کے لیے بارگراں نہیں بننا چاہیے۔'' اتنا کہہ کر وہ رکی اور رنجیدہ نظروں سے چند لمحے مجھے دیکھتی رہی۔ ''بابو جی۔'' آخر کار اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے، لیکن میں تمہارے قابل نہیں ہوں.....!''

یہ فیصلہ کیسے کیا جائے گا کون کس کے قابل ہے اور کون نہیں۔ مرجانہ نے کہا تھا کہ اس کا کوئی کردار نہیں۔ دنیا کے بازار میں وہ بار بار بکی ہے۔ لیکن کون دنیا کے بازار میں نہیں بکتا۔ کیا وہ لیڈر اپنے آپ کو ہر روز نہیں بیچتا جو اپنی ذات کی دکان پر ''قوم اور ملک کی خدمت'' کا بورڈ لگاتا ہے اور کیا وہ ملا اپنی قیمت وصول نہیں کرتا جس کی زبان پر ہر وقت خدائے بزرگ و برتر اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کا ذکر رہتا ہے اور کیا وہ سفید پوش شرفاء ہر پل اپنی ذات کا سودا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی پیشانیوں پر ''تہذیب'' کا لیبل لگا رکھا ہے۔ کون جانتا ہے کہ ان کے سفید لباسوں کے نیچے کتنی گندگی ہے۔ یہ دنیا ایک بہت بڑا بازار ہے اور اس بازار میں ہر شخص ''برائے فروخت'' ہے۔ جونہی مناسب قیمت ملتی ہے۔ وہ خود کو بیچ ڈالتا ہے مگر الفاظ محض بے کار ثابت ہوئے۔ کوئی دلیل کام نہ آئی۔ مرجانہ اپنے فیصلے پر قائم رہی اور آخر کار چلی گئی۔

لیکن جاتے جاتے وہ میرے ہونٹوں پر ایک چراغ جلا گئی۔ یہ چراغ اس وقت تک میری روح کے نہاں خانوں کو منور رکھے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں کیونکہ اس چراغ میں خلوص کی روشنی ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بھی بوریا بستر سمیٹ اور غریب الدین کے بہارستان ہوٹل واپس پہنچ گیا کہ فوری طور پر سر چھپانے کی کسی دوسری جگہ حصول ممکن نہ تھا۔ میں بہارستان کے بدمزا کھانوں اور پیک زدہ دیواروں سے بچ کر بھاگا تھا۔ مگر قسمت کھینچ کر واپس وہیں لے گئی۔ اب پھر وہی تنہائی تھی اور وہی پہلے والی گلی بند سی زندگی۔ روح کے ایوانوں میں ویرانی پھیل

چکی تھی۔ اب نہ مرجانہ تھی اور نہ اس کی نقرئی آواز۔ اس کا آنا اور جانا ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ ایک ایسا خواب جس کی کوئی تعبیر نہیں تھی۔

☆☆☆

وقت، صبح، وشام کا تسلسل، بے کیف و بے رنگ، کولہو کے بیل کی طرح ایک مخصوص پٹی تلی رفتار سے گزرتا رہا۔ زندگی اتنی پھیکی تھی کہ زندگی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ میں تھا اور تنہائی تھی اور دفتر کی فائلیں تھیں اور کچھ بھی نہ تھا۔ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش بے سود ہوتی کہ آدمی خدا کو تلاش کرسکتا ہے، اپنے آپ کو نہیں پھر بھی میں خود سے شاکی نہ تھا۔ ہر چند کہ بے سروسامانی تھی۔ مگر زندگی بہرحال ایک ڈھرے پر چل رہی تھی۔ منزل نہیں ہے۔ نہ سہی، راستہ تو ہے۔ زندگی اس ویران، پھیکے اور بے رنگ راستے پر لنگڑا کر ہی سہی، چل تو رہی ہے۔ دنیا میں نہ جانے کتنے ہیں جنہیں راستہ تک نہیں ملتا۔

عاشق سے ہر دوسرے تیسرے دن ملاقات ہوتی تھی اور اس سے مرجانہ کی خیریت معلوم ہوجاتی تھی۔ یہ جان کر مسرت ہوتی کہ مرجانہ اچھی ہے۔ اگرچہ میرا اس سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تاہم یہ سن کر کہ وہ بخیریت ہے۔ مجھے ایک گونا تسکین اور خوشی کا احساس ہوتا۔ ایسا کیوں تھا۔ یہ مجھے خود نہیں معلوم۔ شاید یہ چند دنوں کی رفاقت کا نتیجہ تھا۔ اس نے میرے کپڑے دھوئے تھے اور میرے لیے کھانا پکایا تھا اور میری قمیص کے بٹن ٹانکے تھے۔ اس بنا پر میرے اور اس کے درمیان ایک ایسا ذہنی رشتہ قائم ہوگیا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

لیکن کچھ دن بعد مرجانہ کی خیریت معلوم ہونے کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ہوا یہ کہ عاشق نے کسی غنڈے کو چھرا مار دیا اور موقع پر ہی گرفتار ہوگیا۔ چونکہ وہ پہلے بھی کئی جرائم میں ماخوذ ہوچکا تھا۔ اور سزا بھی بھگت چکا تھا۔ اس لیے اس بار اسے کچھ زیادہ ہی لمبی سزا ہوئی مجھے یہ خبر ملی تو کوئی تعجب نہ ہوا۔ جس قسم کی زندگی وہ بسر کررہا تھا اس کا انجام آخرکار یہی ہونا تھا۔ لیکن اس کے جانے سے یہ نقصان ہوا کہ میں مرجانہ کی خیریت کے حصول سے محروم ہوگیا۔ بتانے والا تو عاشق ہی تھا۔ وہی جیل چلا گیا تو پھر کون بتاتا اور مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بازار حسن میں جاکر مرجانہ کو ایک نظر دیکھ آتا اور اس کی خیریت معلوم کرآتا۔

ایک اور اتفاق یہ ہوا کہ مجھے ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ یہ مکان ایک پس ماندہ بستی میں تھا۔ مگر مجھ جیسے پس ماندہ آدمی کے لیے بہرنوع موزوں تھا اور چونکہ وہاں شادی شدہ ہونے کی کوئی شرط نہیں تھی اس لیے میں اس میں مستقل ہوگیا۔ اور یوں ایک بار پھر ہانڈی چولہے کا چکر چل پڑا۔ قلم اور جھاڑو ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ہر روز صبح دفتر جانا اور فائلوں میں سر کھپانا، شام کو ہانڈی چولہے سے نبرد آزمائی۔ رات ہوتی تو گلی کے نکڑ پر چلا جاتا جہاں مولوی مسکین علی کا چائے خانہ تھا۔ وہاں چائے کی پیالیاں کم چلتیں، شطرنج کی بازیاں زیادہ۔ بادشاہوں پر شہ پڑتی اور پیدل مات دے دیتے۔ میں رات گئے تک شطرنج کھیل کر واپس آتا اور کھری چارپائی پر پڑ کر سو رہتا۔

کبھی کبھی میں غریب الدین کے بہارستان ہوٹل بھی چلا جاتا کہ بہرحال اس کے اور میرے درمیان شناسائی کا رشتہ تھا اور میں نے اس کے بہارستان میں کافی دن گزارے تھے۔ میں جب بھی جاتا۔ وہ مجھے سبز چائے کی پیالی پیش کرتا اور پھر مجھ سے ساری دنیا کی تازہ ترین خبریں سنتا۔ فلسطینیوں کو ان کا گھر کب واپس ملے گا۔ فلپائن کے مسلمان کب تک آزادی کے لیے لڑتے رہیں گے اور پاک و ہند کے درمیان باوقار دوستانہ تعلقات کب استوار ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ..... غریب الدین پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن اسے سیاست سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ہر صبح تین چار اخبار باقاعدگی سے خریدتا تھا۔

اتوار کی ایک ویران سی شام کو میں بہارستان پہنچا تو غریب الدین..... نے حسب عادت سبز چائے پیش کی۔ پھر میرے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا

اور دبی آواز میں بولا۔

''جمال بابو کل شام ایک عورت آئی تھی.....''

''عورت آئی تھی.....؟'' میں نے استفہامیہ نظروں سے اسے گھورا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ کو پوچھ رہی تھی۔ میرا خیال ہے، وہی عورت تھی جو پہلے بھی ایک بار آپ کے پاس آئی تھی۔ بدقسمتی سے مجھے آپ کا پتا بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر وہ انتظار کرے تو میں کسی کو بھیج کر آپ کو بلوانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ پھر میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ میرے آدمی کے ساتھ احمد پورے چلی جائے۔ جمال بابو وہیں کہیں رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی سے پتا معلوم ہوجائے گا۔''

''پھر اس نے کیا کہا.....؟'' میں نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

''اس نے انکار کردیا۔ کہنے لگی۔ اس کا موقع نہیں ہے۔ پھر چند منٹ ٹھہر کر وہ چلی گئی۔''

''کچھ اور بھی کہا تھا اس نے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں.....''

''یہ بھی نہیں بتایا کہ کیوں میرے پاس آئی تھی.....؟''

''نہیں.....''

''اب کیا کروں۔'' میں نے بے چینی اور مایوسی کے ساتھ سوچا۔ وہ یقیناً مرجانہ تھی اور میرے پاس آئی تھی۔ لیکن کیوں، محض مجھ سے ملنا چاہتی تھی یا اور کوئی وجہ تھی؟ اس سوال کا جواب صرف مرجانہ ہی دے سکتی تھی؟ کتنے دن گزر گئے تھے کہ نہ میں نے اسے دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی خیر و عافیت کی اطلاع ملی تھی۔ اور اب وہ خود چل آئی تھی تو ملاقات نہیں ہو سکی۔ کیسا ستم ہے یہ، اگر میں گزشتہ روز غریب الدین کے ہوٹل میں آیا ہوتا کون سا حرج ہوجاتا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا حاصل تھا۔ خدا جانے وہ کیوں آئی تھی۔ شاید کوئی اہم وجہ ہو۔ میں پچھتاوے اور کشمکش میں مبتلا رہا۔ کیا کروں؟ کیا کروں؟ کیوں کر اس سے ملاقات کروں۔ کم از کم معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ کیوں آئی تھی۔ صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ میں خود اس کے گھر جاؤں.....!''

مگر وہ تو بازار میں حسن میں رہتی ہے۔ میں نے گھبرا کر سوچا۔

وہ پوری شام اور ساری رات اسی ادھیڑبن میں گزری۔ تصور مرجانہ کے گرد ناچتا رہا۔ آخر وہ کیوں آئی تھی؟ صبح دفتر گیا مگر کام میں دل نہ لگا۔ ذہن میں الجھن اور اضطراب کے بھنور بنتے رہے۔ فائلیں کھولتا تو مرجانہ کا سانولا سلونا چہرہ سامنے آجاتا۔ اس کی چمکتی ہوئی مگر سوالیہ نظریں مجھ پر جم جاتیں! آخر تم کہاں تھے میں نے تم سے ملنے آئی تھی۔ پھر غریب الدین کی آواز کانوں میں گونجی۔ جمال بابو کل شام ایک عورت آئی تھی۔ آپ کو پوچھ رہی تھی۔ مرجانہ کا اس طرح اچانک اور بغیر اطلاع کے آنا بے سبب تو نہیں ہوسکتا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ فرض کرو، اسے میری مدد کی ضرورت ہو؟ تو کیا اس صورت میں یہ میرا فرض نہیں ہے کہ حتی الامکان اس کے کام آؤں۔ مجھ سے نہ مل کر اسے کتنی مایوسی ہوئی ہوگی۔ دفتر میں پورا دن یونہی گزر گیا۔ میں کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہ کرسکا۔ جب چھٹی ہوئی تو گھر روانہ ہوا۔ کم از کم دفتر سے اسی ارادے سے نکلا تھا۔ لیکن یہ دوسری بات ہے کہ کچھ دیر بعد میں نے اپنے آپ کو بازار حسن کے سامنے موجود پایا۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس بازار میں قدم رکھا جہاں معاشرے کے ناپسندیدہ اور ٹھکرائے ہوئے لوگ رہتے ہیں ہر رات اپنی آبرو اور حیا بیچنے والی عورتیں اور ان کی کمائی پر پلنے والے بے ضمیر دلال۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے شرافت اور تہذیب بے معنی چیزیں ہیں۔ اس بازار میں حسن کبھی محبوب و مستور نہیں ہوتا بلکہ سکوں کی جھنکار پر ہر پل اس طرح بے حجاب ہوتا ہے کہ نسائیت کی پاکیزگی

شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔ میں نے جب گلی میں قدم رکھا تو دل بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا اور شاید پیشانی پر پسینے کے قطرے بھی ابھر آئے تھے۔ یوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا جیسے میرے چاروں طرف غلاظت کے انبار لگے ہوں اور مجھے ڈر ہو کہ کہیں کوئی چھینٹ مجھ پر نہ پڑ جائے۔ ڈرا ڈرا، سہما سہما، گھبرایا ہوا آگے بڑھتا رہا..... ارے او میاں شریف زادے، یہ تم کہاں آ گئے ہو۔ یہ تو بے حیائی اور آبرو فروشی کا بازار ہے۔ یہاں بے ضمیر اور بے غیرت لوگ رہتے ہیں اور تم ایک معزز اور شریف آدمی ہو۔ تم اس بازار میں کیوں آئے ہو۔ یہاں ہر طرف گندگی ہے اور تعفن ہے اور تم نے سفید کپڑے پہن رکھے ہیں۔ دیکھنا، دیکھنا ذرا دیکھنا ذرا سنبھل کر قدم رکھنا، کہیں بدبو کا کوئی بھبکا تمہاری روح کو پراگندہ نہ کر دے، بہتر ہے کہ واپس چلے جاؤ یہ جگہ تم جیسے شریفوں کے لیے نہیں..... لیکن میں نے سارا خوف اور تمام وسوسے ذہن میں ہی دفن کر دیے۔

پوری گلی روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ چوباروں پر طوائفیں سج سنور کی بیٹھی تھیں اور راہ گیروں کو فحش اشارے کر رہی تھی۔ کسی کسی چوبارے سے موسیقی اور گانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ گلی میں جگہ بہ جگہ پھول والے کھڑے تھے جو چنبیلی اور رات کی رانی اور موتیا اور گلاب کے ہار بیچ رہے تھے۔ لوگ ان سے ہار خریدتے اور لپک کر کوٹھوں پر چڑھ جاتے۔ میں میلے کے ہجوم میں کھوئے ہوئے بچے کی طرح ہراساں ہراساں آگے بڑھتا رہا۔

آگے کو یہاں تک آ گیا تھا۔ مگر اب پریشان تھا کہ کیا کروں مرجانہ کا پتا تو معلوم ہی نہ تھا۔ میں نے دو چار بار اوپر چوباروں پر نظر ڈالی تھی۔ شاید کسی چوبارے پر مرجانہ بیٹھی ہوئی دکھائی دے جائے۔ مگر وہ نظر نہیں آئی..... پھر میں ایک جگہ رک گیا اور متجسس اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آخر کیا کروں۔ کسی سے اس کا پتا پوچھوں؟ مگر کس سے؟ معاً نگاہ پان کی ایک دکان پر جم گئی۔ وہاں کوئی گاہک نہ تھا۔ میں نے سگریٹ کی ڈبیا اور ایک خوشبو دار پان خریدا اور پھر چپکے سے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ مرجانہ کا چوبارہ کون سا ہے؟''

تلوار مار کہ مونچھوں اور گنجے سر والے تنومند پان فروش نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''مرجانہ سے ملنا چاہتے ہو بابو.....؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اس کی تلوار مار کہ مونچھوں کے نیچے ایک دھار دار مسکراہٹ نظر آئی۔ ''پہلے کبھی یہاں نہیں دکھائی دیے۔''

''ہاں، پہلی بار آیا ہوں۔'' میں نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔

پان فروش نے ایک بار اور مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے بائیں جانب انگلی اٹھائی۔ ''مرجانہ کا کوٹھا وہ ہے بابو مگر تم کچھ دیر سے آئے ہو۔''

''کیا مطلب.....؟''

''مطلب یہ کہ مرجانہ کل کسی کے ساتھ بھاگ گئی.....''

''بھاگ گئی.....'' میرا دل دو چار دھڑکنیں بھول گیا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''سمجھا تو کوئی بھی نہیں.....'' پان فروش نے پانوں کی ٹوکری میں تازہ پانی چھڑکتے ہوئے کہا۔ ''نہ اس کی نائیکہ سمجھی اور نہ اس کے استاد بانکے۔ یہاں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ اپنے کسی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ فلموں میں کام کرنے کے شوق میں رفو چکر ہوئی ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ سیٹھیے کی رکھیل بن گئی ہے۔ حقیقت کیا ہے۔ یہ مولا جانے۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ کل دو بجے کے بعد گھر سے سنیما دیکھنے گئی تھی، ابھی تک پلٹ کر نہیں آئی۔''

میں نے بے اعتباری کی نظروں سے پان فروش کو گھورا۔ شاید وہ مذاق کر رہا تھا۔ ''کیا یہ واقعی سچ ہے۔ مگر اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی.....؟''

''مذاق تو میں اپنی جورو سے بھی نہیں کرتا بابو۔''

پان فروش نے دو دھاری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''ان سالی رنڈیوں کا کیا بھروسا، سر پھری ہوتی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب کیا حرکت کر بیٹھیں گی۔ مرجانہ کا قربان نامی ایک بدمعاش سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے وہ کسی شریف آدمی کے گھر چھپ گئی تھی۔ پلٹ کر آئی تو حرام زادی کا دماغ ہی پھر چکا تھا۔ بات بات پر اپنی ماں اور استاد سے لڑتی تھی۔ دو چار بار قماش بینوں سے بھی جھگڑا کیا۔ اور پھر کل بھاگ گئی۔'' اتنا کہہ پان فروش کچھ دیر کے لیے رکا۔ پھر ذرا آگے جھک کر راز دارانہ لہجے میں بولا۔ ''میرا تو خیال ہے بابو وہ سالی اسی آدمی کے ساتھ گئی ہے جس کے گھر چھپ کر کچھ دن رہی تھی۔''

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ذہن کے اندر بگولے دوڑ رہے تھے۔ تو مرجانہ بھاگ گئی۔ مگر کیوں؟ ان سالی رنڈیوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ سر پھری ہوتی ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کب کیا حرکت کر بیٹھیں گی۔ لیکن اگر واقعی وہ بھاگ گئی ہے تو پھر کل میری تلاش میں کیوں گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ جانے سے پہلے مجھ سے ایک بار ملنا چاہتی ہو گی۔ ممکن ہے اس کا عاشق بھی اس وقت اس کے ساتھ ہی رہا ہو۔ میں نے پان فروش کی آخری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اسے کیا علم کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جس کے گھر میں مرجانہ نے کچھ دن گزارے تھے۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور گردن گھما کر اس چوبارے پر ایک نظر ڈالی جو پان فروش کی اطلاع کے مطابق مرجانہ کا تھا۔ وہاں کرسی پر ایک دبلی پتلی لڑکی بجی بنی بیٹھی تھی اور مسلسل راہ گیروں کو تک رہی تھی۔ اب وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں واپسی کے ارادے سے مڑا تو پان فروش نے کہا۔

''بابو کس سوچ میں پڑ گئے.....؟''

''کچھ نہیں.....''

اس نے ہاتھ ہلا کر معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ ''ارے گولی مارو مرجانہ کو، اس سالی میں کون سے لال ٹکے تھے۔ اس بازار میں تو ایک سے بڑھ کر ایک دلربا پڑی ہے۔ تم کہو تو میں کچھ انتظام کروں۔''

''تم.....'' میں نے بے دھیانی سے کہا۔

''ہاں، ہاں میں۔ تم نے استاد سمندر کو کیا سمجھا ہے۔ میں تمہیں ایک لونڈیا کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ نگینہ ہے نگینہ عمر سولہ سال سے ایک دن بھی زیادہ نکلے تو استاد سمندر کو گولی مار دینا۔ مگر پیسے کچھ زیادہ لگیں گے.....''

''بہتر ہے.....'' میں نے جواب دیا۔ ''کسی دن میں زیادہ پیسے لے کر آؤں گا۔''

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ پل پل مل کر دن بنے۔ دنوں نے مہینوں کی شکل اختیار کی اور مہینے برسوں میں بدل گئے۔ مرجانہ سے پھر ملاقات نہ ہوئی۔ اس دن کے بعد پھر میری ہمت نہ پڑی کہ دوبارہ بازار حسن کا رخ کرتا۔ حالانکہ وہاں استاد سمندر تھا جس کے پاس ایک ایسی لڑکی تھی جس کی عمر سولہ سال سے ایک دن بھی زیادہ نہ تھی اور میرے پاس کافی پیسے بھی تھے۔ مگر میں وہاں نہ جا سکا۔ البتہ غریب الدین کے ایک آدمی کو دو تین بار وہاں بھیجا تھا۔ شاید مرجانہ واپس آ گئی ہو۔ مگر یہ محض امید موہوم تھی۔ مرجانہ ہوا کے جھونکے کی طرح گئی تھی، پھر پلٹ کر نہ آئی۔ کبھی کبھی میں حیران ہوتا۔ خود پر ہنسی آتی۔ آخر میں اس کی واپسی کی توقع کیوں کرتا ہوں۔ اگر وہ واپس آ بھی جائے تو کیا؟ مگر یہ احساس شاید میرے لاشعور میں تھا۔ اور لاشعور کی گتھیاں سلجھانا میرے بس کی بات نہیں۔

چند برس بعد زندگی نے ایک اور کروٹ بدلی جس فرم میں قلم گھستا تھا وہ بند ہو گئی اور یوں نوکری چھوٹ گئی۔ دوسری ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر پاؤں کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور گردش ہم رکاب ہو گئی۔ شہر میں ویسے بھی میرا کوئی گہرا دوست نہ تھا۔ لے دے کے صرف ایک عاشق تھا مگر وہ جیل میں مفت کی روٹیاں توڑ رہا تھا چنانچہ

میں شہروں شہروں بھٹکنے لگا۔ کہیں قدم نہ جمے، کہیں ٹھکانا میسر آتا بھی تو عارضی ثابت ہوتا اور مجھے پھر کسی دوسرے شہر کا رخ کرنا پڑتا۔ بے سروسامانی اور آوارہ گردی کے ان دنوں میں بھی میں مرجانہ کو نہ بھلا سکا۔ اکثر و بیشتر وہ یاد آجاتی۔ یوں ہوتا کہ میں تنہائی کے کسی جان لیوا لمحے میں تاریک راہوں پر بھٹک رہا ہوتا کہ یکا یک مرجانہ سامنے آکر جگنو کی طرح دمکنے لگتی اور راستہ دکھانے لگتی۔ اس کا سراپا یاد آتا۔ اس کا صندلی چہرہ تصور میں ابھرتا۔ اس کی کھنکتی ہوئی آواز کانوں میں رس گھولتی اور دل میں اک ٹیس سی لہرا کر رہ جاتی۔ مگر کیوں؟ وہ مجھے کیوں یاد آتی ہے۔ اس کا اور میرا کیا سمبندھ ہے وہ نہ جانے کہاں ہوگی۔ مگر جہاں بھی ہوگی، عشوؤں اور اداؤں کے جادو جگا رہی ہوگی۔

مگر اب وہ کیسی ہوگی۔ کیا اب بھی اس کا چھریرا جسم ویسا ہی ہوگا اور اس کی چال کا بانکپن بھی ویسا ہی ہوگا اور اس کی ادائے دلبری کا سحر بھی ویسا ہی ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت نے ظالم وقت نے سب کچھ بدل ڈالا ہو۔ اس کے گالوں کے گلابوں پر خزاں اتر آئی ہو اور آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی ہو اور مسکراہٹ کی ضوفشانیاں رخصت ہوگئی ہوں۔ جیسا کہ میرے ساتھ ہوا۔ وقت نے ظالم وقت نے مجھے اس طرح بدلا ہے کہ میں خود اپنا سایہ بن کر رہ گیا ہوں چہرے پر کوئی رونق باقی نہیں رہی۔ قویٰ ڈھیلے پڑ گئے اور کنپٹی کے آس پاس سفیدی چمکنے لگی ہے۔ اب مجھے آئینہ دیکھنا اچھا نہیں لگتا کیونکہ آئینے ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور میرے پاس جو چھوٹا سا گول آئینہ ہے وہ کم بخت بھی سچ بولنے سے باز نہیں آتا۔ صاف صاف کہہ دیتا ہے یہاں پت جھڑ کا آغاز ہے، پتے زرد ہونے لگے۔ کچھ دن میں ٹنڈ منڈ شاخیں رہ جائیں گی اور صحن گلشن ویران ہو جائے گا۔ شاید مرجانہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ شاید اس کے صحن حیات میں بھی زرد پتے گرنے لگے ہوں۔

پھر یوں ہوا کہ میں بھٹکتا ہوا دارالحکومت پہنچ گیا وہاں مجھے ایک روزنامہ اخبار میں ملازمت مل گئی۔ چوہدری غفور الٰہی فخر شاہ کا نام بہت سنا تھا کہ وہ ملک کے مشہور لیڈر تھے۔ اخبار میں ملازمت ہوئی تو معلوم ہوا کہ اخبار بنیادی طور پر انہی کی ملکیت ہے۔ وہ اخبار کے ستر فی صد حصص کے مالک تھے۔ باقی تیس فی صد حصے ان کے دوستوں کے نام تھے اور یہی وجہ تھی کہ اخبار چوہدری غفور الٰہی فخر شاہ کی تعریف و تحسین میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ ان کے بارے میں چھوٹی چھوٹی خبریں چھاپی جاتی تھیں۔ ان کی تصویریں اور تقاریر کے پورے پورے متن چھپتے تھے۔ لیکن یہ دوسری بات ہے کہ چوہدری صاحب کی تعلیمی قابلیت کچھ زیادہ نہ تھی۔ اسی طرح ان کی سیاسی لیاقت بھی محل نظر تھی وہ کاروباری آدمی تھے اور ہر معاملے کو ایک تاجر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سیاست ہو یا بزنس، منافع ہر حال میں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ساری باتیں مجھے کچھ دن بعد معلوم ہوئیں.....!

اخبار میں میری حیثیت بظاہر ایک کلرک کی سی تھی۔ مگر حقیقتاً ایسا نہ تھا۔ مجھے اداریے لکھنے پڑتے تھے۔ ملکی اور قومی مسائل پر مضامین تحریر کرنے پڑتے تھے جو ایڈیٹر یا اسسٹنٹ ایڈیٹر کے نام سے چھپتے تھے۔ دو چار بار سیاسی مضامین بھی لکھے جو چوہدری صاحب کے نام سے شائع کیے گئے۔ میرا ''مختانہ'' ہر چند کہ معمولی تھا لیکن چونکہ یہ کام میری پسند کا تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔ ہر شام چھ بجے دفتر جاتا۔ دو تین بجے آکر سو جاتا۔ معمولات بن گئے۔ چکر ختم اور ایک بار پھر پاؤں میں زنجیر پڑ گئی اور زندگی بری بھلی جیسی بھی تھی ایک بار ڈھرے پر لگ گئی۔

پھر اتفاقات مجھے چوہدری غفور الٰہی فخر شاہ کے پاس لے گئے۔ ہوا یہ کہ ان کا ''منشی'' جو ان کے لیے تقریریں اور اخبار بیانات لکھتا تھا۔ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ چوہدری صاحب کو ایک نئے ''منشی'' کی ضرورت پڑی اور ایڈیٹر نے مجھے ان کے پاس بھیج دیا۔ چوہدری صاحب کا بنگلا بہت بڑا تھا۔ دنیا کی ہر آرائش و آسائش سے مزین مرصع۔ اتنا رفیع الشان کہ میں صرف سپنوں میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ مگر سپنے

کبھی کبھی سچ بھی تو ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میں سرخ بجری والی روش پر چلتا ہوا برآمدے میں اور پھر ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ چوہدری صاحب اپنی بھاری بھرکم توند اور گنجے سر کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا کہ یہ بڑے آدمیوں کی شان کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے مجھے ذرا ناگواری سے دیکھا۔ پھر سر کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ دو منٹ بعد ان کے حکم سے مجھے چائے پیش کی گئی۔ جب کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے تو چوہدری صاحب نے ٹرشں سگار سلگا کر کہا۔

''اخبار میں اداریے اور مضامین تم ہی لکھتے ہو.....؟''

''جی ہاں.....'' میں نے اپنی آواز کو مودب بنائے رکھا۔

''تمہاری تعلیم کتنی ہے.....؟''

''میں نے اپنی تعلیم بتائی۔

''تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے.....؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''اتنی کہ اچھی طرح گزر اوقات ہو جاتی ہے.....'' میں نے احتیاط سے جواب دیا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میرا سکریٹری مر گیا ہے۔''

''جی ہاں بڑے افسوس کی بات ہے۔''

''واقعی افسوس کی بات ہے۔ کیونکہ مجھے کل ایک جلسے میں تقریر کرنی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اپنی تقریر خود تیار کر سکوں۔ تمہیں میرے لیے آج شام تک ایک اچھی سی تقریر لکھنی ہے۔'' اتنا کہہ کر چوہدری صاحب رک گئے اور چند لمحے مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ ''تم آج سے میرے ملازم ہو۔ مگر تم نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ لگتا ہے کسی خیراتی ادارے کے منشی ہو۔ کیا تمہیں کبھی اپنے آپ پر شرم نہیں آئی۔''

چوہدری صاحب نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے واقعی شرم آنے لگی تھی۔ بہت دن تک میں نے اپنے آپ پر شرافت اور دیانت داری کا خول چڑھائے رکھا تھا۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا تھا اور اب مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی تھی۔ ایک طرف چوہدری غفور الٰہی تھا۔ جو صرف بیس سال پہلے ایک معمولی ملازم تھا اور ایک معمولی کوارٹر میں رہتا تھا مگر اب وہ کروڑ پتی تھا۔ اس نے جوڑ توڑ سازشوں اور بلیک مارکیٹ کے ذریعے بے انتہا دولت جمع کی تھی۔ مربے، بلڈنگیں اور کارخانے خریدے تھے اور اب ملک کا مشہور لیڈر بن بیٹھا تھا۔ محض اس لیے کہ دیانت داری اس کے نزدیک ڈکشنری میں لکھا ہوا ایک لفظ تھا اور بس۔ جبکہ دوسری طرف میں تھا۔ دیانت دار، شریف اور اصول پرست لیکن تہی دست و تہی داماں، میرے جسم پر معمولی کپڑے تھے اور آنکھوں میں گراسٹگی اور یاسیت جو محرومی، افلاس اور احساس کمتری کی پیدا کردہ تھی۔ میں ایک کھوکھلا آدمی تھا۔ میرا دل اخالی تھا اور میری روح خالی تھی اور میرا پیٹ خالی تھا۔ پیٹ کم بخت کبھی نہیں بھرتا۔ ہمیشہ خالی رہتا ہے اور جلتا رہتا ہے۔ دوزخ کی طرح اس کی جلن کبھی کم نہیں ہوتی۔ کیونکہ خالی پیٹ کی جلن مٹانے کے لیے روٹی کی ضرورت ہوتی ہے اور روٹی شرافت اور ایمان داری سے حاصل نہیں ہوتی۔ گول، سرخ اور سوندھی سوندھی روٹیاں حاصل کرنے کے لیے خود غرض، سنگ دل اور مکار بننا پڑتا ہے۔ چوہدری صاحب نے ٹھیک کہا تھا مجھے واقعی شرم آنے لگی تھی۔ آخر کب تک ترسوں گا۔ کب تک محروم رہوں گا۔ نہیں، اب اور نہیں ترسا جاتا۔ پیٹ کی جلن اب بہت بڑھ گئی تھی۔ اب یہ جلن مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس دوزخ کو اب ٹھنڈا ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے نوٹوں کی وہ گڈی جو چوہدری صاحب نے بلوریں ٹیبل پر ڈالی تھی، اٹھالی اور سیدھا شہر کے سب سے فیشن ایبل بازار کی طرف چل پڑا۔ کیونکہ سیٹھ جی نے کہا تھا۔

''تقریر لکھنے سے پہلے کپڑے خریدو.....!''

دھیرے دھیرے میری زندگی اس طرح بدل

گئی جیسے گرگٹ رنگ بدلتا ہے۔

سب سے پہلے میں کوٹھری نما تنگ و تاریک کمرے سے نکل کر ایک کشادہ فلیٹ میں پہنچا۔ پھر میرے جسم پر بیش قیمت کپڑے آئے۔ پھر سونے کی ٹائی پن اور سونے کے بٹن آئے۔ پھر شراب کی بوتل آئی۔ میں نے گھٹیا قسم کے سگریٹ چھوڑ کر اعلا درجے کی غیر ملکی سگریٹیں پینا شروع کر دیں۔ دال روٹی کی جگہ مرغن غذاؤں نے لے لی اور یہ سارے لوازمات چوہدری غفور الٰہی فخر شاہ کی بدولت حاصل ہوئے۔

چوہدری صاحب مجھے پیسہ دیتے تھے اور میں ان کے لیے تقریریں لکھتا تھا۔ میری تقریروں اور اخبار کے اداریوں نے چوہدری صاحب کی شہرت میں مزید اضافہ کیا۔ اخبار میں چوہدری صاحب کی سیاسی سوجھ بوجھ اور لیاقت کی دھوم مچنے لگی۔ میری لکھی ہوئی تقاریر ''زور بیان'' کا بہترین نمونہ تھیں۔ اس طرح الفاظ کا جادو جگاتا کہ سامعین بے خود ہو کر تالیاں بجانے لگتے۔ ان تقریروں میں ایسے وعدے کیے جاتے جو کبھی پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ یا کم از کم جنہیں چوہدری صاحب جیسا کاروباری آدمی پورا نہیں کر سکتا تھا۔ سیاست ایک سمندر ہے اور عوام محض مچھلیاں۔ یہ مچھلیاں اس وقت تک نہیں پھنسیں گی۔ جب تک وعدوں کا سنہرا جال نہیں پھینکا جائے گا اور چوہدری صاحب کے لیے یہ جال میں تیار کرتا تھا۔ مجھے وعدوں کی تکمیل یا عدم تکمیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو محض اپنی محرمیوں کی تلافی کر رہا تھا۔

گرگٹ رنگ بدلتا ہے تو سرخ ہو جاتا ہے۔ میں بھی کچھ دنوں میں سرخ و سفید ہو گیا۔ آنکھوں میں چمک آ گئی۔ چہرے کی پژمردگی رخصت ہو گئی اور جسم پر چربی چڑھ گئی۔ شخصیت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ میرے احساسات بھی بدل گئے۔ اب اگر کبھی کبھار پیچھے مڑ کر ماضی کی طرف دیکھتا تو بڑا تعجب ہوتا۔ وہ آدمی کہاں گیا جو اصول اور دیانت داری کو گلے سے لگائے ہوئے تھا۔ وہ آدمی زندگی کے پرخار راستے پر گر کر دم توڑ چکا تھا۔ شرافت اور دیانت نے نہ اس کی ٹانگوں کو توانائی بخشی اور نہ پیٹ کی جلن بجھائی تھی۔ مجھے کبھی کبھی اس آدمی پر بڑا ترس آتا۔ بے چارہ، اصولوں پر دیانت کی دیمک زدہ بیساکھیوں کے سہارے کب تک چلتا۔ آخر کار اس کا انجام یہی ہونا تھا۔ پھر مجھے حیرت ہوتی۔ میں نے آخر اتنا بہت سا وقت ان خرافات میں کیوں ضائع کر دیا۔

اگرچہ ماضی سے میرا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ مگر بیتے دنوں کی کچھ یادوں سے ذہنی رشتہ بدستور قائم تھا۔ میرے احساسات ابھی تک ماضی کے جزیروں میں بھٹکتے تھے اور مرجانہ کو تلاش کرتے تھے وہ کہاں ہو گی، آخر وہ کہاں ہو گی؟ پھر میں حیران ہو کر سوچتا کہ میں مرجانہ کو کیوں یاد کرتا ہوں۔ وہ میری کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ میرا اور اس کا کوئی رشتہ، کوئی سمبندھ نہیں۔ مگر یہ سچ نہیں تھا۔ مرجانہ میری زندگی میں پہلی عورت تھی جس نے میرے احساس کے نگارخانے میں اپنی تصویر سجائی تھی اور دل کے ایوانوں میں چراغ روشن کیا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان وہ رشتہ تھا جو خود بخود پکے سے اور انجانے میں استوار ہو جاتا ہے۔ مجھے کبھی گمان نہیں ہوا تھا اور مرجانہ میرے لیے ہمیشہ آنکھوں سجا رہنے والا سپنا بن گئی تھی۔ مگر اب وہ کہاں ہو گی۔ کتنے برس بیت گئے ہیں کہ میں نے اس کی مونی صورت نہیں دیکھی۔ شاید وہ اب واپس آ گئی ہو۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ واپس جاؤں مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ انتخابات سر پر تھے اور چوہدری غفور الٰہی فخر شاہ قومی اسمبلی کے امیدوار تھے اور میں ان کی انتخابی کمیٹی کا ایک رکن تھا۔ اس بنا پر مصروفیت اتنی زیادہ تھی کہ میں ایک دن کے لیے بھی دارالحکومت سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔

ایک شام چوہدری غفور الٰہی نے مجھے طلب کیا۔

''الیکشن میں اب کچھ زیادہ دن باقی نہیں رہ گئے ہیں۔'' انہوں نے یہ بات اس وقت کہی جب میں ان کے اور اپنے لیے وہسکی کے بیگ تیار کر چکا تھا۔ پھر میں نے ایک سگریٹ جلائی اور سر ہلا کر جواب دیا۔

''جی ہاں۔''

چوہدری صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''مجھے امید ہے کہ تم لوگ اپنا کام ٹھیک ٹھیک کر رہے ہو گے!''

''آپ بالکل فکر مند نہ ہوں.....'' میں نے مستعدی سے جواب دیا۔ ''ہم لوگ دن رات شدید محنت کر رہے ہیں۔ ووٹروں کا جھکاؤ آپ کی طرف ہے اور ہمیں پوری امید ہے کہ آپ واضح اکثریت سے جیت جائیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' چوہدری صاحب نے کہا۔ ''مگر تمہیں تو علم ہے کہ بستی سبحان پورہ بھی حلقہ نمبر 3 میں ہی ہے۔''

''جی ہاں.....''

''وہاں کی رپورٹ کچھ اچھی نہیں ہے۔'' چوہدری صاحب نے سگار سلگا کر کہا۔ ''جیسا کہ تم جانتے ہو وہاں کے ووٹ اگر مجھے نہ ملے تو کامیابی کا امکان بہت کم ہے۔ میرے دو ایک آدمیوں نے جو وہاں انتخابی مہم کے ذمہ دار ہیں۔ بتایا ہے کہ ووٹروں کا جھکاؤ مخالف پارٹی کے امیدوار کی طرف زیادہ ہے۔ لیکن ہم چاہیں تو ان کے ووٹ جیت سکتے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ کوشش تم آج ہی کر ڈالو۔''

''مجھے کیا کرنا ہو گا.....؟'' میں نے ذرا آگے جھک کر پوچھا۔

چوہدری صاحب نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر..... کا جو کے چند دانے اٹھا کر منہ میں ڈالے اور جبڑوں کو زور زور سے حرکت دیتے ہوئے بولے..... ''وہاں ایک عورت ہے جو عرف عام میں استانی بیگم کہلاتی ہے۔ سنا ہے کہ بستی سبحان پورہ کے لوگوں پر اس عورت کا بہت اثر ہے۔ اس نے وہاں ایک اسکول بنا رکھا ہے۔ اس اسکول میں ایک طرف تو بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اور دوسری طرف عورتوں کو دست کاری سکھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ عورتیں وہاں کے لوگوں کی خدمت اور بہبود کے بہت سے کام کرتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس عورت کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن اگر وہ لوگوں سے کسی خاص امیدوار کو ووٹ دینے کے لیے کہے تو اس کی بات ٹالی نہیں جائے گی کیونکہ بستی کے افراد کی اکثریت آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس عورت کے پاس جاؤ اور اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کرو۔ ہر طرح کا لالچ دو۔ ضرورت پڑے تو پندرہ بیس ہزار روپے کی پیشکش بھی کرو۔ اگر ہم ایک بار اس عورت کی حمایت اور تائید حاصل کر لیں تو الیکشن جیتنا بہت آسان ہو جائے گا۔''

''استانی بیگم۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو اس عورت کا نام بھی نہیں سنا۔''

''میں نے بھی نہیں سنا تھا.....'' چوہدری صاحب نے کہا۔ ''وہ عورت خدمت خلق کے کام، شہرت یا مرتبے کے حصول کے لیے نہیں کرتی۔ اسی بنا پر اخبارات میں اس کا ذکر اب تک نہیں ہوا۔ وہ کوئی نمایاں قسم کی سماجی یا سیاسی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن بستی کے لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کی بات مانتے ہیں۔''

''بہتر ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں، میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

''بستی سبحان پورہ نچلے طبقے کے لوگوں کی بستی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو غریب اور نادار تھے لیکن محنت و مشقت پر یقین رکھتے تھے۔ زیادہ تر افراد قریبی ملوں میں کام کرتے تھے۔ بستی سبحان پورہ بہت بڑی تھی اور وہاں کی آبادی اتنی زیادہ تھی کہ انتخاب کے نتیجے میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی تھی۔ کوئی بھی امیدوار اگر بستی کے سارے ووٹ لے جائے تو اس کی جیت یقینی تھی۔ اسی بنا پر چوہدری غفور الٰہی..... بستی سبحان پورہ کو اہمیت دینے پر مجبور ہوئے تھے چونکہ بستی کا زیادہ تر حصہ کسی نقشے اور منصوبے کے بغیر بسا تھا اس لیے گلیاں ٹیڑھی میڑھی اور تنگ تھیں۔ نالیوں میں

ٹھہرے ہوئے گندے پانی سے تعفن کے بھبکے اٹھتے رہتے تھے۔ میں کچی دیواروں والے چھوٹے چھوٹے بدوضع مکانوں کے درمیان سے گزرتا اور لوگوں سے استانی بیگم کی رہائش گاہ کا پتا پوچھتا ہوا چھوٹے سے میدان میں پہنچا۔ میدان کے دوسری جانب سفید دیواروں والا ایک مکان تھا۔ مکان کے آنگن میں پپیتے اور امرود کے چند درخت دکھائی دے رہے تھے۔ اس مکان سے ملحق ایک اور عمارت تھی جس کی وسعت اور طرز بناوٹ سے صاف پتا چلتا تھا کہ اسکول ہے۔ میں نے سفید مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند منٹ بعد قدموں کی چاپ سنائی دی پھر کنڈی گری اور دروازہ کھل گیا۔ دوسرے لمحے میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''ارے تم.....!''

''ارے آپ.....'' اس نے تعجب سے کہا۔

تو آخر کاریوں بھی ہوتا ہے۔ زندگی میں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ ہم جو سپنے دیکھتے ہیں وہ کچھ اس طرح اچانک اور غیر متوقع طور پر پورے ہوتے ہیں کہ ہم حیات ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ کہکشاں میں اتنے ستارے ہیں جنہیں شمار کرنا ممکن نہیں۔ کہکشاں کے ستاروں کو شمار کرنا تو شاید کبھی ممکن ہو جائے مگر اتفاقات کی گنتی مشکلیں ہیں۔ ان کا اندازہ لگانا بلاشبہ ممکن نہیں۔ کتنے برس بیت گئے تھے۔ میں ہر دم اسے یاد کرتا رہا تھا۔ ہر دم اس کے سپنے دیکھتا رہا تھا اور غیر محسوس طور پر اسے ملنے کی آرزو کرتا رہا تھا مگر وہ نہیں ملی تھی۔ انسانوں کا جنگل بے کنار ہے اور وہ اس جنگل میں کہیں گم ہو گئی تھی اور میں نے دھیرے دھیرے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب وہ نہیں ملے گی۔ مگر گمان بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ اس طرح یک لخت سامنے آجائے گی کہ مجھے حقیقت پر وہم کا شبہ ہوگا۔

وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ سچ مچ وہی تھی۔ سر موفرق نہیں تھا۔ وہی نکلتا ہوا قد، وہی چمپئی رنگت اور بڑی بڑی کٹورہ جیسی آنکھیں اور سیاہ بال اور وہی صاف وشفاف مسکراہٹ، سر سے پیر تک، وہ بالکل وہی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ گزرے ہوئے ماہ وسال نے اس کی شخصیت میں قدرے تبدیلی کی تھی۔ اب اس کے سراپا میں جوانی کے ابتدائی دور والی کم روئی اور ناپختگی نہیں تھی بلکہ اب اس کے چہرے اور شخصیت میں وقار اور سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ عامیانہ پن بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا جو ایک طوائف کی ذات کا جزو ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ بڑی شائستہ اور رکھ رکھاؤ والی دکھائی دی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ نہ لپ اسٹک، نہ پاؤڈر، کوئی زیور بھی نہیں تھا۔ کلائیوں میں صرف ایک ایک کانچ کی چوڑی پڑی تھی اور بس۔ اگرچہ وہ مرجانہ ہی تھی مگر وہ مرجانہ ہرگز نہیں تھی جو میرے گھر میں آئی تھی۔ یہ تو مرجانہ ہوتے ہوئے بھی کوئی اور تھی۔ باوقار، مہذب اور شائستہ، سفید سوتی ساڑھی میں وہ کسی دیوی کی طرح بلند نظر آرہی تھی۔

''آئیے جمال بابو، اندر آئیے.....'' آخر کار اس نے کہا۔

اس کا گھر بھی اس کی طرح سادہ اور نفیس تھا۔ دو چھوٹے کمرے صحن اور کشادہ آنگن۔ پورے گھر میں غالباً ہال ہی میں سفیدی کی گئی تھی۔ دیواروں پر تصویریں نہیں تھیں اور نہ ہی پورے گھر میں مجھے ایسی کوئی اور شے دکھائی دی جو اس کے ماضی کی غماز ہوتی۔ آنگن میں امرود کے درخت کے نیچے ایک بنچ اور چھوٹی سی ٹیبل پڑی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ مرجانہ کچن میں چلی گئی۔ میں ابھی تک استعجاب کے عالم میں غوطے کھا رہا تھا۔ یہ سب کچھ جو میرے سامنے ہے، آخر اسے کیا سمجھوں۔ یہ سب کچھ آخر کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک مرجانہ تو وہ تھی جو عامیانہ قسم کا میک اپ کر کے اور پاؤں میں گھنگرو باندھ کر ساری سارات میرے سامنے ناچتی تھی۔ جو سگریٹ، پان اور شراب سے شوق کرتی تھی۔ عاشق بناتی تھی اور انہیں گالیاں دیتی تھی۔ لیکن ایک مرجانہ یہ ہے، سر سے پیر تک سادگی ہی سادگی۔ یہ تبدیلی آخر کیسے ہو گئی۔ مرجانہ نے اپنی ذات کے سارے داغ دھبے آخر کیونکر دھو ڈالے۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ وہ چائے لے کر آگئی۔ میں نے ایک اور سگریٹ جلائی۔ چائے کا گھونٹ لیا اور مرجانہ کو غور سے دیکھا۔

''مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم سامنے بیٹھی ہو۔'' آخر کار میں نے کہا۔ ''یاد ہے کتنے سال بیت گئے ہیں۔''

''ہاں، کئی برس گزر گئے ہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے آج بھی ایک ایک بات اچھی طرح یاد ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو ایک بار تمہارے گھر بھی گیا تھا۔''

''گھر گئے تھے، کیوں؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''دل نہیں مانا تھا۔'' میں نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیا۔

''تمہیں یاد ہے، ایک بار تم غریب الدین کے بہارستان ہوٹل میری تلاش میں گئی تھیں۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو جی بے چین ہو گیا۔ پتا نہیں تم کیوں آئی تھیں۔ چنانچہ دوسرے دن بازار حسن جا پہنچا وہاں استاد سمندر سے ملاقات ہوئی اور پتا چلا کہ تم گھر چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ وہاں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ فرار ہوئی ہو۔''

مرجانہ ہنسنے لگی، پھر آہستہ سے بولی۔ ''شہر چھوڑنے سے پہلے میں آپ سے ایک بار ملنا چاہتی تھی۔ اسی لیے بہارستان ہوٹل گئی تھی۔''

''میں یہاں آکر اور تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ سچ پوچھو تو ابھی تک یہ سب کچھ سپنا سا لگ رہا ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے ذرا تفصیل سے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''مرجانہ نے میری پیالی میں مزید چائے انڈیلی ''تفصیل کچھ زیادہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں سیدھی اسی شہر میں چلی آئی تھی۔ یہاں ایک بڑے میاں تھے، جن کو میں بچپن سے جانتی تھی۔ انہوں نے مجھے سہارا دیا اور اپنی بیٹی کی طرح اپنے گھر میں رکھا۔ شروع کے دن بڑے تکلیف دہ تھے۔ ایک طرف میرا ماضی تھا جو مجھے آوازیں دیتا تھا۔ دوسری طرف نئی زندگی کی تکالیف تھیں۔ مگر میں نے طے کر لیا تھا کہ جو گزر گاہ ترک کر دی۔ اب اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھوں گی جو ناتے توڑ ڈالے۔ پھر انہیں استوار نہیں کروں گی۔ ابتداء میں میں ایک فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ بچپن میں حاصل کی ہوئی تھوڑی بہت تعلیم اس طرح کام آئی۔ کچھ دن میں بچوں کی تعداد بڑھ گئی تو میں نے نوکری چھوڑ دی اور گھر پر پلاسٹک کے ہینڈ بیگ بنانے لگی۔ کچھ کام سلائی کڑھائی کا بھی کر لیتی تھی۔ یہ سب کچھ بڑے میاں فیضان کا تھا۔ انہوں نے مجھے دست کاری سکھائی تھی۔''

''اور یہ اسکول وغیرہ.....؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سب کچھ رفتہ رفتہ ہو گیا۔'' مرجانہ نے کہا۔ ''اب بچوں کی تعداد بڑھی تو میں نے دو تین پڑھی لکھی عورتوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ ان دنوں اس آبادی کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے چند لڑکیوں کو دستکاری سکھانی شروع کی۔ پھر کچھ اور عورتیں بھی آگئیں۔ ان دونوں میرے گھر کے پاس والی ساری زمین بیکار پڑی تھی۔ میری تجویز پر محلے کے چند نوجوانوں نے اس زمین کو ہموار کیا اور چٹائیوں کی دیواریں اٹھا کر باقاعدہ اسکول بنا دیا۔''

''مگر اب تو اسکول کی عمارت پختہ ہو گئی ہے۔''

''مرجانہ ہنسنے لگی۔'' ہاں، دھیرے دھیرے اسکول بن گیا۔ مگر یہ کوئی باقاعدہ اسکول نہیں ہے۔ ہم یہاں ان بچوں کو تعلیم دیتے ہیں جن کے ماں باپ اسکول کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ جو سچ پوچھو تو میں نے یہ سب کچھ کسی ارادے یا منصوبے کے تحت نہیں کیا تھا۔ بس خود بخود ہوتا چلا گیا۔ مگر اس سے یہاں کے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ دست کاری کی بنا پر اکثر گھروں میں مزید آمدنی ہونے لگی۔ بچے آوارہ گردی سے بچ گئے اور صرف یہی نہیں، ہم نے اس

محلے کو صاف ستھرا رکھنے کے سلسلے میں بھی لوگوں کو بہت کچھ سکھایا ہے۔"

"تم نے بہت اچھا کام کیا ہے مرجانہ، حقیقت ....."

"مجھے مرجانہ نہ کہیں....." اس نے جلدی سے مجھے ٹوک دیا۔

"میرا بچپن کا نام کنیز ہے۔ کنیز بیگم، یہاں لوگ استانی بیگم کہتے ہیں۔ آپ مجھے کنیز کہیں تو اچھا ہے۔"

میں چپ ہو گیا اور اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے ماضی کے دنوں سے ہی نہیں، ماضی کے نام سے بھی ناتہ توڑ لیا تھا۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے کنیز۔ میں ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیے....."

"تم نے شادی نہیں کی.....؟"

"وہ یکا یک ذرا سا محجوب ہو گئی۔ مسکرا کر بولی۔ "نہیں اگرچہ میں چاہتی تھی کہ شادی کرلوں۔ لیکن قسمت کی بات ہے مجھے کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو میرے من کو بھاتا۔ پھر مصروفیات بڑھ گئیں اور یہ خیال خود بخود دلتوی ہو گیا۔"

"میں کچھ دیر چپ رہا اور تذبذب میں مبتلا رہا۔ پوچھوں یا نہ پوچھوں۔ ایسی کوئی بات زبان سے نہیں نکالنا چاہتا تھا جس سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ دل بڑا نازک آبگینہ ہے۔ ذرا سی ٹھیس لگتی ہے تو ٹوٹ جاتا ہے اور میں اسے ہلکی سی ٹھیس بھی نہیں پہنچانا چاہتا تھا چند ثانیے خاموش رہ کر میں نے احتیاط سے کہا۔ "اگر ناگوار نہ ہو تو مجھے ایک بات ضرور بتاؤ۔ وہ یہ کہ تم نے گھر کیوں چھوڑا.....؟"

وہ بڑے حوصلے سے مسکرائی اور جب بولی تو اس کی آواز سے تیقن اور اعتماد کا اظہار ہو رہا تھا۔ "آپ بے شک یہ ذکر چھیڑ سکتے ہیں۔ اب وہ وقت گزر گیا جب مجھے اپنے ماضی کے خیال سے اذیت پہنچتی تھی۔ جمال بابو۔ میں نے گھر نہیں چھوڑا۔ کیونکہ وہ گھر نہیں کوٹھا تھا۔ میں جب تک کوٹھے پر تھی تب تک مجھے گھر کا راستہ نہیں معلوم تھا۔ میں صرف کوٹھے اور کوٹھے کے راستے کو جانتی تھی۔ پھر میں آپ کے گھر گئی اور یوں میں گھر اور گھر کے راستے سے متعارف ہوئی۔ پہلی بار جانا کہ گھر کیا چیز ہے۔ اس کے بعد میں آپ کے گھر سے رخصتی ہوئی تو کوٹھے کا راستہ بڑا پر خار نظر آیا۔ قدم قدم پر میرے پاؤں زخمی ہو گئے۔ میں نے بمشکل کچھ دن کو کوٹھے پر گزارے۔ مگر اس طرح کہ بار بار اپنے آپ سے نفرت ہوئی۔ بار بار اپنا وجود مجھے حقیر اور کم تر نظر آیا میں اپنا "آپ" نہیں تھی۔ محض کھلونا تھی۔ دوسروں کی دل بستگی کا ذریعہ تھی اور کچھ بھی نہیں۔ پھر جب ذہنی کرب انتہا کو پہنچا تو میں نے سب کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔"

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر روشنی تھی۔ ایسی روشنی جو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی کا اعتماد اپنی ذات پر قائم ہوتا ہے۔ کنیز بھی اپنی ذات کا اعتماد حاصل کر چکی تھی۔ وہ گھر سے متعارف ہو چکی تھی اور اس نے گھر کا راستہ بھی پہچان لیا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ کوٹھے سے اتر کر گھر کی دہلیز تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ کنیز نے یہ پل صراط طے کرلیا تھا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس نے گھر کا راستہ ہی نہیں پہچانا بلکہ گھر بنایا بھی ہے اور گھر بھی ایسا کہ جہاں روشنی ہی روشنی ہے اور مسرت ہی مسرت ہے۔ اس دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو اس انمول خزانے کو حاصل کر پاتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ وہ خود ہی بولی۔

"اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتائیں۔"

میں نے اپنے متعلق اسے تفصیل سے بتایا۔ اس کے جانے کے بعد میرے شب و روز کس طرح گزرے تھے کیونکر میں شہروں شہروں بھٹکا تھا اور کس طرح اس کے تصور کو حذر جاں بنائے رہا تھا۔ پھر کس طرح دارالحکومت پہنچا اور اخبار میں ملازم ہوا۔ پھر کیونکر قسمت چوہدری غفور الٰہی تک لے گئی۔ کنیز بہت توجہ سے سنتی رہی۔ بار بار اس کی پلکیں جھپکیں۔ بار بار اس کے چہرے پر رنگوں نے جال بنا۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے کہا۔

"وہی چوہدری غفور الٰہی جو اس الیکشن میں انتخاب لڑ رہے ہیں.....؟"

"ہاں....." میں نے کہا۔ "میں ان کا پرائیویٹ سیکریٹری ہوں۔"

اس نے قدرے توقف کے بعد ذرا تجسس سے پوچھا۔ "شادی کیوں نہیں کی.....؟"

"کیا کہوں....." میں ذرا کسمسا کر بولا۔ "کچھ تو یہ ہے کہ حالات میرے حق میں نہیں تھے اور کچھ یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسی عورت ملی ہی نہیں جو میرے من کو بھاتی اور....." پھر میں بات ادھوری ہی چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میرے ذہن پر تو وہ چھائی ہوئی تھی پھر بھلا میں کسی اور عورت میں کیسے دلچسپی لے سکتا تھا۔ مگر یہ کہنا اچھا نہ معلوم ہوا۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھے گی۔ کیا محسوس کرے گی۔ اس لیے بات بدل کر بولا "اور پھر جب تک آدمی زندگی میں اچھی طرح قدم نہ جما چکا ہو اس وقت تک شادی کرنا دانش مندی نہیں ہے۔"

"اب کیا خیال ہے۔" اس نے شوخی کے ساتھ میری جانب انگلی اٹھائی۔ "اب تو آپ زندگی میں قدم جما چکے ہیں نا۔"

اس کا اشارہ میرے بیش قیمت لباس کی طرف تھا جو میری موجودہ حیثیت کی غمازی کر رہا تھا۔ میں نے طلائی ٹائی پن پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "ہاں کنیز، اب میرے پاس سب کچھ ہے۔ عمدہ مکان ہے، کار ہے۔ پیسہ ہے۔ میں نے ان تمام محرومیوں کی تلافی کر دی ہے جو ماضی میں میرا مقدر تھیں۔ تم تو جانتی ہو میں نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں۔ محرومی اور تنگ دستی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب چوہدری غفور الٰہی نے مجھے سکریٹری منتخب کیا تو میں نے خود کو یکسر بدل ڈالا۔ اب میرے پاس سب کچھ ہے اور جب بھی مناسب ہو گا میں شادی کرلوں گا۔"

"کوئی لڑکی ہے نظر میں.....؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں....." میں بھی مسکرایا۔

یکا یک کنیز نے چونک کر کہا۔ "اے لو، اتنی دیر سے ہم دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن میں نے آپ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میرے پاس کس سلسلے میں آئے ہیں۔"

"میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر گردن موڑ کر اسکول کی ملحقہ دیوار پر نگاہ ڈالی اور پھر جیب سے پندرہ ہزار روپے کا چیک نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ "میں تمہارے اسکول کے لیے ایک چھوٹی سی رقم کا عطیہ لایا ہوں۔"

کنیز یکا یک سٹپٹا کر رہ گئی۔ حیرت اس کے چہرے پر صاف پڑھ سکتی تھی۔ اس نے گہری نظروں سے پہلے چیک کو اور پھر مجھے دیکھا۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "یہ تو پندرہ ہزار روپے ہیں کیا چوہدری غفور الٰہی نے بھیجے ہیں۔؟"

"ہاں۔"

"تو گویا وہ مجھے خریدنا چاہتے ہیں۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں نے چوہدری غفور الٰہی کو رپورٹ دے دی کہ استانی بیگم نے ہماری حمایت کا وعدہ کرلیا ہے۔ مگر یہ سچ نہیں تھا۔ کنیز نے چوہدری صاحب کی حمایت کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے پندرہ ہزار روپے کا عطیہ قبول کیا تھا۔ حالانکہ میں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ چوہدری نے یہ رقم محض مدد کے خیال سے بھیجا ہے تاکہ وہ اپنے مدرسے کو مزید ترقی دے سکے۔ لہٰذا اسے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ مگر کنیز نے معذرت کرلی تھی۔ اس نے کہا تھا یہ اسکول غریب ہاتھوں کی محنت سے بنا ہے۔ اور انہی غریب ہاتھوں کے طفیل چلتا رہے گا۔ پھر میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ چوہدری صاحب کی حمایت اور تائید کا اعلان کرے۔ مگر وہ اس پر بھی متفق نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "جمال بابو میں چوہدری صاحب کو نہیں جانتی۔ مگر اتنا مجھے علم ہے کہ ان کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے۔ ان کے کارخانے میں کام

کرنے والے مزدوروں کو کئی سال سے بونس نہیں ملا۔ ان کے ہاں اجرت کی شرح بھی کم ہے۔ اس کے علاوہ چوہدری صاحب کے مکانوں میں لوگ رہتے ہیں۔ وہ بھاری کرایہ ادا کرتے ہیں۔ مگر برائے نام سہولتوں سے بھی محروم ہیں۔ اس صورت میں ان کی حمایت کیسے کرسکتی ہوں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں ایک معمولی عورت ہوں۔ میری حمایت یا مخالفت سے بھلا کیا فرق پڑے گا۔"

لیکن نہ صرف میں بلکہ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی حمایت یا مخالفت سے کیا فرق پڑے گا۔ وہ ایک معمولی عورت ہی سہی لیکن جب وہ بستی سبحان پورہ کے لوگوں سے کہے گی کہ کسے ووٹ دینا ہے اور کسے نہیں دینا ہے تو اس کی بات ٹالی نہیں جائے گی وہ لوگ جن کی کنیز نے برسوں خدمت کی ہے اور جنہیں تعلیم اور ہنر سے بہرہ ور کیا ہے، اس کے مشورے کو ضرور اہمیت دیں گے جب میں نے بہت اصرار کیا تو اس نے کہا۔

"اچھی بات ہے جمال بابو، میں صرف آپ کی خاطر اتنا وعدہ کرتی ہوں کہ میں خود لوگوں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ لیکن اگر کوئی خود ہی میرے پاس آئے گا تو میں اپنی رائے ضرور ظاہر کروں گی۔"

اور اتنا بہت کافی تھا۔ آخر کتنے لوگ کنیز کے پاس اس کا مشورہ لینے جائیں گے۔ محض سو پچاس باقی ووٹروں کو خریدنا یا ہموار کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ میں نے وہ پندرہ ہزار چوہدری کو واپس نہیں کیے بلکہ اپنے پاس رکھ لیے۔ یہ سوچ کر پھر کسی موقع پر کنیز کو دینے کی کوشش کروں گا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ الیکشن کا ہنگامہ عروج پر پہنچتا گیا۔ جلسے ہوتے۔ میٹنگیں ہوئی، اخباری کانفرنسیں بالائی جاتیں۔ چوہدری صاحب میری لکھی ہوئی تقریریں پڑھتے۔ جن میں رنگ ہی رنگ ہوتے تھے۔ خوب صورت، دلکش اور نظر فریب، لیکن حقیقت کا رنگ کا کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔ چوہدری صاحب کہتے، میں لوگوں کو خوشی دوں گا اطمینان اور آسودگی دوں گا۔ میں مساوات وعدل کا ایک ایسا نظام دوں گا جس میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے۔ (لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ پانی پینے کے بعد شیر بکری کو کھا نہیں جائے گا۔) پھر وہ لوگوں کو گیروں پر جاتے اور گھی کے ٹین اور کورے لٹھے کے ٹکرے تقسیم کرتے (کور الٹھا کفن بنانے کے کام بھی آتا ہے) اور ان سے وعدے کرتے کہ وہ عوام الناس کی اتنی خدمت کریں گے کہ لوگ حیران رہ جائیں گے۔ (لوگ ان کا یہ وعدہ سن کر بھی حیران ہوتے تھے) میں سارا دن مصروف رہتا۔ تقریریں لکھتا' اخبارات کے لیے بیانات جاری کرتا اور پھر انتخابی امور سے متعلق معاملات کی دیکھ بھال کرتا۔ شام ہوتی تو اپنی خوب صورت، ٹرائف میں بیٹھ کر بستی سبحان پورہ کا رخ کرتا۔

لیکن بستی سبحان پورہ میں خود نہیں جاتا تھا۔ خود بخود جاتا تھا۔ کوئی جذبہ تھا، کوئی کشش تھی جو مجھے کھینچ کر وہاں لے جاتی تھی۔ وہاں کنیز بھی جسے دیکھ کر اور جس کی نرم اور مترنم آواز سن کر میں پھول کی طرح مہک اور شبنم کی طرح تر تازہ ہو جاتا۔ کنیز کا پہلا روپ خواہ کیسا ہی رہا ہو۔ مگر اس کا دوسرا روپ بڑا دلآویز تھا۔ ایسا کہ دیکھتے رہو۔ پر جی نہ بھرے، نگاہوں کی پیاس نہ بجھے۔ میری پیاس بھی نہیں بجھتی تھی۔ اگر بجھتی تو میں روز روز کیوں جاتا۔ مگر میں جاتا تھا۔ وہ مجھے صحن میں مونڈھے پر بٹھاتی۔ میرا کوٹ ہینگر پر ٹانگتی اور پھر چائے بنانے چلی جاتی۔ اگرچہ گھر میں دو افراد اور بھی تھے۔ بوڑھے چاچا رمضو اور خالہ آمنہ گھر کے کام کاج کی ذمہ داری خالہ آمنہ نے سنبھال رکھی تھی۔ مگر میرے لیے چائے کنیز خود بناتی تھی۔ پھر میں مونڈھے پر بیٹھا بیٹھا چائے پیتا رہتا اور کنیز سے باتیں بھی کرتا جاتا۔ اس کا تجزیہ مشکل ہے مگر یہ سچ ہے کہ سفید دیواروں والے اس چھوٹے سے گھر میں مجھے ایسا سکون محسوس ہوتا جس کا ادراک پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ وحشت دل میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور تب میں نے جانا کہ دراصل میں کنیز سے محبت کرتا ہوں۔ جس طرح گہری گھاٹیوں میں گھاس اگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے اور کسی کو پتا نہیں چلتا۔ اسی طرح میرے دل میں اس کی چاہت بھی پل پل بڑھتی رہی تھی اور مجھے احساس نہیں ہوا تھا۔ برسوں پہلے مرجانہ

میرے گھر سے رخصت ہوئی تھی، مگر دل میں بدستور براجمان تھی۔ اور وہ بھی اس طرح کہ وہاں سے رخصت ہونے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ تو گویا ساری بات یہ ہے کہ میں کنیز کو چاہتا ہوں۔ اس کی رفاقت میرے لیے ناگزیر ہو چکی ہے۔ زندگی کے سنگلاخ راستے پر تنہا چلتے چلتے میں اب بہت تھک گیا ہوں۔ اب اور چلنا مشکل ہے۔ اب مجھے صندلی بانہوں اور ریشمی زلفوں کے سہارے کی ضرورت ہے مگر یہ بانہیں اور زلفیں کسی اور کی نہیں کنیز کی ہونی چاہئیں۔ ہر چند کہ اب مجھے سب کچھ حاصل ہے۔ میرے پاس پیسہ ہے۔ عمدہ مکان ہے اور کار ہے اور میرے لیے ایسی لڑکیوں کا حصول مشکل نہیں جن کی عمر سولہ سال سے ایک دن بھی زیادہ نہ ہو۔ نہ جانے کتنی آتی جاتی رہتی ہیں مگر ان میں ایک بھی تو کنیز جیسی نہیں۔ کنیز سب سے مختلف بھی ہے، منفرد بھی اور ممتاز بھی۔ وہ عورتیں مجھے کھاتی خوشی تو دے سکتی ہیں۔ مستقل رفاقت کی آسودگی نہیں..... کنیز، کنیز کی اتم جاتی ہو کہ تم میرے لیے کتنی ناگزیر ہو چکی ہو۔ کیا تمہیں علم ہے کہ میں ہر پل، ہر لحہ تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں اور کیا تم جانتی ہو کہ میرے دل کی دھڑکنیں صرف ایک نام کا ورد کرتی ہیں کنیز، کنیز ہاں یقیناً تم جانتی ہوں ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ صرف تم ہی میرا کوٹ ہینگر پر ٹانگیں اور صرف تم ہی میرے لیے چائے اور سموسے اور کباب بناتیں۔ یہ کام خالہ آمنہ بھی تو کرسکتی ہیں۔ مگر تم جانتی ہو، اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم میرے لیے کیا بن چکی ہوں۔

اگر میں کنیز سے زندگی بھر کے لیے اس کا ہاتھ مانگ لوں تو وہ انکار تو نہیں کرے گی.....!

نہیں میاں، اپنے آپ کو کشمکش میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھلا کیوں انکار کرے گی۔ ہاں یقیناً وہ انکار نہیں کرے گی میں نے خود کو یقین دلایا۔ مجھے وہ دن اب بھی اچھی طرح یاد تھا جب میں نے اس کا ہاتھ مانگا تھا اور اس نے معذرت کرلی تھی۔ مگر اس وقت کی بات اور تھی تب وہ محض ایک طوائف تھی۔ ایک آبرو باختہ..... عورت تھی جس کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی اور جو دنیا کے بازار میں بار بار بکی تھی۔ مگر اب وہ بدل چکی ہے۔ اب وہ معصیت کے متعفن اندھیروں سے نکل آئی ہے اور اپنی ذات کا عرفان حاصل کر چکی ہے۔ اب وہ ایک مہذب، شائستہ اور گھر بست عورت ہے، ہم دونوں کے درمیان جو فرق تھا وہ مٹ چکا ہے۔ لہٰذا وہ انکار کیوں کرے گی۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ میں اس وقت ایک تنگ دامن آدمی تھا۔ میرے پاس، اسے دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ مگر اب میرا دامن اتنا وسیع ہے کہ میں اس کے لیے سارے زمانے کی خوشیاں سمیٹ کر لا سکتا ہوں۔ اس کی مانگ ستاروں سے بھر سکتا ہوں۔ اب میرے پاس سب کچھ ہے۔ کار اور مکان ہے، بینک میں روپیہ ہے۔ روپیہ جو اس دنیا میں ہر دکھ، ہر بیماری کا علاج ہے۔ تمام رشتوں دوستیوں اور محبتوں کی اساس ہے۔ مسرت اور کامیابی کی ضمانت ہے۔ جن کے پاس روپیہ نہیں ہوتا وہ صرف ترستے ہیں اور محروم رہتے ہیں۔ میں ترسنے اور محروم رہنے کی منزلوں سے گزر آیا ہوں۔ اب میرے پاس روپیہ ہے اور میں نہ صرف یہ جانتا ہوں کہ روپیہ کس طرح حاصل کیا جاتا ہے بلکہ اس روپے سے کنیز کے لیے دنیا کی ہر خوشی خرید سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ انکار نہیں کرے گی۔ بلکہ کوئی تعجب نہ ہوگا۔ اگر وہ خود بھی منتظر ہو کہ اس کا ہاتھ مانگوں۔ برسوں گزر گئے ہیں مگر اس نے شادی نہیں کی ہوسکتا ہے وہ خود بھی ان بیتے دنوں میں مجھے یاد کرتی رہی ہو۔ دل کا چراغ ہتھیلی پہ جلا کر میری راہ تکتی رہی ہو۔ ہاں یقیناً یہی بات ہوگی۔ ورنہ اس کی مانگ اب تک سیندور سے محروم نہ ہوتی۔

میں نے طے کرلیا کہ مناسب موقع ملتے ہی اپنے دل کی بات اس سے کہہ دوں گا۔

☆☆☆

پولنگ کا دن آیا اور گزر گیا۔ چوہدری غفور الٰہی اگرچہ چند سو ووٹوں سے جیتے تھے مگر جیت گئے تھے۔ سب سے زیادہ خطرہ بستی سبحان پورہ کے ووٹروں کی طرف سے تھا مگر استانی بیگم کی خاموشی نے واقعی کام کیا وہاں ان گنت ایسے لوگ تھے جو وقتی پریشانیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے ایک ہاتھ سے

نوٹ لیا اور دوسرے ہاتھ چوہدری صاحب کو ووٹ دیا۔ لین دین کے اس کاروبار میں کم از کم چوہدری صاحب کو گھاٹا نہیں ہوا۔ وہ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور اس بات کا قومی امکان تھا کہ وہ وزیر بھی بنا دیے جائیں گے۔

انتخاب میں کامیابی کوئی معمولی بات نہیں تھی، بہت بڑی بات تھی۔ اگرچہ مخالف اخباروں نے چوہدری صاحب کے ماضی، ان کی دولت اور ان کے کردار کے بارے میں ان گنت کہانیاں اچھالی تھیں۔ اس کے باوجود کامیاب ہوگئے اور اس طرح ان کے لیے مزید ترقی اور مزید دولت مند ہونے کے راستے کھل گئے تھے نہ صرف ان کے لیے بلکہ میرے لیے بھی۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وزیر بنتے ہی وہ مجھے کسی اہم سرکاری عہدے پر لگوا دیں گے۔ انتخاب میں کامیابی کی خوشی میں انہوں نے ایک زبردست پارٹی کا اہتمام کیا یہ پارٹی ان کے اپنے بنگلے کے وسیع وعریض لاؤنج میں دی گئی۔ ایک ایسی پارٹی جسے صرف چوہدری غفور الٰہی جیسا دولت مند آدمی ہی دے سکتا تھا۔ اس میں شہر کے دولت مند ترین تاجر، رؤسا، سرکاری افسران ہی نہیں بلکہ تقریباً تمام بڑے بڑے لیڈر بھی شریک ہوگئے۔ شہر کی فیشن ایبل بیگمات بھی موجود تھیں۔ پارٹی دھوم دھام سے چل رہی تھی۔ رنگ ونشاط کا سیلاب امنڈ امنڈ کر آرہا تھا اور وہسکی، برانڈی اور اور رم کے جام قطار باندھ کر چل رہے تھے۔ چوہدری صاحب نے انواع واقسام کی مرغن غذاؤں کے ساتھ ساتھ مختلف شرابوں کا انتظام بھی کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تقریب کسی بھی پہلو سے کمزور رہے۔ کیونکہ یہ ان کی کامیابی کا جشن تھا اور وہ اس جشن کو یادگار بنا دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ لاؤنج میں ہر شے کی فروانی تھی۔ شراب اور کباب اور شباب، بقدر ہمت، بقدر ضرورت، ہاتھ بڑھاؤ اور لے لو۔ چوہدری صاحب نہ آئے دن کامیاب ہوں گے اور نہ آئے دن ایسی پارٹیاں منعقد ہوں گی!

میں ایک دریچے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں جام تھا، دوسرے میں مرغی کی بھنی ہوئی ٹانگ تھی اور نگاہ چوہدری صاحب کی بیوی پر جمی ہوئی تھی جو بغیر بازو کے بلاؤز میں ملبوس، ہونے والے وزیر اعظم کی کمر میں ہاتھ ڈالے، سینے سے سینہ ملائے رقص کر رہی تھیں۔ خود چوہدری صاحب ہونے والے وزیر داخلہ کی صاحبزادی کے ساتھ ڈانس کر رہے تھے۔ ہال میں غیر ملکی موسیقی گونج رہی تھی۔ اور یہ شاید محض اتفاق ہے کہ اس وقت وہاں ہر شے غیر ملکی تھی۔ نہ صرف لباس اور کھانا اور شراب، بلکہ غالباً احساسات اور جذبات بھی۔ کیونکہ وہ رقص بہرحال غیر ملکی رواج کا مظہر تھا۔

میرا جام خالی ہوگیا تھا، میں نے پاس سے گزرتی ہوئی ٹرالی سے ایک پیگ اٹھایا، پھر انگلیاں صاف اور ایک عدد سگار جلایا۔ میں خاصے نشے میں تھا۔ شاید پانچ یا چھ پیگ میرے حلق میں اتر چکے تھے۔ شراب کے رنگوں نے مل کر میری نظروں کو رنگین بنا دیا تھا۔ چنانچہ مجھے ہر شے رنگین اور دلفریب نظر آرہی تھی۔ زرق وبرق پوشاکوں میں ملبوس خواتین، لاؤنج میں پھیلی ہوئی ہلکی روشنی اور دیواروں کی پینٹنگز اور کھڑکیوں کے پردے اور کھڑکی کے باہر دھیرے دھیرے اترتی ہوئی رات کا ریشمی اندھیرا اور ...... اور ...... معاً میں چونک پڑا۔ سر کو زور سے جھٹک کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میں یہاں کیوں ہوں، آخر میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ مجھے تو یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اس خوشی میں، اس رقص وموسیقی میں، اس جشن طرب میں، جب وہ موجود نہیں تو میں کیوں ہوں۔ یقیناً مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ آخر اب تک مجھے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ حد ہوگئی۔ میں نے جلدی سے جام خالی کیا اور دائیں جانب دیوار میں لگے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرے جسم پر میرا سب سے قیمتی سوٹ تھا۔ بال سلیقے سے سجے ہوئے تھے اور چہرہ کچھ خوشی اور کچھ نشے کے باعث گل رنگ ہو رہا تھا۔ پھر میں نے لاؤنج میں چاروں طرف نظر ڈالی کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ میں کہاں اور کیوں جا رہا ہوں۔

جب بستی سجان پورہ پہنچا تو رات ہو رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کی محفل جمی تھی اور دھرتی پر ہوا کا ریشمی

نشیلا رقص جاری تھا۔ میں ہوا کی بانہوں کے سہارے ہولے ہولے قدم رکھتا ہوا کنیز کے دروازے تک پہنچا۔ کنیز گھر پر ہی تھی لیکن چاچا رمضو اور خالہ آمنہ نہیں تھیں اور یہ اچھا ہی تھا۔ کنیز نے مجھے حسب معمول صحن میں موڑھے پر بٹھایا اور چائے بنانے چلی گئی۔ مجھے اس وقت چائے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ سوچا بھی کہ انکار کر دوں مگر اچھا نہ معلوم ہوا۔ نہ جانے کنیز کیا سمجھے گی۔ میں اس وقت ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جو اسے گراں گزرے۔ چنانچہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ وہ چائے لے کر آگئی اور میرے سامنے دوسرے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ بہت ہی بھلی لگ رہی تھی۔ چوڑے کناروں والی ہلکی آسمانی ساڑھی میں اس کی شخصیت کچھ اور نکھر آئی تھی۔ پتا نہیں یہ نشے کی ترنگ تھی یا سچ مچ وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔ میں چند ثانیے اسے محویت دیکھتا رہا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

”اس طرح مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

جی چاہا کہہ دوں، تم اتنی خوب صورت لگ رہی ہو کہ پہلے کبھی نہیں لگی تھیں۔ مگر شاید یہ اچھا نہ ہوتا۔ چنانچہ میں نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔ ”کچھ نہیں۔“

وہ چپ چاپ بیٹھی مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ملے جلے تاثرات تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسا وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر طے نہیں کر پا رہی ہے کہ کہے یا نہ کہے۔ آخر کچھ دیر بعد میں نے ہی کہا۔

”تمہیں علم تو ہوگیا ہوگا کہ چوہدری صاحب کامیاب ہوگئے ہیں......“

”ہاں، مبارک ہو......“ اس نے ہولے سے کہا اور مسکرائی اور نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ محض رسماً یا رواداری کے طور پر مسکرائی ہے۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور کنیز سے کہا۔

”چوہدری صاحب نے تمہارا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔“

”کیوں......“ وہ ذرا متحیر ہوئی۔

”کیونکہ وہ صرف چند سو ووٹوں سے جیتے ہیں اور یہ محض تمہاری خاموشی کا انعام ہے۔ اگر تم ایک بار بھی لوگوں سے مخالف امیدوار کو ووٹ دینے کے لیے کہہ دیتیں تو مجھے یقین تھا کہ چوہدری صاحب ہار جاتے۔“

”میں نے اپنی زبان صرف آپ کی خاطر بند کی تھی۔“ کنیز نے آہستہ سے کہا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ”چوہدری صاحب تو بہت خوش ہوں گے!“

”ہاں...... میں یکایک خوش ہو کر بولا۔ ”نہ صرف وہ بلکہ ہر شخص خوش ہے۔ میں بھی بہت خوش ہوں۔ میرے لیے مزید ترقی اور آسائش کے راستے کھل گئے ہیں۔ چوہدری صاحب وزیر بنتے ہی مجھے کسی اہم سرکاری عہدے پر لگوا دیں گے۔ کنیز تم نہیں جانتیں، یہ میری زندگی کا بہت خوب صورت اور بہت کامیاب دن ہے۔“

”چوہدری صاحب کا پیسہ تو اس الیکشن پر بہت خرچ ہوا ہوگا......؟“ اس نے پوچھا۔

”بلاشبہ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کئی لاکھ روپے خرچ ہوگئے مگر چوہدری صاحب کو پروا نہیں ہے۔ وہ بہت جلد سارا پیسہ مع منافع کے وصول کر لیں گے۔“

”ہاں، میں سمجھتی ہوں۔“ کنیز نے دھیرے سے کہا۔ پھر مسکرا کر بولی۔ ”ایسا لگتا ہے آپ کسی پارٹی سے آرہے ہیں۔“

”تم ٹھیک سمجھیں۔“ میں نے جیب سے نیا سگار نکالتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری صاحب نے کامیابی کی خوشی میں پارٹی دی ہے۔ وہاں تمام بڑے لیڈر، سرکاری افسر اور شہر کے امراء موجود ہیں بڑے غضب کی پارٹی ہے۔ نہ صرف ہر طرح کے لوازمات ہی موجود ہیں بلکہ ایک رقاصہ کا انتظام بھی کیا گیا ہے جو اب پہنچنے ہی والی ہوگی!“

”اور آپ پارٹی چھوڑ کر یہاں آگئے!“

”ہاں......“ میں مسکرایا۔ ”کیا کروں، یکایک تم یاد آئیں اور میں تم سے ملنے چلا آیا۔“

”کیوں......؟“ اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر چلا گیا۔

میں نے پیالی اٹھا کر باقی ماندہ چائے حلق میں انڈیل لی اور پھر غور سے کنیز کو دیکھا۔ کیا مجھے کہہ دینا چاہیے۔ ہاں، کہہ ہی دینا چاہیے۔ یہ میری کامیابی کا دن ہے۔ اس سے اچھا موقع پر پھر نہ ملے گا کتنے دن ہو گئے ہیں۔ میں اس خواہش کو سینے میں دبائے ہوئے ہوں اور کب تک دبائے رہوں گا۔ ممکن ہے، آج جو ہمت مجھ میں ہے کل میسر نہ آئے۔ لہٰذا دل کی بات آج ہی کہہ دینا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے ٹھہر ٹھہر کر، سنبھل سنبھل کر، صاف اور مناسب وموزوں الفاظ میں کہا۔ ''کنیز میں ..... میں دراصل تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''

''کیا.....؟''

''تمہیں یاد ہے۔'' میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور آسمان پر دمکتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگا۔ ''جب تم میرے گھر سے رخصت ہو رہی تھیں تو میں نے تم سے زندگی بھر کا ساتھ مانگا تھا۔ اس وقت تم نے انکار کر دیا تھا۔ تم نہیں جانتیں اس وقت مجھے کتنا رنج ہوا تھا۔ اب اس بات کو بہت دن ہو گئے ہیں۔ لیکن میرے دل میں اب ابھی تمہاری چاہت کا چراغ روشن ہے۔ میں تمہیں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا۔ ہمیشہ، ہر پل یاد کرتا تھا۔ کبھی کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جو تمہاری جگہ لے سکتی۔ کنیز اب اتنے برسوں بعد پھر میں وہی بات دہرا رہا ہوں۔ کیا تم .....''

میں یکا یک سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔ کنیز کشمکش کے عالم میں چند لمحے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

''آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں.....''

''لیکن.....؟''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم اس زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ آئیں، جس کی بنا پر اس وقت تم نے انکار کیا تھا میں خود بھی اس وقت ایک تنگ دست وتہی دامن تھا۔ مگر اب میرے پاس سب کچھ ہے۔ اچھا مکان، روپیہ اور ایک شاندار مستقبل، میں تمہارے لیے دنیا کی ہر آسائش مہیا کر سکتا ہوں۔ چنانچہ آج میں یہاں صرف ''ہاں'' سننے آیا ہوں۔ ''نہ'' نہیں سنوں گا۔'' یہ کہہ کر میں امید وبیم کی حالت میں کنیز کو دیکھنے لگا۔

کنیز خاموش تھی۔ اس طرح جیسے سکتے میں مبتلا ہو۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ ہونٹوں پر تھرتھراہٹ تھی اور آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی تھی۔ کئی لمحوں کی کرب انگیز کشمکش کے بعد آخر کار اس نے کہا۔ ''جمال بابو آپ بہت اچھے ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ مجھے پسند ہیں۔ لیکن..... لیکن میں اپ سے شادی نہیں کر سکتی.....''

میرا دھڑ دھڑاتا ہوا دل یکا یک رک گیا۔ ''کیوں.....؟''

''کیونکہ.....'' اس کی آواز میں ہلکی ہلکی آنچ تھی جیسے وہ اندر ہی اندر جل رہی ہو۔ ''کیونکہ جمال بابو آپ اب وہ نہیں رہے جو کبھی تھے آپ کا کوئی کردار نہیں ہے۔ آپ کی کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ آپ قلم کار ہیں۔ میں نے سنا تھا ادیب کا قلم کبھی نہیں بکتا لیکن آپ نے اپنے قلم کو اور قلم کی حرمت کو دنیا کے بازار میں بیچ ڈالا ہے اور سکوں کی کھنک اور سونے چاندی کی چمک دمک کے عوض اپنی انفرادیت اور اپنے ضمیر کا سودا کر لیا ہے۔ اب آپ کے پاس کوئی پھول نہیں۔ صرف بے ضمیری اور بے اخلاقی کے بدنما داغ ہیں۔ اگر میں آپ سے شادی کر لوں تو نہ صرف میری برسوں کی ریاضت رائیگاں چلی جائے گی بلکہ شاید میں عمر بھر اپنے آپ سے نادم بھی رہوں گی۔'' اتنا کہہ کر وہ رکی اور رنجیدہ نظروں سے چند لمحے مجھے دیکھتی رہی۔ ''جمال بو۔'' آخر اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے لیکن اب آپ میرے قابل نہیں رہے۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

میں نے دیکھا۔ 'میرا وجود' میری ہی نظروں کے سامنے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔

☆☆